ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ

(سوئم)



ثروت صولت

ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(سوئم)

ثروت صولت

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ

نام کتاب: ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ (سوئم)
مصنف: ثروت صولت
اشاعت: دسمبر 2014ء
ایڈیشن: 10
تعداد: 600
قیمت: -/360 روپے
مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

اہتمام:
عبدالحفیظ احمد (مینجنگ ڈائریکٹر)
اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-35417074, 35417071
فیکس: 042-35417072
موبائل: 0300-8485030
ویب سائٹ: www.islamicpak.com.pk
ای میل: islamicpak@yahoo.com

انتساب

ابا مرحوم ڈاکٹر صولت خاں صاحب کے نام جن کی توجہ محبت اور شفقت نے نہ صرف مجھ میں تاریخ کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا، بلکہ دنیا کے تمام معاملات کو اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھنا بھی سکھایا۔

فہرست کتب

باب ۱	اسلامی تاریخ کے امتیازی پہلو	13
باب ۲	مغربی اور اسلامی نظریات کا تصادم	19
	نظریاتی کشمکش کا آغاز	21
	(الف) مشرق بعید	24
باب ۳	**انڈونیشیا: سب سے بڑی مسلم مملکت**	25
	تاریخی پس منظر	25
	تحریک جہاد	26
	حاجی عمر سعید اور شرکت اسلام	27
	حاجی احمد دحلان اور جمعیت محمدیہ	28
	حصول آزادی	29
	احمد سوکارنو کا دور صدارت	30
	سیاسی جماعتیں	31
	اشتراکی سازش	34
	جنرل سوہارتو کا دور صدارت	35
	ڈاکٹر محمد ناصر	39
	تعلیم وصحافت	41
	تعمیر وترقی	42

باب ۴	ملیشیا اور اس کی تیرہ ریاستیں	45
	آزادی کی تحریک	46
	وفاق کی تشکیل	46
	سیاسی استحکام	48
	اسلام کا مستقبل	50
	تعلیم اور صحافت	52
	تعمیر و ترقی	53
باب ۵	برونئی: جنوب مشرقی ایشیا کا کویت	55
	(ب) برصغیر پاکستان و ہند	59
باب ٦	برطانوی ہند میں آزادی کی تحریکیں	61
	برصغیر میں برطانیہ کی پالیسی	61
	برطانوی اور اسلامی دور کا فرق	62
	سعید احمد خان	65
	اردو ادب کا دور جدید	66
	سیاسی بیداری اور مسلم لیگ کا قیام	74
	مولانا محمد علی	75
	ڈاکٹر اقبال	77
	قائد اعظم	78
	قرارداد پاکستان	80
	علم و ادب	81
باب ۷	پاکستان: ایک نظریاتی مملکت	85
	لیاقت علی خان	87

	قراردادِ مقاصد	89
	عدمِ استحکام کا دور	89
	پہلا آئین	90
	صدر ایوب کا دور	92
	عہدِ ایوبی میں تعمیر و ترقی	94
	خارجہ پالیسی	96
	جبر و استبداد	97
	نظریہ پاکستان پر ضرب	98
	مشرقی پاکستان میں احساسِ محرومی	99
	تحریک جمہوریت اور صدر ایوب کی دست برداری	101
	دوسرا مارشل لا اور بنگلہ دیش کا قیام	102
	پہلے عام انتخابات	103
	سقوطِ مشرقی پاکستان	104
باب ۸	متحدہ پاکستان کے ۲۴ سال	109
	کوتاہیاں	113
	اخلاقی زوال	114
	فکری جمود	116
باب ۹	پاکستان: سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد	119
	ذوالفقار علی بھٹو	119
	آئین کا نفاذ اور جبر و استبداد	123
	متحدہ جمہوری محاذ اور قومی اتحاد	125
	پیپلز پارٹی کے دور پر ایک نظر	126

	تیسرا مارشل لا	128
	قیادت کا فقدان اور انتخابات کا التوا	129
	تعلقات خارجہ	131
	جماعت اسلامی	133
	مسلم لیگ	136
	پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی	137
	جمعیت علمائے اسلام	138
	پیپلز پارٹی	139
	معیشت	140
	تعلیم اور صحافت	142
	مولانا مودودی	143
	مشاہیر علم وادب	146
باب ۱۰	بنگلہ دیش	153
	تاریخی پس منظر	153
	برطانوی دور	154
	پاکستان میں شمولیت	156
	عوامی لیگ اور بنگلہ دیش کا قیام	157
	علیحدگی کے اسباب	160
	شیخ مجیب الرحمن	162
	صدر ضیاء الرحمن	164
	بنگلہ دیش میں اسلامی تحریک	166

باب ۱۱	کشمیر جنت نظیر	171
	ڈوگرا راج	172
	پاکستان سے الحاق کا مطالبہ	174
	آزاد کشمیر	178
	(ج) مشرق وسطیٰ	181
باب ۱۲	افغانستان کا دورِ جدید	183
	نادر شاہ	183
	ظاہر شاہ	184
	بادشاہت کا خاتمہ	185
	اشتراکی انقلاب	186
	اسلامی تحریک	188
باب ۱۳	ایران: رضا شاہ سے اسلامی انقلاب تک	195
	رضا شاہ پہلوی	195
	محمد رضا پہلوی	197
	تیل قومی ملکیت میں لے لیا گیا	198
	انقلاب سفید	200
	جبر و استبداد	201
	بادشاہت کا خاتمہ	203
	پہلوی دور پر ایک نظر	205
	تعلیم و علم و ادب	207
	اسلامی رجحانات	209
	اسلامی اتحاد	211

	اسلامی انقلاب اور امام خمینی	213
	ڈاکٹر علی شریعتی	216
	نئی حکومت کی مشکلات	218
باب ۱۴	ترکی: قیامِ جمہوریت کے بعد	223
	تاریخ پس منظر	223
	مصطفیٰ کمال اور جنگ آزادی	224
	تبادلہ آبادی	226
	سیکولر جمہوریت	227
	اسلامی عناصر کی ناکامی کے اسباب	230
	عصمت انونو	232
	ڈیموکریٹ پارٹی	234
	جلال بایار کا دورِ صدارت	236
	عدنان مندریس	237
	مذہبی آزادی	239
	فوجی انقلاب	241
باب ۱۵	ترکی: فوجی انقلاب کے بعد	243
	حزب عدالت	243
	بدیع الزمان سعید نورسی	244
	سلیمان دیمیریل کی وزارت	247
	اتحاد اسلامی	248
	مخلوط حکومتوں کا دور	250
	بُلند ایجیوت	250

	مسئلہ قبرص	252
	ملی سلامت پارٹی اور نجم الدین اربکان	254
	اسلامی کانفرنس میں شرکت	257
	۱۹۷۷ء کے انتخابات	259
	تعلیم وصحافت	266
	ترکی ادب	268
	(د) المشرق العربی: زرخیز ہلال	275
باب ۱۶	عربوں کی نشاۃ ثانیہ	277
باب ۱۷	دجلہ اور فرات کی وادی کا نیا دور	291
	تاریخ پس منظر	291
	عراق پر برطانوی تسلط	293
	آزادی کے بعد	294
	نوری سعید پاشا	295
	بادشاہی دور میں عراق	296
	عبدالکریم قاسم	298
	عبدالسلام عارف	299
	بعث پارٹی کی حکومت	300
	کردستان	302
	شط العرب	303
	شیخ امجد زہاوی معیشت	304
باب ۱۸	سرزمین شام	307
	عثمانی دور	308

	عربوں کی بغاوت	309
	فرانس کا تسلط	311
	شکری القوتلی	312
	فوجی آمریت	314
	مصر سے الحاق اور علیحدگی	315
	جمہوریت کی بحالی	316
	بعث پارٹی کی حکومت	317
	تیسرا بعثی انقلاب	320
	شام میں اسلامی تحریک	323
	ڈاکٹر مصطفےٰ حسنی سباعی	326
	ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی	328
	محمد کرد علی	329
	محمد راغب الطباغ	329
	مصطفےٰ احمد زرقا	330
	معاشی ترقی	332
باب ۱۹	لبنان: عرب دنیا کی تفریح گاہ	335
	فرانسیسی دور	337
	آزادی	339
	تعمیر و ترقی	341
باب ۲۰	اردن کی ہاشمی مملکت	345
	عبداللہ بن حسین	345
	شاہ حسین	347

	فلسطینی مہاجر	348
باب ۲۱	فلسطین: ہلال وصلیب کی رزم گاہ	353
	صہیونی تحریک	355
	برطانوی انقلاب	356
	اسرائیل کا قیام	358
	صیہونی عزائم اور سقوط بیت المقدس	359
	مفتی اعظم امین الحسینی	361
	۱۹۷۳ء کی جنگ	363
	الفتح	364
	یاسر عرفات	366

فہرست نقشہ جات

۱۔	ملایا اور اس کی گیارہ ریاستیں	44
۲۔	مغربی پاکستان	108
۳۔	بنگلہ دیش	152
۴۔	جموں وکشمیر	169
۵۔	اسرائیل کے جارحانہ عزائم	368

باب ۱

اسلامی تاریخ کے امتیازی پہلو

تاریخ عالم میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ کارنامے جو دوسری قوموں نے بھی انجام دیے اور مسلمانوں نے بھی انجام دیے، اور اس لحاظ سے اسلامی تاریخ کو کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں دوسرے وہ کارنامے جو صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کی مثال دوسری قوموں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اور یہی وہ کارنامے ہیں جن کی وجہ سے اسلامی تاریخ کو دوسری قوموں کی تاریخ کے مقابلے میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اول الذکر کارنامے انتظام مملکت، فن تعمیر اور علوم وفنون کی ترقی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان میدانوں میں مسلمانوں نے بھی وہ سب کچھ کیا جو دوسری قوموں نے کیا۔ عالیشان عمارتیں بنائی گئیں۔ بڑے بڑے شہر آباد کیے گئے، صنعت وحرفت کو ترقی دی گئی، زراعت کو فروغ دیا گیا، فوجی کارنامے انجام دیے گئے، مختصر یہ کہ تہذیب وتمدن کی ترقی کے سلسلے میں مسلمانوں نے وہ تمام کام کیے جن کی ایک باصلاحیت، اور متمدن اور مہذب قوم سے توقع کی جاتی ہے۔

اسلامی تاریخ کو بہر حال ان کاموں کی وجہ سے امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے، اسلامی تاریخ کو امتیازی حیثیت ان کاموں کی وجہ سے حاصل ہے جو مسلمانوں نے غیر مادی نقطۂ نظر اور اخلاقی اقدار کے فروغ، عدل وانصاف اور اخوت انسانی کے سلسلے میں انجام دیے اور جن کی وجہ سے دنیا میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جو بقول ایک انگریز مورخ، ایچ. جی. ویلز:

”دنیا کا سب سے اچھا سیاسی اور سماجی نظام تھا اور اس وجہ سے اس کو غلبہ حاصل ہوا“[1]

اسلامی تاریخ کی اس امتیازی حیثیت کی طرف اگر چہ ہم پچھلے صفحات میں اشارے کرتے آئے ہیں لیکن اب اس موقع پر جب کہ ہم اسلامی تاریخ کے دور زوال کے حالات پیش کرنے

---

(۱) H.G. Welle: The Outline of History, P.618 (Garden City, N.Y.-1949)

والے ہیں، اسلامی تاریخ کی اس انفرادی حیثیت پر ایک مجموعی نظر ڈال لینا مناسب ہے۔

(۱) اسلامی تاریخ کی پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کو انسان کی حاکمیت کی بجائے خدا کی حاکمیت کا تصور دیا، اس تصور نے مسلمان حکمرانوں اور حاکموں میں ذمہ داری کا احساس پیدا کیا، کیونکہ اس تصور کے تحت ہر انسان اپنے اعمال کے لیے خدا کے آگے جواب دِہ تھا۔ خلافت راشدہ ایک مثالی حکومت تھی، جو اس تصور کی علمبردار تھی، بعد میں ملوکیت کا نظام قائم ہو جانے کی وجہ سے اس تصور پر ضرب لگی لیکن مسلمان حکمران خود کو اس تصور سے کبھی بھی بے تعلق نہیں کر سکے، خدا کی حاکمیت کا تصور شریعت کی برتری کی شکل میں ہر دور میں موجود رہا اور ہر قسم کے ظلم اور بے انصافی کی راہ میں ایک رکاوٹ ثابت ہوا۔ مسلمان علماء اور قاضیوں نے اپنے فیصلوں کے ذریعے کس طرح حکمرانوں کو صحیح راستے پر رکھنے کی کوشش کی۔ اس کی مثالیں اس تاریخ کے پچھلے دو حصوں میں گزر چکی ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلامی عدالتیں ملوکیت کے طویل دور میں بھی بڑی حد تک آزاد رہی ہیں اور ایک محدود حکمران طبقہ کے علاوہ ان کا ہاتھ ہر ظالم کے گلے تک پہنچ سکتا تھا۔

(۲) اسلامی تاریخ کی دوسری بڑی خصوصیت احترام انسانیت ہے، اسلامی دور میں انسان کی عظمت کا معیار اس کا اخلاقی کردار تھا، رنگ، نسل، اور زبان کی بنیاد پر اسلامی دور میں انسانوں کے درمیان کبھی امتیاز نہیں برتا گیا، چنانچہ اسلامی تاریخ میں ہمیں نسلی یا قومی امتیاز کے وہ مناظر نظر نہیں آتے، جو آج بھی ہر قسم کی ترقی کے باوجود امریکہ اور یورپی قوموں میں عام ہیں، اور جن کا بدترین اظہار اسی صدی میں نازی جرمنی میں ہو چکا ہے، اور نہ اسلامی تاریخ میں غیر مسلم قوموں کو علیحدہ بستیوں میں رہنے پر مجبور کیا گیا۔ جیسا کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں یہودیوں کے باڑے تھے۔

(۳) اسلامی تاریخ کی تیسری بڑی خصوصیت ''رواداری'' تھی، مسلمانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو تبدیلی مذہب پر کبھی مجبور نہیں کیا اور اسلامی تاریخ اس قسم کے مظالم سے خالی ہے جیسے اسپین اور صقلیہ میں مسلمانوں پر کیے گئے، اور انیسویں صدی میں بلقان میں آباد ترک مسلمانوں پر کیے گئے تھے۔ اور نہ ہی غیر مسلم رعایا کو اسلامی عقائد کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا گیا جس طرح اشتراکی ملکوں میں غیر اشتراکی آبادی کو ملحدانہ تعلیم اور اشتراکی نظریات کی تعلیم زبردستی دی جاتی ہے۔ غیر مسلم رعایا نہ صرف اپنے مذہبی رسوم کی ادائیگی میں آزاد تھی بلکہ وہ اپنے عقائد کا علی

الاعلان دفاع بھی کر سکتی تھی اسی طرح اسلامی تاریخ میں غیر مسلموں کے عقائد بدلنے کے لیے اس قسم کا دباؤ بھی نہیں ڈالا گیا، جیسا آج اشتراکی ملکوں میں مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیرووں پر ڈالا جارہا ہے، مسلمانوں نے غیر مسلموں کو بڑے بڑے عہدے دیے وہ تجارت اور کاروبار میں بالکل آزاد تھے، بعض ملکوں میں جیسے ہندوستان اور ترکی ہے۔ پوری تجارت غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی۔

(۴) دورِ جدید سے پہلے غلاموں کا مسئلہ دنیا کا بہت بڑا معاشرتی مسئلہ تھا۔ عہد قدیم میں محکوم قوموں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو اس کثرت سے غلام بنایا جاتا تھا کہ یونان کے دارالحکومت ایتھنز میں غلاموں کی تعداد آزاد شہریوں سے زیادہ تھی، اور سلطنت رومہ کے ستر لاکھ آزاد باشندوں کے مقابلے میں غلاموں کی تعداد دو کروڑ سے زیادہ تھی، یونان اور روم کی غلامی کا بدترین پہلو یہ تھا کہ یہ غلام ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم تھے، اور ان سے جانوروں کی طرح گھروں اور کھیتوں میں کام لیا جاتا تھا، روم میں ان غلاموں کو شیروں سے لڑایا جاتا تھا، اور یہ اس زمانے کی بہترین تفریح سمجھی جاتی تھی، جدید دور میں امریکہ میں غلاموں کے ساتھ پچھلی صدی تک جو سلوک کیا جاتا تھا، اس سے سب واقف ہیں، لیکن اسلامی تاریخ اس قسم کے واقعات سے خالی ہے، مسلمانوں نے اگرچہ غلامی کی رسم ختم نہیں کی۔ لیکن انہوں نے غلاموں کو افراد خانہ کے برابر مرتبہ دیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی دنیا میں غلام بغیر کسی رکاوٹ کے بادشاہت کے درجے تک پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ برصغیر میں خاندان غلاماں اور مصر و شام میں مملوک دور اس کی واضح مثالیں ہیں ان غلام بادشاہوں کا نام خطبوں میں اسی عزت و احترام سے لیا جاتا تھا جیسا دوسرے بادشاہوں کا۔

(۵) تاریخ اسلام کی ایک اور بڑی خصوصیت اسلامی معاشرہ کا ان خرابیوں سے پاک ہونا تھا جو دوسرے غیر مسلم معاشروں میں ہمیشہ عام رہی ہیں۔ جنسی بے راہ روی، شراب خوری اور قمار بازی کسی نہ کسی شکل میں اسلام سے قبل بھی غیر مسلم معاشروں میں عام تھی اور اسلام کے بعد بھی آج تک عام رہی ہے، یونان اور رُوم میں خاص طور پر جنسی بے راہ روی اسی طرح ایک فیشن بن گئی تھی، جیسی آج موجودہ یورپی معاشرے میں ہے، عصمت فروشی کا پیشہ عام تھا اور اعلیٰ حکام اور شرفاء تک زنان بازاری سے تعلقات قائم کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے قرون وسطیٰ کا اسلامی معاشرہ ان خرابیوں سے ممکن حد تک پاک تھا۔ اس نے عورت کی عصمت کو حرمت اور

عزت بخشی اور اسلامی معاشرہ ظہورِ اسلام کے بعد سینکڑوں سال تک زنانِ بازاری کے وجود سے پاک رہا۔ اسلامی تاریخ میں اس طبقہ کا وجود مسلمانوں کے دورِ زوال سے تعلق رکھتا ہے، اور غیر مسلموں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

(٦) شراب کو ہر زمانے میں برائیوں کی جڑ سمجھا گیا ہے۔ جنسی بے راہ روی اور جرائم کے ارتکاب میں شراب خوری کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن غیر مسلم معاشرے میں شراب خوری کی خرابیوں کو تسلیم کرنے کے باوجود اس پر قابو نہیں پایا جاسکا، یہ صرف اسلامی معاشرہ تھا جس میں اس لعنت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا، ہمیں اسلامی تاریخ میں شراب خوری کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن یہ مثالیں بڑی حد تک صرف حکمران طبقے، اور اس کے لواحقین تک محدود تھیں تمام مسلمان خصوصاً درمیانہ اور غریب طبقہ جو اسلامی معاشرے میں شراب نوشی کی خرابیوں کا سب سے زیادہ شکار ہوتا ہے، اس لعنت سے پاک تھا، مسلم معاشرے میں شراب کو مغربی معاشرے کی طرح کبھی بھی پسندیدہ چیز نہیں سمجھا گیا، حکمران اور اعلیٰ طبقے میں بھی شراب کا استعمال اتنا عام نہیں تھا، جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں۔

(٧) قمار بازی اور جوئے کو بھی ہمیشہ ایک ناپسندیدہ اور نقصان دہ شغل سمجھا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود غیر اسلامی معاشرے میں قمار بازی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے، اسلامی معاشرے میں جوئے بازی کو کبھی قبول عامہ حاصل نہ ہوا۔

(٨) تاریخِ اسلام کی ایک اور بڑی خصوصیت غیر اخلاقی اور غیر صحت بخش تفریحوں کا فقدان ہے، حسن فروشی اور قمار بازی کے علاوہ جن کا شمار تفریح میں ہوتا ہے غیر اسلامی معاشرہ دوسری غیر انسانی اور غیر صحت بخش تفریحوں میں بھی مبتلا رہا ہے اور رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بدترین تفریح، سرکس اور تماشے تھے جو رومی سلطنت میں عام تھے اور جن کے دوران مسلح انسانوں کو ایک دوسرے سے لڑایا جاتا تھا، یا ان کا مقابلہ شیر اور دوسرے درندوں سے کرایا جاتا تھا یہ انسانیت سوز تفریح، جس کی بدولت ہزاروں انسانوں کا خون بہا، سلطنت رومہ میں بڑی پسندیدہ تفریح سمجھی جاتی تھی، اسلامی تاریخ میں حسن فروشی اور قمار بازی کی طرح ایسی تفریح کا بھی کہیں پتہ نہیں چلتا اسلام میں فنون لطیفہ کو ایک نئی اور صحت بخش شکل دی گئی، جاندار چیزوں کی تصویر بنانا چونکہ اسلام میں ممنوع ہے اس لیے مسلمانوں نے مجسمہ سازی اور مصوری کی طرف توجہ نہیں دی، اور ذوق لطیف کی تسکین کے لیے گل کاری، پچی کاری اور خطاطی کی طرف توجہ دی۔ جس کی بدولت

آرٹ کی ایک نئی اور پاکیزہ شکل وجود میں آئی تھی، مسلمان فن کاروں کے بنائے ہوئے کتبوں، طغروں اور نقاشی کو دیکھ کر ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ ان سے ذہن پر جو اثرات پڑتے ہیں، وہ عریاں مجسموں اور عریاں تصاویر کے اثرات سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔

(۹) اسلام نے عورتوں کو ایک ایسا مرتبہ دیا ہے جس میں نہ تو افراط ہے اور نہ تفریط۔ اسلام نے عورت کی عصمت اور آبرو کو سب سے زیادہ اہمیت دی، اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس میں عورت اپنی نسوانیت کو ضائع نہ کر سکے، بحیثیت ایک انسان کے اس کو مرد کے برابر حقوق دیے گئے، اس کو جائیداد رکھنے کا اور کمانے کا حق دیا۔ عزیزوں کی وراثت میں حصہ دار قرار دیا، اور شادی کے لیے اس کی مرضی کو لازمی قرار دیا گیا، لیکن اس کی سماجی ساخت اور فطری نزاکت کے پیش نظر اور مردوں کے ساتھ آزادانہ اختلاط سے بچنے کے لیے جو اخلاقی بے راہ روی کا باعث ہوسکتا ہے اس کے دائرہ کار کو گھر تک محدود رکھا اور اس پر وہ ذمہ داریاں عائد نہیں کیں جس کے لیے مرد زیادہ موزوں ہیں، مرد اور عورت کے دائرۂ کار مقرر کر دینے کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں خاندانی استحکام اور سکون پایا جاتا ہے جس کا مغرب کے جدید معاشرے میں فقدان ہے، اس میں شک نہیں کہ گذشتہ تاریخ میں مسلمان عورت ظلم اور زیادتی کا شکار بھی ہوتی رہتی ہے لیکن اس کی وجہ اسلامی معاشرتی اصولوں کی خامی نہیں تھی، بلکہ تعلیم کی کمی اور عورت کی جسمانی کمزوری اس کی اصل وجہ تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اسلامی تاریخ میں عورت حکمران کی حیثیت سے نظر نہیں آتی، لیکن یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں شاہی خاندان کی عورتیں اس بدنامی اور بدکرداری کے دھبوں سے محفوظ رہیں جو غیر اسلامی تاریخ میں کلوپیٹرا اور تھیوڈرا سے لے کر روس کی ملکہ کیتھرائن اور برطانیہ کی الزبیتھ تک غیر مسلم حکمران خواتین کے دامن پر نظر آتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے رومی دور کی اعلیٰ خاندان کی عورت نے ایک طرح کی بیسوا کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

(۱۰) اسلامی خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے کی وجہ سے اسلامی معاشرہ معاشی لحاظ سے وہ مثالی حیثیت اختیار نہیں کر سکا، جس کا نمونہ ہمیں خلافت راشدہ میں نظر آتا ہے، لیکن اسلام کے نظام زکوٰۃ، نظام وراثت اور صداقت اور خیرات کے احکام کی بدولت دولت کی تقسیم اسلامی معاشرے میں دوسرے معاشروں کی نسبت زیادہ بہتر رہی، علاوہ ازیں سودی کاروبار کے فقدان نے اسلامی معاشرہ کو سود خوروں کے ان مظالم سے محفوظ رکھا، جو غیر اسلامی معاشرے میں

عام تھے، جن کا ایک نمونہ ایک انگریز شاعر شیکسپیئر کے ڈرامے ''وینس کے سوداگر'' میں نظر آتا ہے۔

اسلامی تاریخ کی ایک اور خصوصیت یتیموں کی پرورش اور نگہداشت کے نظام کا قیام ہے۔یتیموں کا وجود دنیا میں ہمیشہ رہا ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔لیکن یہ امتیاز اسلامی تاریخ ہی کو جاتا ہے، جس میں پہلی مرتبہ یتیموں کی پرورش اور نگہداشت کی طرف باضابطہ ایک نظام کے تحت توجہ دی گئی۔

اردو زبان کے مشہور مورخ اور عالم سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے، جہاں کسی یتیم خانے کی بنیاد پڑی، اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا، اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن وراحت کے گھر بنائے، ان کے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائیدادیں وقف کیں اور دنیا میں ایک نئے انسٹی ٹیوشن کی طرح ڈالی، اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی وسرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں' ان کی جائیدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں، اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے، اور لندن کے لارڈ یلٹر یا آرفنس کورٹ (orphans court) کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں''[1]

---

(۱) سیرت النبی حصہ ششم باب یتیموں کے حقوق۔

باب ۲

مغربی اور اسلامی نظریات کا تصادم

ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں یورپ کی نئی بیداری کا تذکرہ کر چکے ہیں، جس کو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے، اور جس کے لیے یورپ قرون وسطیٰ سے نکل کر جو یورپ میں ''دور ظلمت'' تھا، جدید دور میں داخل ہوا، یہ دور آج بھی چل رہا ہے اور اس کی بنیاد وہی تصورات ہیں جو نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں پیدا ہوئے، ان تصورات نے یورپ کی مادی زندگی میں تو انقلاب پیدا ہی کیا، لیکن جب مسلمان سیاسی میدان میں یورپ سے شکست کھا گئے تو ان تصورات نے مسلمان قوموں کو بھی متاثر کرنا شروع کیا۔ اور اس طرح اسلامی دنیا میں بھی اس نوعیت کی کشمکش شروع ہوگئی، جو نشاۃ ثانیہ کے وقت یورپ کی مسیحی قوموں میں عام تھی، اسلامی دنیا کے موجودہ مسائل اور نظریاتی کشمکش کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مغرب کے ان تصورات اور ان کے اسلامی تصورات سے تصادم کے موضوع پر ایک نظر ڈال لیں۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز مذہب کی مخالفت سے ہوا۔ اس کا باعث مسیحیت کی ناقص تعلیم اور یورپ کے مذہبی پیشواؤں کا غلط طرز عمل تھا۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں بتایا جا چکا ہے، کہ اسلام سے قبل جس قدر خدائی مذہب تھے، وہ اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہے تھے، اور مذہبی پیشواؤں نے الہامی کتابوں میں اس حد تک تبدیلیاں کر دی تھیں، کہ خدا کی بتائی ہوئی اصل تعلیم کا پتہ چلانا مشکل ہو گیا تھا، علاوہ ازیں مسیحی پادریوں نے پاپائے روما کی رہنمائی میں سارے یورپ پر مذہبی اجارہ داری قائم کر دی تھی انہوں نے خود کو خدا کا نائب بنا لیا تھا، اور اپنے بنائے ہوئے احکام خدا کے نام پر جاری کرنے لگے تھے، مسیحیت کی تعلیم محض توحید اور اخلاق کا مجموعہ تھی، سیاسی اور سماجی قوانین اس میں موجود نہیں تھے۔ لیکن ان پادریوں نے توحید کو تثلیث سے بدل دیا اور اخلاقی حدود سے بڑھ کر سیاسی اور تمدنی امور میں بھی دخل اندازی کرنے لگے، وہ اپنے جاری کردہ احکام کو خدائی حکم کہہ کر جاری کرتے تھے، لیکن چونکہ وہ خدائی حکم نہیں ہوتے تھے، بلکہ پادریوں کے ذاتی نظریات ہوتے تھے۔ اس لیے غلط بھی

ہوتے تھے، ان احکام کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص عقلی بنیاد پر کوئی نئی بات نہیں کہہ سکتا تھا، ایسے شخص پر بہت جلد کفر کے فتوے لگ جاتے تھے، اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ جادو کی سزا آگ میں جلا کر دی جاتی تھی۔ اور بے شمار لوگوں کو جن سے پادریوں کو اختلاف ہوا، ان کو جادوگر کہہ کر جلا دیا گیا۔

گیارہویں صدی سے عربوں کے زیر اثر یورپ میں نئے علوم داخل ہوئے، اور عربی کتابوں کے ترجموں کے ذریعہ ان کو یونان کے قدیم علوم سے واقفیت پیدا ہوئی، مسلمانوں اور قدیم یونانی علوم سے ان تکلفات کی بدولت یورپ میں آزادی فکر پیدا ہوئی۔ اور وہاں کے اہل علم لوگوں نے پادریوں کی اس اجارہ داری پر اعتراضات کیے، اب پادریوں اور اہل علم لوگوں میں علمی جنگ شروع ہوگئی۔ اور چونکہ پادریوں کے عقائد کی بنیاد غلط تھی، اس لیے اس جنگ میں اُن کو ناکامی ہوئی، مذہبی طبقے کی اس ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے نئے مفکروں نے نہ صرف مذہب کو سیاست اور دنیاوی امور سے الگ کر دیا بلکہ اپنے افکار میں خدا کی ہستی کو بالکل نظر انداز کر دیا اور بعض نے اپنے افکار کی بنیاد الحاد پر رکھی۔[1] اب مذہب ایک ذاتی چیز بن گیا، اور سیاست، معاشرت، معیشت اور علم و حکمت سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا، دین اور دنیا کی اس تفریق کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ پاپائے رومہ یا مذہبی طبقہ کی حاکمیت کی بجائے عوام کی حاکمیت کا تصور پیدا ہوا، اس تصور کے تحت یورپ میں جو حکومتیں قائم ہوئیں، انہوں نے خود کو سیکولر یعنی غیر مذہبی حکومت کہا۔ اور چونکہ یہ حکومتیں عوام کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم کرتی تھیں اس لیے ان کا نظام حکومت ملوکیت کی بجائے جمہوری قرار پایا۔ اس جمہوری نظام نے قانون کی حکومت کے تصور کو فروغ دیا اور اب کسی شخص واحد کو خواہ وہ بادشاہ ہو یا کوئی حاکم، یہ اختیار نہ رہا کہ وہ اپنا حکم کسی دوسرے شخص پر ٹھونس سکے، یا کسی انسان کو اپنی مرضی سے سزا دے سکے، ہر کام اب قانون کے مطابق ہونے لگا اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر کوئی شخص کسی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا مجاز نہیں رہا۔

ایک اور نئی تبدیلی جو نئے تصورات یورپ کے معاشرے میں لائے، وہ آزادی نسواں کی

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے تنقیحات از سید ابوالاعلیٰ مودودی مضمون "ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب"۔

تحریک ہے، اس تصور کے تحت عورتوں کو بھی وہی حقوق دیے گئے جو مردوں کو حاصل ہیں، اور عورت کو اس کا موقع دیا گیا کہ وہ گھر کی چہار دیواری سے باہر نکلے اور زندگی کی دوڑ میں مردوں کے دوش بدوش کام کرے اور گھر کے علاوہ بیرون خانہ ذمہ داریوں کو بھی سنبھال لے۔ مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جدید مغربی تصورات حسبِ ذیل پانچ اصولوں پر مبنی تھے:

۱۔ مذہب اور سیاست کی علیٰحدگی
۲۔ آزادئ فکر
۳۔ عوام کی بالادستی
۴۔ قانون کی حکمرانی
۵۔ آزادئ نسواں

نظریاتی کشمکش کا آغاز

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں جب مغربی ممالک نے اسلامی دنیا کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر لیا تو مغرب کے یہ تصورات مسلمانوں میں بھی پھیلنا شروع ہو گئے، اور چونکہ مغرب کو ان ہی تصورات کی بنیاد پر عروج حاصل ہوا تھا، اس لیے مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا کہ مسلمانوں کو بھی یہ تصورات اپنا لینے چاہئیں اور ان کی بنیاد پر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہیے لیکن مسلمانوں کے دوسرے طبقے نے اس کی مخالفت کی، اس طبقے کی جسے ہم اسلام پسند گروہ کہہ سکتے ہیں، یہ دلیل دی کہ مغربی تصورات اگرچہ یورپ میں ایک نئی زندگی کا باعث ہوئے، لیکن مسلمان ان کو پوری طرح قبول نہیں کر سکتے کیونکہ اول تو یہ تصورات یورپ کے مخصوص ماحول کی پیداوار ہیں، اور دوم یہ کہ ان کا اسلامی اصولوں سے جگہ جگہ تصادم ہوتا ہے، دین اور دنیا، یا مذہب اور سیاست کی علیٰحدگی کے تصور ہی کو لیجیے، یورپ میں یہ تصور اس لیے پیدا ہوا کہ مسیحی تعلیمات صرف اخلاق تک محدود تھیں، ان میں سیاسی، معاشی اور دوسری نوعیت کی ہدایت موجود نہیں تھیں۔ ایسی صورت میں یورپ والوں کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ مذہب اور سیاست کو علیحدہ کر دیں، لیکن اسلام میں مسیحیت کے برخلاف زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں، اس لیے مسلمانوں کا طرزِ عمل وہ نہیں ہو سکتا جو یورپ کے جدید رہنماؤں نے اختیار کیا، عوام کی حاکمیت کے مسئلے کی بھی یہی صورت ہے، اس تصور کی وجہ سے بلاشک و شبہ دنیا کو بڑا فائدہ پہنچا اور بادشاہت کے استبدادی نظام کی جگہ جمہوری نظام قائم ہوا جو اسلام کا سیاسی مطمحِ نظر ہے، لیکن یہاں

بھی یورپ کے تصور حاکمیت اور اسلام کے تصور حاکمیت میں ایک بڑا فرق ہے، یورپ نے حاکمیت قطعی طور پر عوام کے سپرد کر دی، لیکن اسلام میں حاکمیت اللہ کو حاصل ہے، اور عوام اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر رہ کر ہی استعمال کر سکتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے مقرر کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اسلامی جمہوریہ میں عوام شراب، جنسی، بے راہ روی، قمار اور سود کسی شکل میں بھی جائز قرار نہیں دے سکتے، جب کہ غیر اسلامی جمہوری ملکوں میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔

آزادی نسواں کے تصور نے بھی بلا شک وشبہ یورپ میں عورتوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے میں بڑی مدد دی، لیکن خدا کی راہنمائی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اس تصور نے ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جو حدِ اعتدال سے آگے بڑھ گئی اور جس نے یورپ میں جنسی بے راہ روی فواحش، اور عریانیت کو عام کر دیا۔ عورت سے وہ چیز چھین لی گئی جس کو نسوانیت کہا جاتا ہے عورت کو مساوات کے نام پر بازار کا مال بنا دیا گیا۔ اور عورت کی آزادی نے ہر قسم کی جائز پابندیوں کو بھی توڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں خاندانی زندگی درہم برہم ہو چکی ہے۔ طلاقوں کی کثرت، ناجائز اولاد کی پیدائش، شادی کو ایک غیر ضروری رسم قرار دینا، اور بچوں کے جرائم جو آج مغربی دنیا میں عام ہیں، اسی تحریک آزادی نسواں کا نتیجہ ہیں۔

یورپ کے جدید دور میں ایک اور نیا سیاسی تصور جو پیدا ہوا وہ وطنیت اور قومیت کا تصور ہے، اب تک دنیا میں قوموں کی تشکیل میں وطن اور زبان کے علاوہ مذہبی عقائد کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، لیکن مذہب کو سیاست سے علیحدہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں کی تشکیل میں مذہبی عقائد کی حیثیت ثانوی ہو گئی، اور زیادہ زور لسانی اور نسلی یک جہتی پر دیا جانے لگا، چنانچہ یورپ کی موجودہ قومیں عام طور پر زبان اور نسل کی یک جہتی کی بنیاد پر وجود میں آئیں، اس کی وجہ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک قوم دوسری قوم کی غلامی سے آزاد ہو گئی اور ہر قوم کو اپنے رسم ورواج کے مطابق ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے، لیکن اس تصور قومیت اور وطنیت نے انسانی برادری کے عالمگیر تصور کو نقصان پہنچایا اور دنیا کو چھوٹی چھوٹی وحدتوں میں تقسیم کر دیا۔

دنیا کا ہر ملک اپنی وطنی حیثیت پر فخر کرنے لگا اور ہر ملک کے باشندے اپنے ملک اور وطن کے فائدے کے لیے ناجائز کام کو بھی جائز سمجھنے لگے اور اس طرح قوموں کے درمیان باہمی

عداوت اور دشمنی کا بیج بو دیا گیا، دورِ جدید میں یورپ کی ملک گیری کی ہوس اور محکوم قوموں کو لوٹ کر اپنے ملکوں میں مال و دولت جمع کرنے کا جذبہ اسی تصورِ وطنیت کی پیداوار تھا، یہ تصور قبل از اسلام ایران و عرب کے رنگ و نسل کی برتری کے تصور سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اسلامی دنیا کو وطنیت کے اس تصور سے یہ نقصان پہنچا کہ اسلامی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور مسلمان مسلمان کو اجنبی سمجھنے لگا اور ایک عالمگیر انسانی برادری کا تصور جس کی اسلام نے آبیاری کی تھی، ایک قصہ ماضی بن گیا، موجودہ صدی میں اشتراکیت کے عروج نے وطن اور قومیت کے اس تصور پر ضرب لگائی اور معاشی عدل کے نام پر ایک ایسے معاشرے کو قائم کرنے کی کوشش کی جو رنگ و نسل اور وطن کی قید سے آزاد ہو اور جس سے مغربی معاشرے کی معاشی لوٹ کھسوٹ بھی نہ ہو لیکن مغربی یورپی تصورات کی طرح اشتراکیت کی بنیاد بھی خدا کی رہنمائی سے آزاد ہے، اس لیے مغربی تصورات کی طرح اس سے بھی وہ مفید نتائج پیدا نہ ہو سکے جو اس کا مقصود تھا، اور یہ نیا تصور ایک بدترین استبدادی نظام کی شکل اختیار کر گیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ اشتراکی نظام جیسا کہ ہم آگے چل کر پڑھیں گے مغربی استعمار سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔ جن مسلم ملکوں اور علاقوں میں کمیونسٹ برسرِ اقتدار آئے ہیں وہاں مسلمانوں کا وجود ایک جداگانہ ملت اسلامیہ کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے یا ختم ہوتا جا رہا ہے، روس اور چین سے باہر یہی کمیونزم اشتراکیت کی ایک دوسری شکل میں جو سوشلزم کہلاتا ہے، رواج پا رہا ہے، خصوصاً عرب ملکوں پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے، عرب ملکوں میں سوشلزم کو عروج مغربی سامراجی پالیسیوں کی وجہ سے حاصل ہوا ہے، اپنے مسائل کے حل میں خصوصاً مسئلہ فلسطین کے حل میں جو مغربی قوموں کا پیدا کیا ہوا ہے، مایوس ہو کر عربوں نے کمیونسٹ ملکوں کی سیاسی امداد حاصل کرنی چاہی، لیکن اس امداد کے ساتھ ساتھ ان کو کمیونسٹ اور سوشلسٹ نظریات بھی قبول کرنے پڑے عرب ملکوں میں سوشلزم کے حامیوں کا طرزِ عمل مذہب کے بارے میں کمیونسٹوں کی طرح بے لچک نہیں ہے لیکن سوشلزم کا نعرہ اسلامی بنیادوں کو کمزور کرنے کا باعث ہوا ہے اور بعض عرب ممالک ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا ہیں جو بنیادی طور پر کمیونسٹ ملکوں سے مختلف نہیں۔

یہ ہے مختصر پس منظر ان مسائل کا جن سے اسلامی دنیا آج دوچار ہے، اسلامی عناصر اور غیر

اسلامی عناصر کے درمیان مسلمانوں میں جو کشمکش جاری ہے اگر اس میں مغربی اور اشترا کی نظریات کو کامیابی ہوئی تو اسلامی دنیا کی وہ انفرادی حیثیت ختم ہو جائے گی، جو چودہ سو سال کی تاریخ میں ظہور میں آئی اور جس کا تذکرہ ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں، لیکن اگر اس کشمکش میں اسلامی عناصر کامیاب ہو گئے تو اسلامی تاریخ کی انفرادیت اپنے تسلسل کو قائم رکھ سکے گی۔ اس کتاب کے اگلے صفحات اسی کشمکش کی داستان ہیں۔

(الف) مشرق بعید

	رقبہ	آبادی
۱۔ انڈونیشیا۔	۷ لاکھ ۳۵ ہزار مربع میل ۱۹ لاکھ ۴ ہزار مربع کلومیٹر	۱۴ کروڑ بیس لاکھ (۱۹۷۸ء)
۲۔ میلیشیا۔	ایک لاکھ ۲۸ ہزار مربع میل ۳ لاکھ ۲۹ ہزار مربع کلومیٹر	ایک کروڑ ۲۶ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۳۔ برونئی۔	دو ہزار دو سو مربع میل ۵ ہزار سات سو مربع کلومیٹر	دو لاکھ (۱۹۷۸ء)

باب ۳

انڈونیشیا: سب سے بڑی مسلم مملکت

انڈونیشیا اسلامی دنیا کی سرزمین طلوع خورشید ہے۔ یعنی اسلامی دنیا میں سب سے پہلے آفتاب اسی ملک میں طلوع ہوتا ہے اور پھر اس کی روشنی بتدریج باقی اسلامی دنیا میں پھیلتی جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مشرق کی طرف انڈونیشیا اسلامی دنیا کا پہلا ملک ہے۔

تاریخی پس منظر

جیسا کہ اس کتاب کے دوسرے حصے میں بتایا جا چکا ہے، ولندیزوں کا انڈونیشیا پر ۱۹۴۲ء تک قبضہ قائم رہا، انہوں نے انڈونیشیا کے مختلف حصوں پر کم وبیش دوڈھائی سوسال تک حکومت کی، ولندیزوں کی حکومت کا یہ زمانہ انڈونیشیا کی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے میں ملک میں تعلیم کو عام نہیں ہونے دیا۔ اور آزادی حاصل ہونے کے وقت تک پورے ملک میں اعلیٰ تعلیم کا ایک ادارہ بھی نہیں تھا، ولندیزوں نے شکر، چائے اور ربڑ کی کاشت کو بڑی ترقی دی، لیکن وہ تمام زمینیں جن پر ان کی کاشت ہوتی تھی ولندیزوں کی ملکیت میں تھیں اور انڈونیشی باشندے ان کے فائدے سے ہمیشہ محروم رہے۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں بھی انڈونیشی باشندوں کو کوئی بڑا عہدہ نہیں دیا جاتا تھا۔

ولندیزوں نے اپنے دور میں انڈونیشیا میں سرکاری سرپرستی میں عیسائیت کی بھی خوب تبلیغ کی اور سماٹرا کے وسطی حصوں، سیلیبز کے بعض حصوں [illegible] جزیروں میں غیر مسلموں کی ایک کثیر تعداد کو عیسائی بنانے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح انڈونیشیا میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس پر ولندیزی اعتماد کر سکتے تھے۔

انڈونیشیا اور چین کے درمیان پرانے زمانے سے تجارتی تعلقات قائم تھے اور چینی تاجروں کی ایک اچھی خاصی تعداد انڈونیشیا میں آباد تھی۔ ولندیزی دور میں ان چینی تاجروں کی سرپرستی کی گئی اور ان کو زیادہ سے زیادہ مراعات دی گئیں۔ ان مراعات کی وجہ سے چینی تاجر

انڈونیشیا کی تجارتی اور معاشی زندگی پر اس طرح قابض ہو گئے جس طرح برصغیر پاکستان وہند کے برطانوی دور میں ہندو بنگلہ دیش اور پاکستان کی پوری معیشت پر قابض ہو گئے تھے۔

ولندیزوں کی سیاسی غلامی، عیسائیت کی تبلیغ اور چینی باشندوں کی اقتصادی اجارہ داری نے انڈونیشیا میں ولندیزوں کے خلاف نفرت پیدا کر دی اور اس طرح انڈونیشیا میں سیاسی بیداری کا آغاز ہوا۔

تحریک جہاد

انیسوی صدی اسلامی دنیا میں تجدید واحیائے اسلام کی ایسی تحریکوں کا زمانہ ہے جن کی بنیاد جہاد پر تھی۔ لیبیا میں محمد بن علی سنوسی، سینے گال میں حاجی عمر تجانی، مالی میں احمد ولوبو، نائیجیریا میں عثمان وان فودیو، سوڈان میں مہدی سوڈانی، الجزائر میں امیر عبدالقادر الجزائری، قفقاز میں امام شامل اور برصغیر پاکستان وہند میں سید احمد شہید کی تحریکیں اسی صدی سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ سب آزادی کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ اصلاحی تحریکیں بھی تھیں۔ انڈونیشیا میں بھی سیاسی بیداری کا آغاز تحریک جہاد سے ہوتا ہے۔ اس تحریک کے بانی جیسا کہ ہم اس کتاب کی دوسری جلد میں پڑھ چکے ہیں شمالی سماترا میں آچیہ کے ایک ممتاز عالم امام بونجول (۱۷۷۲ء تا ۱۸۶۴ء) تھے۔ اس تحریک کا نعرہ یہ تھا کہ ''موت برحق ہے اور ایک مسلمان کے لیے بہترین موت اسلام کے لیے جان دینا ہے'' امام بونجول ۱۸۲۳ء سے ۱۸۳۷ء تک ولندیزوں سے جنگ کرتے رہے۔ آخر میں ان کو شکست ہوئی اور وہ قید کر دیے گئے اور قید خانہ ہی میں انتقال کیا۔ تحریک جہاد کے دوسرے بڑے رہنما دیپونی گورو (۱۷۸۵ء تا ۱۸۳۴ء) تھے۔ ان کا ماترم کے شاہی خاندان سے تعلق تھا۔ وہ بھی ایک ممتاز عالم دین تھے۔ انہوں نے ولندیزوں کو جاوا سے نکالنے کے لیے ۱۸۲۵ء سے ۱۸۳۰ء تک جنگ کی۔ آخر میں قید ہو گئے اور ولندیزوں نے ان کو مکاسر (سولاویسی) میں جلاوطن کر دیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ تحریک مجاہدین کے تیسرے بڑے رہنما تیکوعمر (وفات ۱۸۹۹ء) تھے۔ وہ سماترا میں آچیہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے شمالی سماترا میں بیس سال تک ولندیزوں سے جنگ کی اور ۱۷۹۹ء میں جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

حاجی عمر سعید اور شرکت اسلام

ولندیزوں کا تسلط مضبوط ہو جانے کے بعد انڈونیشی مسلمانوں نے تحریک آزادی کو جاری رکھا، لیکن اب اس تحریک نے جہاد کی جگہ جدید سیاسی انداز اختیار کر لیا۔ اس نئی تحریک کے سب سے بڑے رہنما حاجی عمر سعید (۱۸۸۳ء تا ۱۹۳۴ء) تھے۔ ان کو انڈونیشیا میں قومی آزادی کی تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ حاجی عمر سعید وسطی جاوا کے شہر مادیون (madiun) میں پیدا ہوئے تھے۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ولندیزی مدرسوں میں جدید طرز کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی آزادی کے لیے منظم کرنا شروع کیا اور ملک میں ایک ایسی پارلیمانی حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کیا جس میں انڈونیشی باشندوں کو نمائندگی حاصل ہو۔ اس پر ولندیزی حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا۔ رہائی کے بعد حاجی عمر سعید نے ۱۶ جنوری ۱۹۱۳ء کو جاوا کے دوسرے بڑے شہر سورابایا میں ''شرکت اسلام'' کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی۔ ۱۹۱۹ء تک اس تنظیم کی شاخیں سارے ملک میں پھیل گئیں اور اس کے ارکان کی تعداد پچیس لاکھ ہو گئی اور شرکت اسلام انڈونیشی مسلمانوں کی سب سے بڑی اور منظم جماعت بن گئی۔ شرکت اسلام نے نمائندہ پارلیمنٹ قائم کرنے کے ساتھ مکمل آزادی کا مطالبہ بھی کیا۔ حاجی عمر سعید نے عیسائی مبلغوں کی سرگرمیوں اور چینی باشندوں کی تجارتی اجارہ داری کے خلاف بھی آواز بلند کی۔

حاجی عمر سعید ایک شعلہ بیان مقرر اور ممتاز صحافی اور مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ''تاریخ دین اسلام'' اور ''اسلام اور اشتراکیت'' بہت اہم ہیں۔ حاجی عمر سعید مصر، ترکی اور اسلامی ہند کے مفکروں اور رہنماؤں سے بہت متاثر تھے اور اسلامی اتحاد کی تحریک کے علمبردار تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے مکہ میں ہونے والی موتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں بھی شرکت کی۔ ان کی قائم کردہ تنظیم شرکت اسلام کا مقصد آزادی کے علاوہ مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے واقف کرنا اور غیر اسلامی طرز معاشرت اور فرسودہ رسموں کو مٹانا تھا۔ گویا حاجی عمر سعید صرف ایک سیاسی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ ایک مصلح اور تجدید و احیائے اسلام کی تحریک کے علمبردار بھی تھے۔

حاجی عمر سعید کے بعد شرکت اسلام کے دوسرے رہنماؤں میں حاجی احمد دحلان اور حاجی آغوس

سالم [1] کے نام بہت اہم ہیں۔

حاجی احمد دحلان اور جمعیت محمدیہ

جس زمانہ میں شرکت اسلام سیاسی میدان میں انڈونیشی مسلمانوں کی رہنمائی کر رہی تھی اسی زمانہ میں ایک اور جماعت تعلیمی، معاشرتی اور ثقافتی میدانوں میں اصلاحی کام کر رہی تھی۔ اس جماعت کا نام جمعیت محمدیہ تھا اور اس کو شرکت اسلام ہی کے ایک رہنما حاجی احمد دحلان (پیدائش ۱۸۶۸ء) نے ۱۸/ نومبر ۱۹۱۲ء کو جاوا کے شہر جوگجکارتا میں قائم کیا تھا۔ یہ ایک طرح سے شرکت اسلام کی ذیلی جماعت تھی۔ حاجی احمد دحلان شہر جکارتا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد مکہ معظّمہ جا کر دینی علوم کی تکمیل کی۔ حاجی احمد دحلان کورانہ تقلید کے سخت مخالف اور اجتہاد کے حامی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں قبر پرستی اور دوسرے غیر اسلامی اثرات کے خلاف کام کیا۔ ان کی کوششوں سے جمعیت محمدیہ ایک ہمہ گیر اور سرگرم اصلاحی تحریک بن گئی۔ اس جماعت نے ملائی اور جاوی زبانوں میں قرآن کے ترجمے شائع کیے اور ملک بھر میں کتب خانے، شفا خانے، یتیم خانے اور محتاج خانے قائم کیے۔ جمعیت محمدیہ کا ایک بڑا کارنامہ مدرسوں کا قیام ہے جن میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ جمعیت محمدیہ نے شرکت اسلام کے زوال کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھا اور اس کی کوششوں سے ۱۹۴۶ء میں جکارتا میں اور ۱۹۵۵ء میں پڈانگ (سماترا) اور جوگ جکارتا میں اسلامی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ جمعیت محمدیہ نے عورتوں کے لیے ایک علیحدہ جماعت قائم کی جس کا نام ''جمعیت عائشہ'' تھا۔ آزادی کے بعد جب ماشومی کے نام سے مسلمانوں کی نئی تنظیم قائم ہوئی تو جمعیت محمدیہ اس سے وابستہ ہوگئی حاجی احمد دحلان کے بعد ڈاکٹر ابوحنیفہ اور حاجی امر اللہ جمعیت

(۱) حاجی آغوس سالم (۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۳ء) انڈونیشیا کی تحریک آزادی کے مرد بزرگ کہلاتے ہیں۔ وہ بلند پایہ خطیب، صحافی اور مصنف تھے۔ عربی، انگریزی، فرانسی اور ولندیزی زبانوں پر عبور تھا۔ انہوں نے ''فجر ایشیا'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ حاجی آغوس سالم جدید رجحانات سے باخبر تھے۔ انہوں نے امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے تھے۔ حاجی عمر سعید کے انتقال کے بعد جب شرکت اسلام کا شیرازہ منتشر ہوگیا تو حاجی آغوس سالم ۱۹۳۶ء میں شرکت اسلام سے الگ ہوگئے لیکن انہوں نے آزادی کی جدوجہد جاری رکھی اور اس سلسلے میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھائیں۔ آزادی کے بعد وہ کئی بار وزیر خارجہ مقرر ہوئے۔ انہوں نے زندگی میں سات حج کیے اور انڈونیشیا میں علمی اور سیاسی سطح پر اشتراکیت کی بھرپور مخالفت کی۔

محمدیہ کے ممتاز رہنما ہوئے ہیں۔

حصول آزادی

انڈونیشیا میں آزادی کی یہ تحریکیں جاری تھیں کہ ۱۹۳۹ء میں یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور فروری اور مارچ ۱۹۴۲ء میں جاپان نے انڈونیشیا پر قبضہ کرلیا۔ جاپان کا یہ قبضہ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۵ء تک قائم رہا۔ جاپانیوں نے اپنے ساڑھے تین سالہ دور میں تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ صرف مذہبی جماعتیں پابندیوں سے آزاد رہیں۔ چنانچہ جمعیت محمدیہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ انڈونیشیا میں جاپانیوں کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ اہل انڈونیشیا کو توقع تھی کہ ولندیزی حکومت کو ختم کرنے کے بعد جاپانی ان کو آزادی دے دیں گے۔ ان کی یہ توقع غلط ثابت نہیں ہوئی جاپان نے انڈونیشیا کو آزاد کرنے کا وعدہ کرلیا۔ چنانچہ انڈونیشی رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد نے جن میں ڈاکٹر احمد سوکارنو کا نام سب سے نمایاں ہے جاپانی حکومت سے تعاون شروع کردیا۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۵ء کو اگرچہ جاپانیوں نے اتحادیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے لیکن تین روز بعد ۱۷۔ اگست کو احمد سوکارنو اور ڈاکٹر محمد حتا[1] نے جاپانی امیر البحر کے مکان پر ایک اجتماع میں انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کردیا۔ جاپانیوں نے انڈونیشی باشندوں پر مشتمل ایک رضا کار فوج تیار کی تھی جس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ یہ فوج آزاد حکومت کے لیے بہت بڑا سہارا ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ جاپانی فوج نے بہت سے مقامات پر اسلحہ بھی آزاد فوج کے سپرد کردیا۔ اس طرح ۲۹۔ ستمبر ۱۹۴۵ء کو جب پہلی مرتبہ برطانوی فوج جاوا میں داخل ہوئی تو

---

(۱) ڈاکٹر محمد حتا (پیدائش ۱۹۰۲ء) انڈونیشیا کی آزادی کے معماروں میں سے ایک ہیں۔ وہ آزادی کی جنگ میں سوکارنو کے دست راست تھے۔ وہ سماترا میں ڈی کوک کے مقام پر ایک دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں محمد حتا معاشیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہالینڈ گئے۔ ہالینڈ میں انڈونیشی طلبہ کی مجلس کے صدر منتخب ہوئے۔ محمد حتا جب تعلیم سے فارغ ہوکر وطن واپس آئے تو حکومت نے ان کو گرفتار کرکے جلاوطن کردیا۔ جب جاپانیوں نے انڈونیشیا پر قبضہ کیا تو حتا کو آزادی ملی۔ انہوں نے سوکارنو کے ساتھ مل کر جاپان کے تعاون سے آزادی کے لیے زمین ہموار کی اور جب ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو انڈونیشیا کی آزاد جمہوریہ کے قیام کا اعلان کیا گیا تو وہ جمہوریہ کے نائب صدر منتخب ہوئے اور کئی سال تک وزیر اعظم بھی رہے۔ لیکن وہ صدر سوکارنو کی آمرانہ پالیسیوں کا ساتھ نہیں دے سکے اور ۱۹۵۶ء میں انہوں نے حکومت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ سوکارنو کے بعد صدر سوہارتو نے ملک کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے ڈاکٹر حتا کو اپنا مشیر مقرر کیا۔ ڈاکٹر محمد حتا ایک ممتاز ماہر معاشیات ہیں اور اس موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ انڈونیشیا میں امداد باہمی کی تحریک کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔

اس وقت تک انڈونیشی حکومت اس قابل ہو چکی تھی کہ وہ اپنی آزادی کی بزور شمشیر مدافعت کر سکے۔ برطانوی فوج کے بعد جلد ہی ولندیزی بھی واپس آ گئے انہوں نے انڈونیشیا کی آزاد حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انڈونیشیا پر پھر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انڈونیشی حکومت اور ولندیزی حکومت کے درمیان جنگ شروع ہو گئی جس کا سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ ولندیزوں نے سوکارنو، محمد حتا اور کئی دوسرے انڈونیشی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن دوسرے رہنماؤں نے جن میں ڈاکٹر محمد ناصر بھی شامل تھے جنگ آزادی کو سماترا اور ملک کے دوسرے حصوں میں جاری رکھا۔ آخر آزادی کی یہ جدوجہد کامیاب ہوئی اور دنیا کے سب سے بڑے بین الاقوامی ادارے اقوام متحدہ نے انڈونیشیا کی آزادی کے حق کو تسلیم کر لیا۔ اور ہالینڈ پر زور ڈالا کہ وہ وطن دوست رہنماؤں کو رہا کر کے جمہوریہ انڈونیشیا کو اختیارات منتقل کر دے۔ عالمی رائے عامہ کے اس دباؤ کے تحت ہالینڈ نے مجبور ہو کر گرفتار رہنماؤں کو رہا کر دیا اور ۲۸۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جمہوریہ انڈونیشیا کی آزادی تسلیم کر لی۔ اس طرح انڈونیشیا کا وسیع و عریض ملک ڈھائی سو سال کی غلامی کے بعد ایک بار پھر آزاد ملکوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

احمد سوکارنو کا دور صدارت (۱۹۴۵ء تا ۱۹۶۶ء)

احمد سوکارنو بیس سال سے زیادہ عرصہ تک انڈونیشیا کے صدر رہے۔ وہ جاوا میں سورابایا کے قریب ایک غریب گھرانہ میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایک غریب اسکول ماسٹر تھے۔ لیکن مشہور انڈونیشی رہنما حاجی عمر سعید نے سوکارنو کی سرپرستی کی۔ ان کو تعلیم دلائی اور اپنی لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔ سوکارنو نے بانڈونگ کے ٹکنیکل کالج میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں وہ اشتراکی نظریات سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے حاجی عمر سعید کی مخالفت شروع کر دی اور ان کی بیٹی کو طلاق دے کر ایک دولت مند بیوہ سے شادی کر لی۔ سوکارنو کی والدہ بھی بالی کی ہندو خاتون تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ سوکارنو کے خیالات اپنی ہندو ماں کی وجہ سے بھی متاثر ہوئے۔

سوکارنو ولندیزی حکومت سے عدم تعاون کے اور کامل آزادی کے علمبردار تھے۔ ۱۹۲۷ء میں انہوں نے انڈونیشی نوجوانوں کے ساتھ مل کر ''انڈونیشی قومی پارٹی'' قائم کی۔ جس کے وہ صدر منتخب ہوئے۔ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے حکومت نے ان کو دسمبر ۱۹۲۹ء میں گرفتار کر لیا اور

وہ دو سال قید رہے۔ سن ۱۹۳۳ء میں سوکارنو کو جزیرہ فلورس میں جلاوطن کر دیا گیا جہاں سے ۱۹۴۲ء میں جاپانیوں نے رہائی دلائی۔ انڈونیشیا پر جاپانی قبضہ کے دوران انہوں نے جاپانیوں سے تعاون کیا۔ جاپانیوں نے ان کو کئی تنظیموں کا سربراہ بنا دیا۔ اور اس طرح سوکارنو کو ملکی سیاست میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ۱۷۔ اگست ۱۹۴۵ء کو سوکارنو نے محمد حتا اور دوسرے انڈونیشی رہنماؤں کے اجتماع میں انڈونیشیا کی آزاد جمہوریہ کے قیام کا اعلان کیا اور انڈونیشیا کے پہلے صدر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا۔ ولندیزوں سے جنگ کے دوران ولندیزی فوجوں نے ان کو گرفتار کر لیا لیکن انڈونیشی قوم پرستوں کی کامیاب مدافعت کے بعد ان کو رہا کر دیا۔

انڈونیشی حکومت چونکہ انقلاب کے ذریعہ وجود میں آئی تھی اس لیے اس کی پارلیمنٹ منتخب افراد پر مشتمل نہیں تھی۔ اس لیے شروع میں عارضی آئینوں کے ذریعہ حکومت ہوتی رہی۔ ان میں پہلا آئین ۱۹۴۵ء میں نافذ ہوا تھا۔ دوسرا نومبر ۱۹۴۹ء کو نافذ ہوا۔ اس آئین کے تحت انڈونیشیا کو ایک وفاقی جمہوریہ قرار دیا گیا تھا۔ ۱۷۔ اگست ۱۹۵۰ء کو جب تیسرا آئین نافذ کیا گیا تو انڈونیشیا میں ایک وحدانی مرکزی حکومت قائم کر دی گئی۔ انڈونیشیا کا آئین صدر سوکارنو کے پانچ اصولوں پر مبنی ہے جن کو انڈونیشی زبان میں پنج شیلا کہا جاتا ہے۔ پنج شیلا سے مراد: (۱) خدا کا اقرار (۲) قوم پرستی (۳) جمہوریت (۴) انسان دوستی (۵) معاشرتی انصاف ہے۔

سیاسی جماعتیں

جاپانیوں نے اپنے دور میں سیاسی جماعتوں پر پابندیاں لگا دی تھیں۔ لیکن ۱۹۴۵ء میں آزادی کے اعلان کے بعد جلد ہی یہ پابندی ختم کر دی گئی اور ملک میں سابق سیاسی پارٹیاں بحال ہو گئیں یا نئی سیاسی پارٹیاں قائم ہو گئیں۔ ان میں سب سے اہم جماعتیں چار تھیں:

۱۔ انڈونیشی قومی پارٹی

یہ صدر سوکارنو کی جماعت تھی جو ۱۹۲۷ء میں قائم کی گئی تھی۔ یہ خالص قوم پرست جماعت تھی۔ اور نیم اشتراکی رجحانات رکھتی تھی۔

۲۔ مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا

اس کو مختصر طور پر ماشومی پارٹی کہا جاتا ہے۔ یہ جماعت ۸۔ نومبر ۱۹۴۵ء کو قائم کی گئی تھی۔ اس کے بانی شرکت اسلام کے ایک رہنما ڈاکٹر محمد سوکیمان [1] تھے اور وہی اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ماشومی اسلامی انقلاب کی علمبردار جماعت تھی اور اسلام کو صرف مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات تصور کرتی تھی۔ یہ جماعت سیکولرازم اور پنچ شیلا کے اصولوں کے خلاف تھی اور انڈونیشیا کو ایک جمہوری اسلامی مملکت میں تبدیل کرنا چاہتی تھی۔ قومی ملکیت، امداد باہمی کاشتکاروں کو زمین کا مالک بنانا اور مزدوروں کے حقوق کا تحفظ اس کے پروگرام کا اہم حصہ تھے۔ ڈاکٹر سوکیمان کے بعد اس کے دوسرے بڑے رہنما ڈاکٹر محمد ناصر تھے۔

۳۔ نہضۃ العلماء

یہ علماء کی جماعت تھی جسے ۱۹۲۶ء میں شیخ عبدالوہاب نے قائم کیا تھا۔ تعلیم کی اشاعت اور اسلام کی تبلیغ کے مسئلہ پر جمعیت محمدیہ سے متفق تھی لیکن معاشرتی اصلاحات کے مسئلہ پر جمعیت محمدیہ سے اختلاف تھا۔ جاپانی دور میں اس پر اور جمعیت محمدیہ پر دینی جماعت ہونے کی وجہ سے پابندی نہیں لگائی گئی تھی لیکن آزادی کے بعد نہضۃ العلماء نے سیاسی جماعت کی شکل اختیار کر لی۔

۴۔ کمیونسٹ پارٹی

یہ جماعت ۱۹۱۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں اس نے انقلاب کی ناکام کوشش کی۔ جاپانیوں کے زمانہ میں پارٹی روپوش ہوگئی۔ آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۵ء کو محمد یوسف نے ازسرِنو قائم کی۔

انڈونیشیا میں پہلے انتخابات ۱۹۵۵ء میں ہوئے۔ ان میں اگرچہ بکثرت سیاسی جماعتوں

(۱) محمد سوکیمان ۱۸۹۶ء میں وسطی جاوا میں پیدا ہوئے۔ ہالینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ طلبہ کی تحریکوں اور شرکت اسلام میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۴ء میں شرکت اسلام چھوڑ کر اسلام پارٹی قائم کی۔ ولندیزوں سے تعاون کے سخت مخالف تھے۔ جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۵۲ء میں کچھ مدت کے لیے انڈونیشیا کے وزیر اعظم ہو گئے۔ اسلامی اتحاد کے علمبردار اور کمیونسٹوں کے سخت مخالف تھے۔

نے حصہ لیا لیکن صرف چار جماعتیں کامیاب ہوئیں، ان میں پہلی صدر سوکارنو کی قوم پرست پارٹی، دوسری ماشومی پارٹی، تیسری نہضۃ العماء اور چوتھی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ ان میں سے ہر جماعت کے ممبر تقریباً یکساں تعداد میں منتخب ہوئے، صدر سوکارنو نے ملک کا انتظام چلانے کے لیے مختلف اوقات میں مختلف وزیر اعظم منتخب کیے۔ ان میں محمد حتا اور ڈاکٹر ناصر کے نام قابل ذکر ہیں، ڈاکٹر ناصر ماشومی پارٹی کے نمائندے تھے۔ صدر سوکارنو اگرچہ ایک محب وطن رہنما تھے لیکن وہ جمہوری انداز پر حکومت نہیں چلا سکے اور رفتہ رفتہ انہوں نے آمرانہ طرز عمل اختیار کرلیا۔ ان کے اس رجحان کے خلاف ۱۹۵۸ء میں سماترا اور دوسرے جزیروں میں فوجی کمانڈروں نے بغاوت کردی۔ ماشومی پارٹی کے رہنماؤں نے بھی باغیوں کا ساتھ دیا۔ یہ بغاوت جلد ہی کچل دی گئی اور اس کے نتیجے میں ماشومی پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اور اس کے رہنما گرفتار کرلیے گئے۔

۱۹۵۹ء میں صدر سوکارنو نے غیر معمولی اختیارات حاصل کرلیے اس سال انتخابات ہونے والے تھے لیکن وہ ملتوی کردیے گئے اور صدر سوکارنو نے مجلس دستور ساز بھی توڑ دی اور پارلیمنٹ کو معطل کردیا۔ اس کی جگہ صدر سوکارنو نے ایک ''عوامی مشاورتی کانگریس'' قائم کی جس کی حیثیت خود مختار ادارے کی نہیں تھی بلکہ ایک مشاورتی ادارے کی تھی، صدر سوکارنو اس معاملے میں پاکستان کے صدر ایوب کے ہم خیال تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ انڈونیشیا میں جمہوریت ان کی رہنمائی کے بغیر نہیں چل سکتی۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں انہوں نے سیاسی جماعتوں کی تعداد محدود کردی اور صرف آٹھ سیاسی جماعتوں کو جو ان کے نظریات سے اتفاق کرتی تھیں قائم رہنے کی اجازت دی۔

صدر سوکارنو اگرچہ پرولتاری آمریت کے اصول اور اشتراکیوں کی طبقاتی جدوجہد کے اصول کے خلاف تھے لیکن انہوں نے اپنے دور صدارت میں کمیونسٹ پارٹی اور لادینی یا سیکولر عناصر کی زیادہ سے زیادہ سرپرستی کی۔ ان کے اس طرز عمل نے صدر سوکارنو کے کئی پرانے ساتھیوں کو جن میں ڈاکٹر محمد حتا کا نام نمایاں ہے ان سے جدا کردیا۔ محمد حتا کئی سال تک نائب صدر اور وزیر اعظم کے عہدے پر قائم رہے لیکن ۱۹۵۶ء میں انہوں نے صدر سوکارنو سے علیحدگی اختیار کرلی۔

اشتراکی سازش

صدر سوکارنو اگرچہ غیر جانبدارانہ پالیسی کے حامی تھے لیکن وہ اس پالیسی کو نباہ نہ سکے اور انہوں نے انڈونیشیا کو مغربی ممالک سے کاٹ کر اشتراکی حلقے میں شامل کر دیا۔ ان کی اس پالیسی کا انڈونیشیا کی معیشت پر بہت بُرا اثر پڑا، ملک کی صنعتی ترقی رُک گئی، گرانی میں تیزی سے اضافہ ہوا اور انڈونیشی سکہ کی قیمت بے حد گر گئی۔ صدر سوکارنو نے روس کی فوجی امداد سے انڈونیشیا کی فوجی طاقت میں تو کافی اضافہ کر دیا لیکن وہ بگڑتے ہوئے معاشی حالات پر قابو نہ پا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں حکومت کے خلاف بے چینی پھیل گئی۔ اس بے چینی سے فائدہ اٹھا کر کمیونسٹ پارٹی نے فوج کے ایک حصہ کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ اور ۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو چھ ممتاز فوجی جرنلوں کو رات کے وقت چھاپہ مار کر قتل کر دیا۔ انہوں نے وزیر دفاع عبدالحارث ناسوتیاں کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بچ نکلے۔

۱۹۶۲ء میں جب انڈونیشیا کے شمال میں ملائیشیا کا وفاق قائم ہوا تو صدر سوکارنو نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس وفاق کے دو حصے ساراواک اور صباح انڈونیشی جزیرے کلیمنتان یا بورنیو میں واقع تھے اور انڈونیشی علاقے سے ان کی حدود ملتی تھیں۔ صدر سوکارنو نے ان علاقوں میں مداخلت کرنے کے لیے ایک خاص فوج تیار کی تھی جس کا نام سولاونگی ڈویژن تھا۔ اس فوج کے سپہ سالار جنرل سوہارتو کو جب کمیونسٹ انقلاب کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے جوانوں کے ساتھ جاوا کا رُخ کیا اور کمیونسٹ بغاوت کو کچل دیا عوام بھی ہر طرف کمیونسٹوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ملک میں خونریزی کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا جو کئی دن جاری رہا اور جس میں چار لاکھ سے زیادہ انسان ہلاک ہوئے۔

کمیونسٹوں کو زیادہ طاقتور بنانے میں چونکہ صدر سوکارنو کی پالیسی کو بہت دخل تھا اس لیے کمیونسٹوں کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ سوکارنو کا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ صدر سوکارنو کے اخلاص اور ان کی قومی خدمات کا سب کو اعتراض تھا لیکن ان کا دور صدارت انڈونیشیا کے لیے مصائب اور پریشانیوں کا دور بن گیا تھا عوام اب ان کے خلاف ہو چکے تھے، ۱۹۶۶ء میں طلبہ نے سوکارنو کے خلاف وسیع پیمانے پر مظاہرے کیے جن سے مجبور ہو کر صدر سوکارنو نے جنرل سوہارتو کو بیشتر

اختیارات سونپ دیے اور مارچ ۱۹۶۶ء میں انڈونیشیا کی مشاورتی کانگریس نے سوکارنو کی جگہ سوہارتو کو قائم مقام صدر مقرر کر دیا۔ ۱۹۶۷ء میں سوکارنو صدارت سے معزول کر دیے گئے۔ ۲۱۔جون ۱۹۷۰ء کو ان کا جوگجا کارتا میں انتقال ہو گیا۔

صدر سوکارنو کا طویل دور اگرچہ ملک کے لیے مصائب اور پریشانیاں لے کر آیا تھا لیکن مغربی ایریان کے وسیع و عریض علاقے کی انڈونیشیا میں شمولیت سوکارنو کے عہد کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ہالینڈ نے انڈونیشیا کو آزادی دیتے وقت مغربی ایریان کا علاقہ انڈونیشی حکومت کے سپرد نہیں کیا تھا حالانکہ یہ علاقہ ولندیزی غرب الہند کی مرکزی حکومت میں شامل تھا۔سوکارنو کے دور میں مغربی ایریان کو حاصل کرنے کی سخت جدوجہد کی گئی،فوجی دستے قائم کیے گئے جنہوں نے مغربی ایریان میں داخل ہو کر چھاپہ مار جنگ شروع کر دی۔ آخر کار امریکہ کی مداخلت سے ۱۹۶۲ء میں انڈونیشیا اور ہالینڈ میں ایک معاہدہ ہو گیا جس کے تحت مغربی ایریان اقوام متحدہ کی زیر نگرانی دے دیا گیا اور اقوام متحدہ نے یکم مئی ۱۹۶۳ء کو مغربی ایریان کا انتظام اس شرط پر انڈونیشی حکومت کے سپرد کر دیا کہ انڈونیشی حکومت ۱۹۶۹ء میں مغربی ایریان کے باشندوں کی رائے لے کر علاقے کے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔ مغربی ایریان کے باشندوں نے بالآخر اگست ۱۹۶۹ء میں انڈونیشیا میں شامل رہنے کا فیصلہ کیا۔اور اگرچہ یہ فیصلہ صدر سوکارنو کے بعد ہوا لیکن مغربی ایریان عملاً ان ہی کے عہد میں انڈونیشیا کا حصہ بن چکا تھا۔

صدر سوہارتو کے دور میں بھی انڈونیشیا کے حدود میں توسیع ہوئی۔ جزیرہ تیمر کا نصف حصہ انڈونیشیا میں شامل تھا اور نصف پر پرتگال قابض تھا۔ ۱۹۷۵ء میں پرتگالی فوجیں واپس چلی گئیں۔ جس کے بعد صدر سوہارتو نے انڈونیشیا سے الحاق کے حامی عناصر کی درخواست پر ۳۔مئی ۱۹۷۶ء کو تیمر کا الحاق انڈونیشیا سے کر لیا۔

جنرل سوہارتو کا دور صدارت

سوکارنو کو صدارت سے علیحدہ کرنے کے بعد جنرل سوہارتو (پیدائش ۸۔جون ۱۹۲۱ء) انڈونیشیا کے صدر منتخب کر لیے گئے،صدر سوکارنو کے زمانے میں انڈونیشیا کی صنعتی و زرعی زندگی

مفلوج ہوگئی تھی۔ ملک قرضوں کے بوجھ سے اس حد تک دب گیا تھا کہ قرضوں کی ادائیگی ممکن نہیں رہی تھی۔ ان حالات میں نئی فوجی حکومت نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دی کہ تباہ شدہ معیشت کو بحال کیا جائے اور ایک ایسی غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کی جائے جس کے تحت نہ صرف یہ کہ اشتراکی ملکوں سے تعلقات قائم رہیں بلکہ مغربی ملکوں سے بھی تعلقات بحال ہو جائیں جو صدر سوکارنو کے دور میں تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ انڈونیشیا کی موجودہ حکومت کو بظاہر اپنے ان مقاصد میں کامیابی ہورہی ہے۔ صنعتی کارخانے جو کل پرزوں کی کمی کی وجہ سے بند ہو گئے تھے پھر چلنے لگے ہیں۔ زرعی پیداوار بھی بڑھ رہی ہے، بے روزگاری جو پہلے عام ہوگئی تھی اب کم ہو رہی ہے، مغربی ملکوں سے تعلقات بڑھ گئے ہیں، مغربی ملک اور روس قرضوں کی اقساط کی وصولی کے لیے آسان شرائط پر راضی ہو گئے اور ملک کی معیشت کو بحال کرنے کے لیے نئے قرض بھی ملنا شروع ہو گئے۔ انڈونیشیا شکر سازی میں دنیا میں سب سے آگے تھا لیکن سوکارنو کے دور میں شکر کی پیداوار تیس لاکھ ٹن سالانہ سے گر کر صرف چھ لاکھ ٹن رہ گئی تھی۔ اب یہ صنعت بحال ہو رہی ہے۔ پٹرول کی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں صرف تین لاکھ ٹن پٹرول نکالا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں یہ مقدار چھ کروڑ تیس لاکھ ٹن تک پہنچ گئی اور انڈونیشیا پٹرول پیدا کرنے والا دسواں بڑا ملک بن گیا ہے۔ افراط زر پر بھی بڑی حد تک قابو پا لیا گیا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں افراط زر چھ سو فیصد تھا لیکن ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں صرف اٹھارہ فیصد رہ گیا۔ بیرونی سرمایہ میں انڈونیشی سرمایہ کا تناسب اکاون فیصد مقرر کیا گیا ہے۔ تیل، معدنیات اور جنگلات کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صدر سوہارتو کے دور میں انڈونیشیا اس معاشی بحران سے نکل آیا ہے جس میں صدر سوکارنو کے دور میں مبتلا ہو گیا تھا۔

انڈونیشیا کی معاشی صورت حال جس قدر روشن ہے سیاسی اور معاشرتی حالت اتنی اچھی نہیں۔ شروع میں کئی سال تک اصل اختیارات پارلیمنٹ سے زیادہ صدر سوہارتو اور فوجی افسروں کے پاس رہے۔ ان کے دور میں پہلے عام انتخابات ۱۹۷۱ء میں ہوئے جو ۱۹۵۵ء کے انتخابات کے بعد انڈونیشیا کے دوسرے عام انتخابات تھے۔ لیکن یہ انتخابات بھی صدر سوکارنو کی محدود

جمہوریت کے اصول کے تحت ہوئے۔[1] ماشومی پارٹی اب بھی ممنوع پارٹی ہے اور کمیونسٹوں کی تخریبی کاروائیوں خصوصاً ۱۹۶۶ء میں خونریز انقلاب کی کوشش کرنے کی وجہ سے ۱۲۔مارچ ۱۹۶۷ء کو خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ ڈاکٹر محمد حتا نے اسلامی جمہوری پارٹی قائم کرنا چاہی مگر اجازت نہیں ملی۔ جولائی ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں سرکاری جماعت گولکر پارٹی کو کامیاب بنانے کے لیے ہر قسم کے ناجائز طریقے اختیار کیے گئے۔ ماشومی سے تعلق رکھنے والے دو ہزار سے زیادہ رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا اور ماشومی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو انتخابات کا نااہل قرار دیا گیا۔ پارلیمنٹ میں منتخب ممبروں کے علاوہ ایک سو افراد کو خود صدر سہارتو نامزد کرتے ہیں۔ اس وقت انڈونیشیا میں سیاسی جماعتوں کی پوزیشن یہ ہے:

(۱) گولکر پارٹی

یہ سرکاری جماعت ہے۔ یہ جماعت ۱۹۶۴ء میں قائم ہوئی تھی لیکن ۱۹۷۱ء میں اس کی از سرنو تنظیم کی گئی۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں گولکر پارٹی نے ۲۲۷ نشستیں اور مئی ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ۲۳۲ نشستیں حاصل کیں۔

(۲) ترقیاتی اتحاد پارٹی (Development Unity Party)

نومبر ۱۹۶۸ء میں اسلام پسند رہنماؤں نے سولہ اسلامی جماعتوں کے انضمام کے بعد پارٹی مسلمین انڈونیشیا کو قائم کیا تاکہ وہ ماشومی پارٹی کی جگہ لے سکے۔ ڈاکٹر محمد روم اس کے صدر منتخب ہوئے لیکن حکومت نے پابندی لگا دی کہ ماشومی کا کوئی رہنما اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ حکومت نے ماشومی سے تعلق رکھنے والے دو ہزار رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۷۱ء

---

(۱) نئے آئین کے تحت صدر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسی پارٹی کو توڑ سکتا ہے جس کے منتخب ارکان کی تعداد کم از کم ایک چوتھائی انڈونیشیا سے تعلق نہ رکھتی ہو یا جس کی پالیسی ریاست کے اغراض و مقاصد کے خلاف ہو۔ انڈونیشی پارلیمنٹ میں بھی ایک سو ارکان ایسے ہوتے ہیں جن کو صدر مختلف پیشوں، فوج اور علاقائی نمائندوں میں سے نامزد کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کے علاوہ ایک مشاورتی مجلس بھی ہے جس کے ارکان کی تعداد نو سو بیس ہے۔ اس میں تین سو تین نمائندے فوج پیشہ ور افراد اور دانش وروں میں سے نامزد کیے جاتے ہیں۔ یہی مجلس سب سے بااختیار ادارہ ہے۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں مشاورتی مجلس میں ۳۰۸ نمائندے گولکر پارٹی کے ۱۳۹۔ اسلامی گروپ کے اور ۱۳۵ علاقائی نمائندے تھے۔

کے انتخابات میں پارٹی مسلمین کے صرف ۲۷ نمائندے کامیاب ہوسکے۔ ۱۹۷۳ء میں پارٹی مسلمین نے تین دوسری اسلام پسند جماعتوں نہضۃ العلماء شرکت اسلام اور مسلم پارٹی کے ساتھ مل کر ''ترقیاتی اتحاد پارٹی'' کے نام سے ایک مشترکہ تنظیم قائم کی۔ چاروں جماعتوں نے اپنا جداگانہ وجود قائم رکھا ہے اور وہ مذہبی اور غیر سیاسی امور میں آزاد ہیں۔ ترقیاتی پارٹی کی حیثیت صرف سیاسی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں اس مشترکہ تنظیم کے ایک سو آئیس نمائندے کامیاب ہوئے تھے۔ جن میں نہضۃ العلماء کے ۵۸۔ پارٹی مسلمین کے ۲۷۔ شرکت اسلام کے تیرہ اور مسلم پارٹی کے تین نمائندے کامیاب ہوئے تھے۔ مئی ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ترقیاتی اتحاد پارٹی کے ۹۹ نمائندے کامیاب ہوئے۔

(۳) ڈیموکریٹک پارٹی

یہ جماعت سابق قومی پارٹی اور چار مسیحی پارٹیوں کے انضمام کے بعد ۱۹۷۳ء میں قائم کی گئی۔ ۱۹۷۱ء میں قومی پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۲۷ تھی جبکہ دوسری چار پارٹیوں کے ممبروں کی تعداد پندرہ تھی۔ ۱۹۷۳ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کے صرف ۲۹ نمائندے کامیاب ہوئے۔ اس طرح انڈونیشی پارلیمنٹ کے تین سو ساٹھ منتخب نمائندوں کے موجودہ ایوان میں گولکر پارٹی کے دو سو بتیس، ترقیاتی اتحاد پارٹی کے ننانوے اور ڈیموکریٹک پارٹی کے ۲۹ نمائندے ہیں۔ ان منتخب نمائندوں کے علاوہ ایک سو افراد کو صدر سوہارتو نے پارلیمنٹ میں خود نامزد کیا ہے۔ اس طرح چار سو ساٹھ افراد پر مشتمل پارلیمنٹ پر صدر سوہارتو کی گرفت مضبوط ہوگئی ہے۔ مارچ ۱۹۷۸ء میں صدر سوہارتو اتفاق رائے سے پھر پانچ سال کے لیے صدر منتخب کر لیے گئے۔

انڈونیشیا ان چند اسلامی ملکوں میں شامل ہے جن میں اقلیتی گروہوں کو اتنا اقتدار حاصل ہوگیا ہے کہ آبادی کی مسلم اکثریت ان اقلیتی گروہوں کے دباؤ میں آگئی ہے۔ انڈونیشیا میں چینی باشندے شروع سے تجارتی اور معاشی زندگی پر حاوی تھے۔ سوہارتو کے دور میں ان چینی باشندوں کی گرفت کمزور پڑی ہے لیکن اب ان کی جگہ عیسائیوں کا زور بڑھ گیا ہے۔ ملک کی معاشی اور سیاسی زندگی پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہوگئی ہے۔ حکومت اور فوج میں وہ آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ عہدوں پر فائز ہیں۔ صحافت اور تعلیم کے شعبوں پر بھی ان کا اثر گہرا ہے۔ عیسائیت

کی تبلیغ کرنے کی پوری آزادی ہے جس کی وجہ سے صدر سوہارتو کے دس سالہ دور میں عیسائیوں کی تعداد ۳۵ لاکھ سے بڑھ کر ۹۵ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ ان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ پورے انڈونیشیا کو عیسائی بنا لینے کی توقع رکھتے ہیں۔ حکومت انڈونیشیا ان اعداد و شمار کو مبالغہ آمیز قرار دیتی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس وقت انڈونیشیا کی کل آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۹۲ فیصد ہے۔ اگر اس دعوے کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عیسائی اقلیت کے بڑھتے ہوئے اثرات انڈونیشیا کو ایک اسلامی مملکت بنانے کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔

انڈونیشیا میں پہلے عام انتخابات ۱۹۵۵ء میں ہوئے تھے جس میں چار سیاسی جماعتیں یکساں قوت کے ساتھ کامیاب ہوئی تھیں۔ ان میں دو جماعتیں ماشومی اور نہضۃ العلماء انڈونیشیا کو اسلامی مملکت بنانے کی حامی تھیں۔ نہضۃ العلماء کے اثرات جاوا میں جو ملک کا سب سے کثیر الآباد جزیرہ ہے بہت گہرے تھے اور باقی جزیروں میں ماشومی کے اثرات تھے۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں جب صدر سوکارنو کے آمرانہ طرز عمل کے خلاف سماترا اور دوسرے جزیروں کے فوجی کمانڈروں نے بغاوت کی تو ماشومی پارٹی باغیوں کی حمایت کے الزام میں توڑ دی گئی اور اس کے رہنما جیلوں میں بند کر دیے گئے۔ اگر اس موقع پر نہضۃ العماء صدر سوکارنو کا ساتھ نہ دیتی تو انڈونیشیا میں اسلامی تحریک کو بہت تقویت ملتی۔ لیکن نہضۃ العلماء کے عمل میں تضاد تھا۔ ایک طرف وہ سیکولرازم اور اشتراکیت کی مخالفت کرتی تھی اور دوسری طرف اس نے ان ہی عناصر سے تعاون بھی کیا اور ماشومی کے ہاتھ مضبوط کرنے کی بجائے غیر اسلامی عناصر کو تقویت پہنچائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب نہضۃ العلماء کو اپنی غلط پالیسی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ اب اسلامی رجحان رکھنے والی پارٹیوں کی تنظیم ترقیاتی اتحاد پارٹی میں شامل ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد ناصر

انڈونیشیا کے اسلام پسند رہنماؤں میں اس وقت ڈاکٹر محمد ناصر سب سے ممتاز اور مقبول شخصیت ہیں۔ وہ جولائی ۱۹۰۸ء میں مغربی سماترا میں پیدا ہوئے۔ ہالینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ انڈونیشیا واپس آنے کے بعد نوجوانوں کے تعلیمی کلب قائم کیے۔ جاپانی قبضہ کے بعد خفیہ تحریک منظم کر کے آزادی کے لیے کام کیا۔ انڈونیشیا کی جنگ آزادی میں انہوں نے سرگرمی سے حصہ لیا

اور جب ڈاکٹر محمد سوکیمان نے ۱۹۴۵ء میں ماشومی پارٹی کی بنیاد ڈالی تو وہ بہت جلد اس پارٹی کے ممتاز ترین رہنما بن گئے اور اسی سال عارضی پارلیمنٹ میں ماشومی کی طرف سے نمائندے منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں وزیر اطلاعات مقرر ہوئے۔ ہالینڈ کے دوبارہ تسلط کے بعد آزادی کی جنگ لڑی اور مصائب برداشت کیے۔ ۱۹۵۱ء میں وزیر اعظم بھی ہوئے مگر صدر سوکارنو کی آزاد خیالی اور ڈاکٹر ناصر کی اسلام پسندی زیادہ عرصہ تک ساتھ ساتھ نہ چل سکی۔ ڈاکٹر ناصر وزارت عظمیٰ سے دستبردار ہوگئے، اور میدان سیاست میں آگئے۔ انہوں نے ڈاکٹر سوکارنو کے نظریات پر کھل کر تنقید کی اور نوبت خانہ جنگی تک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر ناصر اسلامی نظام کے علمبردار ہیں۔ انگریزی، ولندیزی، عربی اور انڈونیشی زبانوں کے فاضل ہیں۔ فلسفہ اسلام کے اچھے عالم ہیں اور جدید علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی سب سے مشہور کتاب ''اسلامی ثقافت ہے۔ ڈاکٹر ناصر نے اسلام کو جدید دنیا کے سامنے علمی انداز میں پیش کرنے کے سلسلے میں وہی کام کیا ہے جو مصر میں سید قطب اور پاکستان میں مولانا مودودی[1] نے کیا ہے۔

ڈاکٹر ناصر نے دیوان دعوت کے نام سے جکارتا میں ایک تبلیغی مجلس قائم کی ہے یہ ایک علمی اور دینی ادارہ ہے جس کی طرف سے اسلامی لٹریچر شائع کیا جاتا ہے اور دوسری زبانوں سے اسلامی مفکروں اور مصنفوں کی کتابوں کا انڈونیشی زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر پاکستانی مفکر اور شاعر علامہ اقبال سے بہت متاثر ہیں اور اقبال کی تحریروں کا انگریزی سے انڈونیشی زبان میں ترجمہ کیا۔ شاہ فیصل فاؤنڈیشن نے ڈاکٹر ناصر کی اسلامی خدمات کا اعتراف ۱۹۸۰ء کے اوائل میں ان کو اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کو مشترکہ طور پر شاہ فیصل ایوارڈ دے کر کیا۔

انڈونیشیا کے دوسرے اسلام پسند رہنماؤں میں محمد روم جو ۱۹۰۸ء میں جاوا میں پیدا ہوئے، محمد ظفر الدین جو ۱۹۱۱ء میں ساترا میں پیدا ہوئے اور جمعیت محمدیہ کے قائد ابوحنیفہؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ سب رہنما ماشومی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ اس تعلق

---

(۱) ڈاکٹر ناصر کے سیاسی اور اجتماعی نظریات سے واقف ہونے کے لیے ان کی وہ تقریر قابل مطالعہ ہے جو انہوں نے انڈونیشی پارلیمنٹ میں اسلامی دستور کی حمایت میں دی تھی اور جس کا مکمل اردو ترجمہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ کی کتاب ''نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں'' شائع ہوا ہے۔

کی وجہ سے وہ اب اپنے وطن کی سیاست میں عملی حصہ نہیں لے سکتے۔

انڈونیشیا میں اسلامی ذہن رکھنے والے رہنماؤں میں سابق وزیر دفاع جنرل عبدالحارث ناسوتیاں (nasution) کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ وہ ۳۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو شمالی سماترا میں پیدا ہوئے۔ پائڈنگ کی فوجی اکیڈمی میں تعلیم پائی۔ پھر ولندیزی فوج میں ملازمت کی۔ انہوں نے آزادی کے بعد ولندیزوں کے خلاف گوریلا جنگ کی منصوبہ بندی کی۔ ۱۹۵۰ء میں وہ انڈونیشی فوج کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں انہوں نے شمالی سماترا کی بغاوت فرو کی۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء تک وہ وزیر دفاع رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء تک انڈونیشیا کی عوامی مشاورتی کمیٹی کے صدر رہے جو انڈونیشیا میں قانون سازی کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس کے بعد وہ ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ جنرل عبدالحارث نصف درجن کے قریب کتابوں کے مصنف ہیں جو تقریباً سب چھاپہ مار جنگ اور دوسرے فوجی امور سے متعلق ہیں۔ ان کی ایک کتاب صداقت اور انصاف (truth and justice) کے موضوع پر بھی ہے۔[1]

تعلیم اور صحافت

انڈونیشیا میں آزادی کے بعد سے تعلیم پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ ملک کے چپے چپے میں مدرسے اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کیے جارہے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں سرکاری اور نجی یونیورسٹیوں کی تعداد پچاس تھی۔ ان میں کئی یونیورسٹیاں فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی ہیں۔ نجی یونیورسٹیوں میں جکارتا کی ابن خلدون یونیورسٹی، یوگور کی ابن خلدون یونیورسٹی جوگجکارتا کی اسلامی یونیورسٹی، کریبون (جاوا) کی اسلامی یونیورسٹی، جکارتا کی اسلامی یونیورسٹی، میڈرن میں شمالی سماترا کی اسلامی یونیورسٹی، اور جکارتا کی محمدیہ یونیورسٹی مسلمانوں کے زیر اہتمام ہیں۔ ان میں جوگجکارتا کی اسلامی یونیورسٹی سب سے بڑی ہے۔ اس میں طلبہ کی تعداد چار ہزار ہے۔ شمالی سماترا کی اسلامی یونیورسٹی دوسرے درجہ پر ہے جہاں طلبہ کی تعداد سوا دو ہزار ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں کی بھی کئی نجی یونیورسٹیاں ہیں۔

دارالحکومت جکارتا ملک کا سب سے بڑا تعلیمی، علمی، صحافتی، تمدنی اور صنعتی مرکز ہے۔ آبادی

---

(۱) کرنٹ بائیوگرافی۔

کے لحاظ سے قاہرہ کے بعد اسلامی دنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ کتابوں کی نشرو اشاعت کے بیشتر ادارے اور تمام بڑے اخبار اسی شہر سے نکلتے ہیں۔ یہاں کی جامع مسجد حرمین کی مساجد کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے اور آزادی کے بعد تعمیر کی گئی ہے۔ روزناموں میں کومپاس (kompas) کی اشاعت پونے تین لاکھ۔ سنار ہراپان (sinar hara pan) کی اشاعت ایک لاکھ اسی ہزار۔ پوس کوتا (Poskots) کی ڈیڑھ لاکھ۔ مرڈیکا (merdeks) کی ایک لاکھ بیس ہزار انگ کا تان بورسین جاتا (ang katan borsenjata) کی ایک لاکھ ہے۔ یہ آخری اخبار فوج کا ترجمان ہے اور مرڈیکا آزاد اخبار ہے۔ انڈونیشیا ٹائمز اور انڈونیشین آبزرور انگریزی زبان کے روزنامے ہیں اور ایک کی اشاعت ۳۵، ۳۵ ہزار ہے۔ بچوں کا رسالہ بوبو (bo bo) ڈیڑھ لاکھ چھپتا ہے۔ جوگجکارتا اسلامی یونیورسٹی سے ''الجامعہ'' کے نام سے ایک علمی اور دینی پرچہ شائع کیا جاتا ہے۔ تین تماس انڈونیشیا (tintamas) اسلامی کتب کا ایک ممتاز اشاعتی ادارہ ہے۔

تعمیر و ترقی

انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے اسلامی دنیا کا سب سے بڑا اور رقبے کے لحاظ سے سوڈان، الجزائر اور سعودی عرب کے بعد چوتھا بڑا ملک ہے۔ معدنی اور زرعی وسائل سے مالا مال ہے۔ خط استوا چونکہ انڈونیشیا کے وسط سے گزرتا ہے اس لیے یہاں بارش بہت ہوتی ہے۔ ہر طرف گھنے جنگل اور لہلہاتے کھیت نظر آتے ہیں۔ ملک کا دو تہائی حصہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا پڑا ہے۔ زراعت صرف بارہ فیصد رقبہ پر ہوتی ہے چاول، گنا، ناریل، گرم مصالحے، ربڑ اور کونین یہاں کی سب سے بڑی زرعی پیداوار ہیں۔ جنگلوں سے اعلیٰ درجہ کی عمارتی لکڑی لامحدود مقدار میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ معدنیات کی بھی کمی نہیں۔ پٹرول، بکسائیٹ، مینگنیز اور ٹین بڑی مقدار میں نکالا جاتا ہے۔ تانبے، نکل، سونے اور چاندی کے ذخیرے بھی پائے جاتے ہیں۔ ٹین ربڑ اور کونین دنیا میں سب سے زیادہ انڈونیشیا میں نکالا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ قدرتی وسائل کی کثرت کے لحاظ سے کوئی اسلامی ملک انڈونیشیا کا ہم پلہ نہیں۔ اگر ان وسائل سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے تو انڈونیشیا اسلامی دنیا کا سب سے ترقی یافتہ، طاقتور اور خوشحال ملک بن سکتا ہے۔ جزیرہ جاوا دنیا کے گنجان ترین علاقوں میں سے ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی انڈونیشیا زیادہ گنجان آباد ملک نہیں

ہے۔ دوسرے جزیروں میں کروڑوں ایکڑ زمین غیر مزروعہ حالت میں پڑی ہے اور اس پر سوائے جنگلوں کے کچھ نہیں۔ جزیرہ جاوا کی آبادی سات کروڑ ہے لیکن مغربی ایریان میں جو جاوا سے رقبہ میں تین گناہ بڑا ہے صرف سات لاکھ انسان بستے ہیں۔ حالانکہ وہاں کی زمین جاوا سے کم زرخیز نہیں حکومت نے جاوا کی آبادی کو کم آباد جزیروں میں منتقل کرنے کا ایک وسیع منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۹ء تک پچاس ہزار خاندان جاوا سے منتقل کیے گئے اور اب تیسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء تک پانچ لاکھ خاندان جو ۲۵ لاکھ افراد پر مشتمل ہیں سماترا، کالی منتان، سولادیس، جزائر مالوکو اور ایریان جایا منتقل کیے جائیں گے۔

ملایا اور اس کی گیارہ ریاستیں



جزیرہ نما ملایا میں جس کو مغربی ملائیشیا بھی کہا جاتا ہے مسلمانوں کا تناسب نصف سے کچھ زیادہ ہے۔ وہاں کی گیارہ ریاستوں میں سے صرف پانچ میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے۔ نقشہ میں دیے ہوئے ہندسے ہر ریاست میں ملایائی باشندوں کا جو سب کے سب مسلمان ہیں فیصد تناسب ظاہر کرتے ہیں۔ جس ریاست میں چینی باشندے بڑی تعداد میں آباد ہیں وہاں ان کا تناسب نیچے دیا گیا ہے۔

باب ۴

ملیشیا اور اس کی تیرہ ریاستیں

ملیشیا کی خوشحال مملکت انڈونیشیا کے شمال میں واقع ہے۔ اس کی دو ریاستیں جزیرہ کلیمنتان (بورنیو) میں واقع ہیں اور انڈونیشیا سے ان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ باقی گیارہ ریاستیں جزیرہ نمائے ملایا میں ہیں اور اُن کے اور انڈونیشیا کے درمیان سمندر حائل ہے۔ ملیشیا کا دارالحکومت کوالالمپور جزیرہ نمائے ملایا میں واقع ہے جہاں قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے ملکا اور جوہور کی مضبوط ریاستیں قائم کی تھیں۔ ملایا پر انگریزوں نے ۱۸۶۷ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان قبضہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے پچاس سالہ دور میں پرانی ریاستوں کو قائم رکھا اور صرف ملکا اور پٹانگ کے دو صوبوں کو اپنے براہ راست انتظام میں لیا۔ انگریزوں نے جزیرہ نما میں ٹین اور لوہے کی کانوں کو ترقی دی اور ربڑ کی کاشت کو فروغ دیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے چینی باشندوں کو مزدور اور کاشتکار کی حیثیت سے درآمد کیا۔ یہ درآمد اتنے وسیع پیمانے پر ہوئی کہ ملایا کی کئی ریاستوں میں چینی آبادکاروں کی تعداد ملایا کے اصل باشندوں سے زیادہ ہوگئی۔ فلسطین کے بعد ملایا دوسرا ملک ہے جہاں برطانوی پالیسی کے نتیجے میں غیر ملکی آبادکاروں نے ملک کے اصلی باشندوں کو اقلیت میں تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔ چین کے علاوہ اس دور میں ہندوستان سے بھی لوگ کثیر تعداد میں درآمد کیے گئے اب اس وقت صورت یہ ہے کہ جزیرہ نما ملایا جہاں کبھی صرف ملے نسل کے باشندے آباد تھے اب ایک ایسا ملک بن گیا ہے جس میں مختلف رنگ و نسل اور ملکوں کے باشندے خلط ملط ہو گئے ہیں۔

ملے جو ملک کے اصلی باشندے ہیں پوری آبادی میں نصف سے کچھ زیادہ ہیں۔ یہ سب مسلمان ہیں تقریباً ایک تہائی آبادی چینی باشندوں پر مشتمل ہے جو برطانوی دور میں ربڑ کی کاشت اور ٹین کی کانوں میں کام کرنے کے لیے آئے تھے، اور پھر یہیں آباد ہو گئے پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں کی تعداد بھی تقریباً ۱۰ فیصد ہے۔ ان میں پانچواں حصہ مسلمان ہیں باقی ہندو یا

سکھ۔ سنگاپور جب وفاق میں شامل تھا تو چینی باشندوں کا تناسب ۴۲ فیصد تھا۔ اور ملیے باشندوں کا ۴۰ فیصد لیکن سنگاپور کی وفاق سے علیحدگی کے بعد ملیے باشندوں کا تناسب نصف سے زیادہ ہو گیا ہے۔ ملیے چونکہ ملک کے اصل باشندے ہیں، اس لیے ان کو آئینی تحفظات حاصل ہیں اور ان کو مجلس قانون ساز اور ملازمتوں وغیرہ میں آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی دی جاتی ہے۔ چینی اور دوسرے غیر ملکی باشندوں میں سے صرف ان کو نمائندگی دی جاتی ہے جو مستقل طور پر ملیشیا میں آباد ہو گئے ہیں۔

آزادی کی تحریک

ملیشیا میں اگرچہ ہر قوم کے لوگ میل جول سے رہتے ہیں لیکن ملیے اور چینی باشندوں میں کافی کشمکش پائی جاتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران جب ملایا پر جاپان کا قبضہ ہو گیا تھا تو ملایا کے کمیونسٹوں نے گوریلا جنگ شروع کر دی تھی یہ کمیونسٹ سب چینی تھے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد جب برطانوی تسلط دوبارہ قائم ہو گیا تو ان کمیونسٹوں نے اس وقت بھی اپنی گوریلا گرمیاں جاری رکھیں۔ یہ بات بھی چینی اور ملیے باشندوں میں کشیدگی بڑھانے کا باعث ہوئی۔ جنگ کے بعد ملک میں کئی سیاسی پارٹیاں قائم ہوئیں۔ ان میں ایک جماعت ملیے باشندوں کی قومی تنظیم (U.M.N.O) ہے جو ملیے باشندوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ دوسری جماعت ملایا کے چینی باشندوں کی ایسوسی ایشن (M.C.A) ہے اور تیسری جماعت ملایا کے ہندوستانی باشندوں کی کانگریس (M.I.O) ہے۔ ملایا کا وفاق ۱۹۴۸ء میں قائم ہو گیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں اس کے لیے انتخابات ہوئے جس کے دوران مذکورہ بالا تینوں جماعتوں نے اتحاد قائم کر لیا تھا اس اتحاد نے ملیے رہنما تنکو عبدالرحمن کی قیادت میں سوائے ایک کے تمام نشستوں پر قبضہ کر لیا، انتخاب میں کامیابی کے بعد آزادی کے مطالبہ نے زور پکڑ لیا، متحدہ محاذ کا یہ مطالبہ جلد ہی منظور ہو گیا، ۲۱۔ اگست ۱۹۵۷ء کو جب ملایا کو آزادی ملی تو تنکو عبدالرحمن پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور برطانیہ نے ملایا کا بیرونی حملوں سے دفاع کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔

وفاق کی تشکیل

۳۱۔ اگست ۱۹۵۷ء کو جب ملایا نے انگریزوں سے آزادی حاصل کی تو اس وقت ملایا کی

حیثیت ایک ایسے وفاق کی تھی جو گیارہ [1] ریاستوں پر مشتمل تھا۔ چھ سال بعد ۱۹۶۳ء میں وفاق ملایا میں سنگاپور، سارا واک اور صباح کی تین ریاستیں اور شامل ہو گئیں اور اس نئے اور عظیم تر وفاق کا نام ملیشیا رکھا گیا۔ دو سال بعد ۹۔ اگست ۱۹۶۵ء کو سنگاپور کی ریاست جس میں چینی باشندوں کا تناسب اسی فیصد سے زیادہ ہے وفاق سے علیحدہ ہو گئی کیونکہ سنگاپور کے چینیوں کو ملیشیا کی وفاقی حکومت پر ملیے باشندوں کا غلبہ گوارا نہیں تھا۔

وفاق ملیشیا کی تیرہ ریاستوں میں سے ہر ریاست کا اپنا جھنڈا ہے۔ اپنا آئین ہے اور اپنی مجلس قانون ساز ہے۔ وفاق کی پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ ایک ایوان نمائندگان جسے دیوان رعیت (raayat) کہا جاتا ہے اور دوسرا سنات جسے دیوان نگارا (negara) کہا جاتا ہے۔ وفاق کا سربراہ بادشاہ یا ملیے زبان میں "یانگ دی پرتوان اگونگ (yang di-pertuan agona) کہلاتا ہے جسے ریاستوں کے حکمرانوں کی کونسل اپنے ارکان میں سے باری باری پانچ سال کے لیے منتخب کرتی ہے۔ یہ سربراہ وزیر اعظم کو مقرر کرتا ہے اور وزیر اعظم کی مرضی کے خلاف پارلیمنٹ کو توڑ بھی سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ کام عام طور پر وزیر اعظم اور پارلیمنٹ کے مشورے سے کرتا ہے۔ حقیقی اقتدار وزیر اعظم کو حاصل ہے جو عوام کا نمائندہ ہوتا ہے۔

ملیشیا کے پہلے وزیر اعظم الحاج تنکو عبدالرحمن (پیدائش ۱۹۰۳ء) سلطان کیدہ کے صاحبزادے تھے۔ وہ بیرسٹر تھے اور بڑے باصلاحیت انسان تھے۔ ملایا کے باشندوں نے ان ہی کی قیادت میں آزادی حاصل کی۔ وہ ستمبر ۱۹۷۰ء تک وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہے۔ ملایا میں کمیونسٹ چھاپہ ماروں کی سرگرمیوں پر قابو پا کر ملک میں امن و امان قائم کرنا اور ملیشیا کے وسیع تر وفاق کی تشکیل ان کے اہم کارنامے ہیں۔ ان کے دور میں ملیشیا کو سیاسی استحکام حاصل

---

(1) ان ریاستوں کے نام یہ ہیں: (۱) جوہور (۲) کیڈہ (۳) کیلانتان (۴) ملکا (۵) نگری سمبلان (۶) پہانگ (۷) پنانگ (۸) پیراک (۹) پرلس (۱۰) سلنگور (۱۱) ترنگانو۔ ان میں ملکا اور پنانگ گورنروں کے تحت ہیں اور باقی نو ریاستوں کے حکمران موروثی حیثیت رکھتے ہیں۔ پرلس کا حکمران راجہ اور نگری سمبلان کا حکمران یانگ دی پرتوان بیسار (Yang di-Pertuan Besar) کہلاتا ہے۔ باقی حکمران سلطان کہلاتے ہیں۔ صباح اور سارا واک کی ریاستیں بھی جو بعد میں شامل ہوئیں گورنروں کے تحت ہیں۔ صباح پر ۱۸۸۲ء سے ۱۹۶۳ء تک برطانیہ قابض رہا تھا۔ سارا واک پہلے برونئی کی ریاست کا ایک حصہ تھا لیکن ۱۸۴۰ء تک حکمران رہا۔ اس کے بعد صباح اور سارا واک دونوں کو آزادی مل گئی اور ان ریاستوں نے وفاق ملیشیا میں شرکت کر لی۔

ہوا اور ملک میں وسیع پیمانے پر تعمیر و ترقی کا کام شروع ہوا۔

ملایا کی حکومت نے کمیونسٹ چھاپہ ماروں کی سرگرمیوں پر تو جلد قابو پالیا لیکن ۱۹۶۳ء میں ملیشیا کا وفاق قائم ہونے کے بعد انڈونیشیا کے صدر سوکارنو کی "ملیشیا کو کچل دو" کی مہم کی وجہ سے بڑی سنگین صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ صدر سوکارنو ساراواک اور صباح کو ملیشیا میں شامل کرنے کے خلاف تھے ان کا کہنا تھا کہ یہ علاقے وہاں کے باشندوں کی مرضی کے خلاف ملیشیا میں شامل کیے گئے ہیں اور یہ کہ ملیشیا کا نیا وفاق مشرق بعید میں برطانوی سامراج کا ایک نیا گڑھ ثابت ہوگا، لیکن صدر سوکارنو کو اپنی اس مہم میں کامیابی نہیں ہوئی، انڈونیشیا میں رائے عامہ ان کے خلاف ہوگئی اور ملیشیا کو کچل دو مہم کے فوجی کمانڈر جنرل سوہارتو نے خود صدر سوکارنو کو اقتدار سے بیدخل کر دیا، اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں انڈونیشیا اور ملیشیا میں ایک معاہدہ ہو گیا اور ملیشیا کو کچل دو کی مہم ختم کر دی گئی۔ آج کل انڈونیشیا اور ملیشیا میں قریبی دوستانہ تعلقات ہیں۔

صباح کے علاقے کو ملیشیا میں شامل کرنے پر ایک دوسرے قریبی ملک فلپائن کو بھی اعتراض تھا۔ فلپائن کا کہنا یہ تھا کہ کسی زمانے میں صباح کا علاقہ فلپائن کا ایک حصہ تھا۔ اور اب جبکہ وہاں سے برطانوی اقتدار ختم ہو گیا ہے، صباح کو فلپائن سے ملا دینا چاہیے انڈونیشیا اور فلپائن کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے ملیشیا کو اپنی فوجی قوت کی طرف توجہ دینی پڑی اور ملیشیا نے برطانیہ اور آسٹریلیا کی مدد سے بہت جلد بری، بحری اور فضائی فوجوں کو منظم کر لیا۔ اس وقت ملیشیا اپنے وسائل کی مناسبت سے خاصا مضبوط ملک بن گیا ہے۔

سیاسی استحکام

ملیشیا کا ایک اہم پہلو وہاں کا سیاسی استحکام ہے جس کی وجہ سے ملیشیا کو خوشحالی نصیب ہے۔ یہ استحکام اس وجہ سے اور قابل تعریف ہے کہ یہ مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کے باہمی تعاون سے حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ملیے اور چینی باشندوں کا یہ اتحاد خطرے میں پڑ گیا تھا۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ ملایا میں چینی باشندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ملیے باشندوں کو یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ وہ کہیں اپنے ہی وطن میں اقلیت نہ بن جائیں۔ شہروں میں چینیوں کی اکثریت ہے۔ اور غیر سیاسی زندگی کے ہر شعبے میں خصوصاً تجارت، طب، انجینئرنگ اور قانون کے

شعبوں میں ان کو اجارہ داری حاصل ہے۔ یہ بات ملیے باشندوں کے لیے ناگوار ہے۔ دوسری طرف چینی باشندوں کو حکومت اور فوج میں ملیے باشندوں کی اجارہ داری ناپسند ہے۔ اس کی وجہ سے دونوں قوموں میں مستقل کشیدگی رہتی ہے یہ کشیدگی ۱۹۶۹ء میں اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب تنکو عبدالرحمن کی اتحاد پارٹی (alliance party) نے انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور ۱۳/ مئی کو کوالالمپور میں چینی اور ملیے باشندوں کے درمیان فسادات پھوٹ نکلے جن میں دو سو آدمی ہلاک اور پانچ ہزار بے گھر ہو گئے۔ ان فسادات کی وجہ سے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور آئین معطل کر دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۷۰ء میں تنکو عبدالرحمن وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے۔

تنکو عبدالرحمن کے بعد تُن عبدالرزاق (۱۹۲۲ء تا ۱۹۷۶ء) وزیر اعظم منتخب ہو گئے ان کے دور میں ۱۹/ فروری ۱۹۷۱ء کو ہنگامی حالت کا خاتمہ ہوا اور پارلیمانی زندگی بائیس ماہ معطل رہنے کے بعد بحال ہوئی۔ ۱۹۵۵ء سے اب تک تنکو عبدالرحمن کی اتحاد پارٹی جو ملیے، چینی اور ہندوستانی تین جماعتوں کا مشترکہ محاذ تھی ہر انتخاب میں کامیاب ہوتی چلی آئی تھی۔ اب تنکو عبدالرزاق نے قومی محاذ کے نام سے ایک وسیع تر اتحاد کی تشکیل کی جو دس جماعتوں پر مشتمل ہے۔ وزیر اعظم عبدالرزاق نے تجارتی اور صنعتی میدانوں میں ملیے باشندوں کو شرکت کے مواقع فراہم کر کے اور چینیوں کو مزید سیاسی حقوق دے کر دونوں قوموں کے درمیان کشیدگی کم کی۔ اگست ۱۹۷۴ء کے انتخابات میں قومی محاذ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ محاذ نے وفاقی اسمبلی کی ۱۵۴ نشستوں میں سے ۱۳۵ نشستوں پر قبضہ کرنے کے علاوہ تیرہ ریاستوں کی اسمبلیوں میں بھی اکثریت حاصل کر لی۔

وزیر اعظم عبدالرزاق کے پانچ سالہ دور میں خارجی حکمت عملی میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔ مئی ۱۹۷۴ء میں اشتراکی چین سے پہلی مرتبہ سفارتی تعلقات قائم ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں جنوبی ویٹ نام اور کمبوڈیا کی حکومتوں کو جن ملکوں نے سب سے پہلے تسلیم کیا ان میں ایک ملیشیا بھی تھا۔ صباح کے مسئلہ پر فلپائن سے بھی مفاہمت ہو گئی جس سے ۱۹۶۸ء میں سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ اب فلپائن کی حکومت صباح پر اپنے دعوے سے دستبردار ہو گئی ہے۔

۱۴۔ جنوری ۱۹۷۶ء کو تن عبدالرزاق کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ نائب وزیر اعظم دُاتک حسین عون (پیدائش فروری ۱۹۲۲ء) وزیر اعظم ہو گئے۔ ان کے زمانے میں ۱۹۷۹ء کے

انتخابات میں قومی محاذ نے وفاقی پارلیمنٹ کی ۱۵۴ نشستوں میں سے ۱۳۱ نشستوں پر قبضہ کر کے ایک بار پھر کامیابی حاصل کی۔ مخالف جماعتیں صرف ۲۳ نشستیں حاصل کر سکیں۔ ان میں ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی کے سولہ اور اسلامی پارٹی کے پانچ امیدوار کامیاب ہوئے۔ سارا واک اور صباح سے دو آزاد امیدوار کامیاب ہوئے وفاقی پارلیمنٹ میں صباح کی سولہ اور سارا واک کی ۲۴ نشستیں ہیں۔ کوالالمپور کو جسے یکم فروری ۱۹۷۴ء کو وفاقی علاقہ بنا دیا گیا تھا۔ پانچ نشستیں دی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر قومی محاذ نے ۵۶ فیصد ووٹ حاصل کیے جبکہ ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی نے اکیس فیصد اور اسلامی پارٹی نے سترہ فیصد ووٹ حاصل کیے۔

اسلام کا مستقبل

ملیشیا کی آبادی میں چونکہ تقریباً نصف آبادی غیر مسلموں پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس مملکت کو خالص اسلامی مملکت بنانے کا کام خاصا مشکل اور پیچیدہ ہے۔ غیر مسلم آبادی کی اس کثرت کی وجہ سے ہم ملیشیا کو مشرق بعید کا لبنان یا نائیجیریا کہہ سکتے ہیں اس مشکل کے باوجود اسلامی نقطۂ نظر سے ملیشیا کا ایک امید افزا پہلو یہ ہے کہ صباح اور سارا واک کے غیر ملیے خصوصاً غیر چینی باشندوں میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے اور ملیے باشندوں میں چینیوں کے مقابلے میں شرح پیدائش بھی زیادہ ہے۔ دینی لحاظ سے ملیے باشندے راسخ العقیدہ اور باحمیت مسلمان ہیں۔ (۱)

ملیشیا میں اس وقت کوئی ایسی منظم اور بااثر تحریک موجود نہیں ہے جو اسلامی خطوط پر رہنمائی

(۱) مسلمانوں کی ملک میں موثر اکثریت نہ ہونے کے باوجود ملیشیا کے دستور میں اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا ہے۔ ملایا سے تقریباً آٹھ ہزار مسلمان ہر سال حج کو جاتے ہیں جو مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کو دیکھتے ہوئے بہت بڑی تعداد ہے۔ اس مقصد کے لیے ملیشیا میں حج اسکیم کے نام سے ایک بڑا مفید نظام قائم ہے اس سے پہلے دیہات میں رہنے والے مسلمان حج کے لیے زندگی بھر کی پونجی یا زمین کے اندر دبا دیتے تھے یا گھر میں جمع کرتے رہتے تھے اس سرمایہ کو کام میں لانے کے لیے حکومت نے حج اسکیم جاری کی اس اسکیم کے تحت جو شخص حج کے لیے جانا چاہے وہ اپنا سرمایہ ایک ادارہ کے پاس جمع کرا دیتا ہے یہ ادارہ اس سرمایہ کو کاروباری کمپنیوں میں لگا دیتا ہے اس پر جو منافع حاصل ہوتا ہے وہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ ملایا کے مسلمان چونکہ فریضہ حج کی ادائیگی کا بے پناہ شوق رکھتے ہیں اس لیے وہ اپنا تمام جمع شدہ سرمایہ حج اسکیم میں لگا دیتے ہیں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اکثر افراد اپنے منافع کی پونجی سے حج کر آتے ہیں اور ان کا اصل سرمایہ کاروبار ہی میں لگا رہتا ہے۔ سرمایہ کاری نفع یا نقصان کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور اس اسکیم میں سود کو کوئی دخل نہیں اس نظام سے سرمایہ گردش میں رہتا ہے اور ہر سال ہزاروں ملائی اپنا دینی فرض بھی پورا کر لیتے ہیں۔ (پاکستان میں ملیشیا کے ہائی کمشنر محمد صوفی کا انٹرویو ملاحظہ کیجیے جو اردو ڈائجسٹ جولائی ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا)

کر سکے۔ اسلامی نظام کی علمبردار صرف ایک جماعت ہے جس کا نام پان ملیشین اسلامک پارٹی ہے۔ جس کو ایک ملیشی رہنما برہان الدین نے ۱۹۵۱ء میں قائم کیا تھا۔ ۱۹۶۴ء کے انتخابات میں اس جماعت نے نو اور ۱۹۶۹ء کے انتخابات میں بارہ نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس جماعت کا سب سے مضبوط گڑھ ریاست کیلانتان ہے جسے مغربی اخبارات ''مخصِ مکہ'' کہتے ہیں اور جہاں کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۹۹ فیصد ہے۔ اس ریاست میں ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۴ء تک اسلامی پارٹی روبہ زوال ہوگئی۔ اس کے علاوہ قومی محاذ میں شامل ہو جانے کی وجہ سے جماعت میں اختلاف بھی پڑ گیا۔ اگرچہ اسلامی پارٹی نومبر ۱۹۷۷ء میں محاذ سے الگ ہوگئی لیکن اختلافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۷۹ء کے انتخابات میں وفاقی پارلیمنٹ میں اس کے صرف پانچ امیدوار کامیاب ہو سکے اور ریاست کیلانتان میں جو پارٹی کا گڑھ تھا صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے۔

ملیشیا میں مسلمانوں کی ایک اور بڑی تنظیم ''تحریک دعوت'' ہے۔ ۱۹۷۰ء تک یہ محض تبلیغی ادارہ تھا جو غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے اور نومسلموں کو اسلامی تعلیم و تربیت دینے کا کام کرتا تھا۔ لیکن اب یہ جماعت مسلمانوں کے تمام معاملات میں بھرپور دلچسپی لے رہی ہے اور اس کے تحت کئی ذیلی تنظیمیں زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سب سے اہم ''مسلمان نوجوانوں کی تحریک'' (مسلم یوتھ موومنٹ آف ملیشیا) ہے، جس کے بانی ایک نوجوان انور ابراہیم ہیں۔ یہ تنظیم ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی اور اب اس کی سارے ملک میں شاخیں قائم ہیں۔ ۱۹۷۹ء کے وسط تک اس تحریک کے ارکان کی تعداد ۳۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔[1] انور ابراہیم بڑے سرگرم نوجوان ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں ان کو حکومت نے دو سال کے لیے نظر بند کر دیا تھا۔ وہ موجودہ حکومت کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہیں اور اسلامی اقتصادی نظام قائم کرنے کے حامی ہیں۔ وہ بے سودی قرض کے ادارے قائم کر رہے ہیں۔ انور ابراہیم کو بعض لوگ مسلم سوشلسٹ کہتے ہیں، لیکن انہوں نے انگریزی جریدہ ''فار ایسٹرن اکونومک ریویو'' کے نمائندے کو بتایا کہ ''ہم ایک ترقی پسند گروہ ہیں اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے علمبردار ہیں

---

(۱) روزنامہ ''جسارت'' کراچی ۱۳/۱ اگست ۱۹۷۹ء

کیونکہ معاشرہ کی برائیوں، رشوت ستانی، بدعنوانی اور استحصال کو صرف اسلام دور کرسکتا ہے۔ [1]

تحریک دعوت اور مسلمان نوجوانوں کی تحریک کا پان ملیے اسلامک پارٹی سے براہ راست تعلق نہیں ہے لیکن اسلامک پارٹی کو ان کی حمایت حاصل ہے۔ اخبار ''وطن'' ملیشیا کی تحریک اسلامی کا ترجمان ہے۔ پہلے یہ ملیے اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اب صرف ملیے زبان میں شائع ہوتا ہے۔

تعلیم اور صحافت

ملیشیا کی سرکاری اور قومی زبان ''ملیے'' ہے۔ یہ زبان شروع سے عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن اب اس کے لیے رومن رسم الخط عام ہوتا جارہا ہے۔ انڈونیشی بھی ملیے زبان کی ایک شاخ ہے، لیکن ملیشیا میں عربی رسم الخط اور انڈونیشیا میں رومن رسم الخط رائج ہے۔ ملیے زبان میں کچھ عرصہ پہلے تک کتابوں کی بہت کمی تھی۔ لیکن ۱۹۵۷ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد جب ملیے کو سرکاری زبان بنادیا گیا تو ملیے زبان میں بڑی تیزی سے غیرملکی زبانوں سے ترجمے کیے گئے اور خود ملیے زبان میں بھی کتابیں تالیف کی گئیں اور اب ملیے زبان میں ہر ہر مرحلہ کی درسی کتابیں اور عام کتابیں بھی بڑی حد تک فراہم ہوگئی ہیں۔

۱۹۷۰ء میں دارالحکومت کوالالمپور، پنانگ اور سلانگور میں ایک ایک یونیورسٹی تھی۔ ان کے علاوہ کوالالمپور میں ایک ٹیکنیکل یونیورسٹی بھی تھی۔ طلبہ کی تعداد ۲۳ لاکھ تھی۔ ملیشیا میں ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہے۔

ملک کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار ''نیوا سٹریٹ ٹائمز'' ہے جو انگریزی میں نکلتا ہے۔ روزانہ اشاعت ڈیڑھ لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ ''ملایا میل'' اور ''اسٹار'' بھی انگریزی روزنامے ہیں جن میں سے ہر ایک کی اشاعت پچاس پچاس ہزار ہے۔ چینی زبان میں روزنامہ نیانگ سیانگ (nan yang siyang) نکلتا ہے جس کی اشاعت ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ ملیے زبان کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار اوتوسان ملیشیا (utuaan malaysia) ہے جس کی اشاعت ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ہندوستانی باشندوں کی اکثریت چونکہ تامل ناڈ سے

---

(۱) روزنامہ ''جسارت'' کراچی/۱۶ فروری ۱۹۷۹ء

تعلق رکھتی ہے اس لیے تامل زبان میں بھی تامل نسان کے نام سے ایک روزنامہ نکلتا ہے جس کی اشاعت چالیس ہزار کے قریب ہے۔ یہ تمام اخبارات کوالالمپور سے نکلتے ہیں۔

تعمیر و ترقی

ملیشیا، اسلامی دنیا کے کثیرالوسائل اور خوشحال ملکوں میں سے ہے۔ بارش کی کثرت کی وجہ سے چپہ چپہ شاداب ہے۔ ملک کا بہت بڑا رقبہ جنگلوں سے پٹا پڑا ہے جن میں قیمتی عمارتی لکڑی پائی جاتی ہے۔ پام، ناریل، اناس، چاول، ربڑ اور عمارتی لکڑی کی کثرت ہے۔ معدنیات میں لوہا، ٹن اور بکسائیٹ کے وسیع ذخیرے ہیں۔ ۱۹۷۰ء تک اسلامی دنیا میں خام لوہا سب سے زیادہ ملیشیا میں نکالا جاتا تھا، لیکن اب پیداوار کم ہوگئی ہے، لیکن پٹرول کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ٹین دنیا کا ۳۵ فیصد صرف ملیشیا میں پیدا ہوتا ہے۔ اور ربڑ دنیا میں سب سے زیادہ اس ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ صباح میں لوہے کے وسیع ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی تک لوہا نکالا نہیں گیا۔ ملیشیا ان ترقی پذیر ملکوں سے ہے جنھوں نے کئی پنج سالہ منصوبے کامیابی سے مکمل کیے ہیں۔ کیمیاوی کھاد، ربڑ کا سامان بنانے اور شکر کے کارخانے ہیں۔ فولاد سازی کا کارخانہ بھی ہے۔ ملیشیا کا معیار زندگی جنوبی ایشیا میں سب سے بلند ہے۔ سیاحت بھی آدمی کا بڑا ذریعہ ہے۔ ۱۹۷۶ء میں پچیس لاکھ سیاح ملیشیا آئے تھے۔

ملیشیا کے سربراہ

(۱) ٹنکو عبدالرحمن پُترا ابن مرحوم سید حسن جمال اللیل (راجہ پرلس) ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۵ء

(۲) ٹنکو اسماعیل نصیرالدین شاہ (سلطان ٹرنگانو) ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۰ء

(۳) عبدالحلیم معظم شاہ (سلطان کیڈہ) ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء

(۴) یحییٰ پترا۔ (سلطان کیلانٹان) ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء)

باب ۵

برونئی: جنوب مشرق ایشیا کا کویت

برونئی انڈونیشی جزیرہ کالی منتان کے شمال مشرق میں میلیشیا کی ریاستوں صباح اور سارا واک کے درمیان واقع ہے۔ برونئی سولہویں صدی میں ایک طاقتور سلطنت تھی۔ بورنیو کے جزیرے کے علاوہ جزائر سولو اور فلپائن کے بعض دوسرے جزیروں پر بھی سلطان برونئی کا اقتدار تھا۔ سولہویں صدی کے آخر میں اس سلطنت کا زوال شروع ہوا اور انیسویں صدی میں کئی حصوں پر برطانیہ اور سارا واک کے راجہ کا قبضہ ہوگیا اور آخر میں برونئی کی مملکت موجودہ مختصر سے علاقے میں محدود ہوگئی۔ ۱۸۴۷ء میں سلطان برونئی نے تجارتی ترقی اور بحری قزاقی کی روک تھام کے لیے برطانیہ سے معاہدہ کیا اور ۱۸۸۸ء میں برطانیہ نے ریاست کو اپنے زیرِ انتظام لے کر برونئی کو برطانوی مملکت محروسہ قرار دے دیا۔ اس وقت سے برطانیہ ریاست کے دفاع اور امور خارجہ کا ذمہ دار ہے۔

۱۹۵۹ء میں برونئی کا نیا آئین بنا جس کے تحت ایک مجلس وزراء قائم کی گئی جس کا صدر سلطان برونئی ہے۔ برونئی دراصل میلے نسل کے مسلمان باشندوں کی ریاست ہے، اس لیے جب تمام میلے یا ملائی علاقوں کا میلیشیا کے نام سے ایک وفاق بنانے کی تحریک شروع ہوئی تو برونئی کے باشندوں نے برطانیہ سے آزادی حاصل کر کے وفاق میلیشیا میں شامل ہونا چاہا۔ اس تحریک کے قائد برونئی کی پیپلز پارٹی کے رہنما۔ اے ایم۔ ازہری تھے۔ لیکن سلطان برونئی برطانیہ کے زیر سایہ اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے تھے اس لیے یہ تحریک کامیاب نہ ہوسکی اور دسمبر ۱۹۶۲ء میں جب ازہری کی قیادت میں میلے باشندوں نے بغاوت کردی تو اس کو سختی سے کچل دیا گیا اور ازہری کو ملایا میں پناہ حاصل کرنی پڑی۔ اور ان کی پارٹی خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ ۱۶۔ ستمبر ۱۹۶۳ء کو جب میلیشیا کا وفاق قائم ہوا تو سلطان نے اس میں شرکت سے انکار کردیا۔ ۱۹۶۷ء میں نمائندہ حکومت کے لیے برطانوی دباؤ کے تحت سلطانِ وقت دست بردار ہو گئے اور ان کی جگہ

سلطان کے بیٹے سرمودا (Muda) حسن البلقیاہ (Bolkiah) معز الدین والدولۃ سلطان ہوئے۔ اس وقت وہی حکمران ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں نئے سلطان نے مجلس قانون ساز کو توڑ دیا اور اس کی جگہ اسمبلی کے ارکان کو خود نامزد کیا۔

نومبر ۱۹۷۱ء میں برطانیہ اور برونئی میں نیا معاہدہ ہوا جس کے تحت برونئی کو مکمل طور پر اندرونی خود مختاری مل گئی۔ لیکن ۱۹۶۲ء سے دستور کے کئی حصے ابھی تک معطل ہیں۔ برونئی کی دفاعی کونسل میں برطانیہ کو نمائندگی حاصل ہے اور برطانوی فوج کی ایک گورکھا بٹالین برونئی میں متعین ہے۔ سلطان برونئی کو ایک مدت تک اس بات کا ڈر رہا کہ ملیشیا کی حکومت ان چھاپہ ماروں کی مدد سے جو وفاق ملیشیا کے حامی ہیں سلطان کی حکومت کا تختہ نہ پلٹ دیں۔ اس کے علاوہ فلپائن بھی برونئی پر اپنے حق کا دعویدار تھا۔ یہ تمام خطرے برونئی کی مکمل آزادی کی راہ میں رکاوٹ رہے ہیں اور ان کی وجہ سے سلطان نے برطانوی فوجی امداد کا سہارا لیا ہے۔ اور برونئی میں برطانوی فوج کی ایک گورکھا رجمنٹ مستقل طور پر متعین ہے۔ لیکن برونئی کی مکمل آزادی کی راہ ہموار ہوگئی ہے ۳۰۔ جون ۱۹۷۸ء کو لندن میں مذاکرات کے بعد یہ اعلان کیا گیا ہے کہ برونئی کو ۱۹۸۳ء میں مکمل آزادی مل جائے گی۔ انڈونیشیا اور ملیشیا نے بھی برونئی کی آزادی اور سلامتی کے تحفظ کا یقین دلایا ہے۔ انڈونیشیا اور ملیشیا نے بھی برونئی کی آزادی اور سلامتی کے تحفظ کا یقین دلایا ہے۔ ان دونوں پڑوسی ملکوں کی طرف سے آزادی اور سلامتی کے تحفظ کا یقین دلایا ہے۔ ان دونوں پڑوسی ملکوں کی طرف سے آزادی کے تحفظ کی یقین دہانی کرانے کے علاوہ فلپائن بھی برونئی پر اپنے دعوے سے دست بردار ہوگیا ہے۔ ان تمام خطروں کے دور ہو جانے کے بعد اب قوی امید ہے کہ برونئی ۱۹۸۳ء تک آزاد اسلامی ممالک کی صفوں میں شامل ہو جائے گا۔

برونئی کا رقبہ مختصر ہے لیکن زمین زرخیز ہے۔ بارش کی کثرت کی وجہ سے پچھتر (۷۵) فیصد رقبہ جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے اور صرف تین فیصد رقبہ زیر کاشت ہے جس پر چاول کاشت کیا جاتا ہے۔ ربڑ یہاں کی قیمتی پیداوار ہے جو برآمد کی جاتی ہے۔ لیکن برونئی کی خوشحالی کی بنیاد پٹرول اور قدرتی گیس ہے۔ پٹرول اگرچہ ۱۹۲۰ء میں دریافت ہوگیا تھا لیکن اس کی پیداوار میں گزشتہ چند سالوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور اس وقت برونئی جنوبی ایشیا میں انڈونیشیا کے بعد پٹرول پیدا کرنے والا دوسرا بڑا ملک بن گیا ہے۔

۱۹۷۳ء میں ایک کروڑ دس لاکھ ٹن پٹرول نکلا تھا۔ ملک میں پٹرول کے کنوؤں کی تعداد ساڑھے پانچ سو ہے۔ ۱۹۷۶ء میں پٹرول اور قدرتی گیس سے نوے کروڑ ڈالر[1] کی آمدنی ہوئی تھی۔ ۱۹۷۷ء میں یہ آمدنی دو ارب دس کروڑ ہوگئی اور ۱۹۷۸ء میں دو ارب ۳۸ کروڑ ڈالر آمدنی کی توقع تھی۔ اس مختصر ملک کے لیے جس کا رقبہ صرف سوا دو ہزار مربع میل (پونے چھ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی دو لاکھ ہے۔ یہ آمدنی ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ دولت کی اس ریل پیل نے برونئی کو فی کس آمدنی کے لحاظ سے ایشیا میں کویت اور متحدہ عرب امارات کے بعد سب سے دولت مند ملک بنا دیا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں برونئی کا محفوظ سرمایہ چھ ارب ڈالر تھا جو پورے میلیشیا کے محفوظ سرمایہ کے برابر تھا۔ برونئی کو بجا طور پر مشرق بعید کا کویت کہا جا سکتا ہے۔ تیل سے ہونے والی یہ آمدنی تعمیر و ترقی کے کاموں پر صرف کی جا رہی ہے۔ برونئی دنیا کی پہلی مملکت ہے جہاں قدرتی گیس کو مائع میں تبدیل کرنے کا کارنامہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ کارخانہ لوموت (lumut) کے مقام پر قائم کیا گیا ہے اور دنیا میں سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ دارالحکومت سیری بگاون کو جس کا پرانا نام برونئی ٹاؤن تھا اور جس کی آبادی چالیس ہزار ہے ایک جدید شہر میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہاں کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ دنیا کے خوبصورت ترین ہوائی اڈوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شہر میں ایک شفا خانہ تعمیر کیا جا رہا ہے جو جنوب مشرقی ایشیا کے جدید ترین شفا خانوں میں سے ہوگا۔ دو پرتعیش ہوٹل تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ تاکہ سیاحت کے کاروبار کو وسعت دی جائے۔ موارا (muara) مقام پر جدید ترین بندرگاہ تعمیر کی گئی ہے۔ سڑکیں بھی تعمیر کی جا رہی ہیں۔ ساراواک کی سرحد تک ایک ساحلی شاہراہ کا منصوبہ زیر غور ہے۔ ماہی گیری اور مویشی بانی کو ترقی دی جا رہی ہے۔ اب تک برونئی کے لیے آسٹریلیا سے مویشی درآمد کیے جاتے تھے۔ لیکن اب جاپان کی مدد سے ملک میں افزائش نسل کا ایک منصوبہ شروع کیا گیا ہے جس کی تکمیل کے بعد ۱۹۸۴ء تک برونئی مویشیوں کے معاملے میں خود کفیل ہو جائے گا۔ زراعت میں توسیع کے منصوبے بھی زیر غور ہیں۔

تیل کی آمدنی ملک میں کس طرح خوشحالی لائی ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں ابتدائی مدرسوں میں ۳۲ ہزار اور ثانوی مدرسوں میں سولہ ہزار طلبہ زیر تعلیم

---

[1] ایک امریکی ڈالر برونئی کے تقریباً دو اعشاریہ تین ڈالر کے برابر ہے۔

تھے۔ ہر ایک ہزار کی آبادی میں ایک ڈاکٹر ہے اور شفا خانوں میں ہر ایک ہزار آدمیوں کے لیے تین پلنگ ہیں۔ ملک میں تیس ہزار نجی کاریں گیارہ ہزار ٹی۔وی سیٹ اور تیس ہزار ریڈیو ہیں۔

تیل کی کمپنی میں حکومت اور رائل ڈچ سٹیل کمپنی دونوں شریک ہیں۔ اور تیل اور گیس کی کمپنیوں میں مقامی حصہ کو بھی بڑھایا جارہا ہے اور مقامی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ شریک کرنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے۔ برونئی کی حکومت دولت کا ایک بہت بڑا حصہ جدید ترین اسلحہ کی خریداری پر بھی صرف کررہی ہے تاکہ وہ آزادی کے بعد اپنے دفاع کے لیے برطانیہ سے امداد کا محتاج نہ رہے۔

برونئی کی تقریباً تین چوتھائی آبادی ملیلے نسل کے مسلمانوں پر مشتمل ہے چینیوں کی تعداد ۴۶ ہزار ہے اور بائیس ہزار چھوٹے چھوٹے مقامی قبائل باشندے ہیں جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ آبادی کی اکثریت نسلاً ملیلے اور مسلمان ہونے کی وجہ سے برونئی کا صحیح مقام ملیشیا میں شرکت ہونا چاہیے تھا اور اگر ملک میں بادشاہت نہ ہوتی تو شاید یہی ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان نسل میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ اور وہ ملک میں جمہوریت کا فروغ چاہتے ہیں۔

(ب) برصغیر پاکستان و ہند

۱۔ پاکستان:	۳ لاکھ دس ہزار مربع میل ۷ لاکھ ۹۶ ہزار مربع کلومیٹر	۷ کروڑ ۵۴ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۲۔ بنگلہ دیش:	۵۵ ہزار مربع میل ایک لاکھ ۴۴ ہزار مربع کلومیٹر	۸ کروڑ ۷۴ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۳۔ کشمیر:	۸۴ ہزار مربع میل ۲ لاکھ ۲۲ ہزار مربع کلومیٹر	۷۱۔۷۴ لاکھ (۱۹۷۱ء)
(الف) مقبوضہ کشمیر:	۵۳ ہزار مربع میل ایک لاکھ ۳۸ ہزار مربع کلومیٹر	۴۶ لاکھ (۱۹۷۱ء)
(ب) آزاد کشمیر:	۳۱ ہزار مربع میل ۸۴ ہزار مربع کلومیٹر	۲۵۔۲۸ لاکھ (۱۹۷۱ء)

باب ۶

برطانوی ہند میں آزادی کی تحریکیں

برصغیر میں برطانیہ کی پالیسی

۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں دہلی پر قبضہ کرنے اور وہاں کے آخری تیموری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کردینے کے بعد انگریزوں نے پورے برصغیر پر نوے سال حکومت کی۔ بنگلہ دیش پر ان کی حکومت ایک سو نوے سال اور پاکستان پر تقریباً ایک سو سال رہی۔ انگریزوں نے انتظامی لحاظ سے برصغیر کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ ایک وہ علاقے تھے جن کا انتظام براہ راست انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور یہ صوبے کہلاتے تھے، دوسرے وہ علاقے تھے جن کا اندرونی انتظام مقامی نوابوں اور راجاؤں کے سپرد تھا لیکن بیرونی معاملات انگریزوں کے ہاتھ میں تھے۔ یہ علاقے ریاستیں کہلاتی تھیں۔ بنگال، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ باقی صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اسی طرح کشمیر، کپورتھلہ، بہاولپور، خیر پور اور قلات کی ریاستوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن ان میں کشمیر اور کپور تھلہ کے راجہ ہندو تھے۔ باقی ریاستوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ لیکن ان میں سے بعض ریاستوں کے حکمران مسلمان نواب تھے۔ حیدرآباد (دکن)، جوناگڑھ، بھوپال، ٹونک اور رامپور وہ ریاستیں تھیں جن کی آبادی زیادہ تر ہندو تھی لیکن حکومت مسلمانوں کی تھی۔ ان میں جن ریاستوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی ان میں سوائے کشمیر اور کپورتھلہ کے باقی ریاستیں پاکستان میں اور جن میں ہندو اکثریت تھی وہ سب ہندوستان میں شامل کرلی گئیں۔ یہ تمام ریاستیں ۱۹۴۷ء کے بعد ختم کردی گئیں اور وہ پاکستان یا ہندوستان کے صوبے بن گئیں۔ لیکن ریاست کشمیر کا مسئلہ ابھی تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جھگڑے کا باعث بنا ہوا ہے۔ برطانوی ہند کا دارالحکومت پہلے کلکتہ تھا لیکن ۱۹۱۱ء کے بعد دہلی دارالحکومت ہوگیا۔ شروع میں برما بھی برطانوی ہند کا ایک حصہ تھا لیکن ۱۹۳۷ء میں برما الگ کردیا گیا۔

انگریزوں کا دور برصغیر کی تاریخ کا بڑا اہم دور ہے۔ اس زمانے میں زندگی کے ہر شعبے میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا جو جدید دور کہلاتا ہے۔ یہ دور صنعتی ترقی اور سائنس کا دور ہے۔ انگریزوں نے برصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پختہ سڑکوں کا جال بچھا دیا، دریاؤں پر بڑے بڑے فولادی پل تعمیر کیے۔ اسی زمانے میں ریل گاڑی کا آغاز ہوا جس سے سفر میں سہولتیں ہوگئیں اور اخراجات بھی کم ہو گئے۔ موٹر گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کا رواج ہوا اور انسان برق رفتاری سے لمبے لمبے سفر کرنے لگا۔ بجلی کی ایجاد سے گھر گھر روشنی ہونے لگی اور بڑے بڑے کارخانے چلنے لگے۔ تار اور ٹیلیفون کے سلسلے قائم ہوئے جن کے ذریعے ہزاروں میل دور پیغام بھیجنا اور لوگوں سے بات چیت کرنا ممکن ہوگیا۔

انگریز بجا طور پر اس کارنامے پر فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے برصغیر میں ایک نئے سائنسی دور کا آغاز کیا۔ لیکن اگر کوئی یہ سمجھے کہ انہوں نے یہ کارنامے انجام دے کر ملک کی خدمت کی تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ انگریز اس پر تو فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اور اہل یورپ نے نئی نئی چیزیں ایجاد کیں۔ لیکن ہمارے ملک میں ان چیزوں کو رواج دے کر انگریزوں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ انہوں نے یہ سب کچھ اپنے فائدے کے لیے کیا۔ اس خطے کی ترقی کے لیے نہیں کیا۔ انگریزوں نے یہاں سڑکیں اور ریلیں اس لیے بچھائیں کہ ان کے ذریعہ ملک پر قبضہ رکھا جا سکے، فوجوں کو آسانی سے اِدھر سے اُدھر لے جایا جا سکے۔ کاشت کاری کو اس لیے ترقی دی کہ روئی، پٹ سن اور دوسری اجناس کو انگلستان پہنچایا جائے اور پھر وہاں کے کارخانوں میں اسی مال سے مہنگے کپڑے اور مصنوعات تیار کر کے برصغیر کے لوگوں کو فروخت کیا جائے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں کپڑے کی مصنوعات پر پابندیاں لگائی گئیں، ماہر دست کاروں کی انگلیاں تک کٹوائی گئیں تاکہ وہ کپڑا تیار نہ کر سکیں۔ ایک زمانے میں برصغیر کا کپڑا اتنا اچھا ہوتا تھا کہ خود انگلستان کے باشندے اس کے مقابلے میں انگلستان کا بنا ہوا کپڑا نہیں خریدتے تھے۔

برطانوی اور اسلامی دور کا فرق

برصغیر میں انگریزوں کی حکومت مسلمانوں کی حکومت سے بالکل مختلف تھی۔ مسلمانوں نے برصغیر کو وطن بنا لیا تھا اور ان کی حکومت خود یہاں کے لوگوں کی حکومت تھی۔ مسلمان ہندوستان اور

پاکستان کی دولت کو کسی دوسرے ملک میں نہیں لے گئے۔ انہوں نے تعمیر و ترقی کا جو کام انجام دیا اس سے یہاں کے باشندوں کو فائدہ پہنچا اور ملک کی خوشحالی میں ایسا اضافہ کیا کہ یورپ کے لوگ ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہنے لگے۔[1] لیکن انگریزوں نے اس کے برخلاف برصغیر کو اپنا وطن نہیں بنایا، انہوں نے انگلستان میں بیٹھ کر یہاں کے لوگوں پر حکومت کی، یہاں کے باشندوں سے امتیازی سلوک کیا اور یہاں کی ساری دولت لوٹ کر انگلستان لے گئے اور سونے کی اس چڑیا کو ایسا لوٹا کہ وہ دنیا کا سب سے پس ماندہ اور مفلس ملک بن گیا اور اس کی دولت سے انگلستان میں دولت کی ریل پیل ہوگئی اور وہ دنیا کے خوش حال ملکوں کی صف میں شامل ہوگیا۔

برصغیر میں انگریزوں نے مدرسے اور یونیورسٹیاں بھی اپنے مفاد کے لیے قائم کیں۔ انگریز یہاں کے باشندوں کو صرف وہ تعلیم دینا چاہتے تھے جو انگریزوں کے مطلب کی ہو۔ ان کا اصول تھا کہ اس برصغیر میں ایسی تعلیم دی جائے کہ یہاں کے باشندے صورت اور شکل کے لحاظ سے تو پاکستانی یا ہندوستانی نظر آئیں لیکن ان کے سوچنے کا انداز انگریزوں جیسا ہو یعنی وہ انگریزوں کے مفاد اور فائدے کی بات تو سمجھ سکیں لیکن اپنے وطن کے مفاد اور فائدے کی بات ان کے ذہن میں نہ آسکے۔ انہوں نے اس خطے میں جو مدرسے قائم کیے ان میں مغربی اور مسیحی نظریات اور تہذیب کے مطابق تعلیم دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مدرسوں میں پڑھنے والے بچے اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب سے ناواقف رہے اور وہ خود اپنی تاریخ اور اپنے بزرگوں کے شاندار کارناموں کو بھول گئے لیکن انگریزوں کے کارناموں سے ضرور واقف ہوگئے انہوں نے ہندوستان کی تاریخ اس طرح پڑھائی کہ ہندو اور مسلمانوں کے اختلافات بڑھیں، مسلمانوں کو ہندوؤں کا دشمن ثابت کیا جائے اور مسلمانوں کی ان خدمات پر پردہ ڈالا جائے جو انہوں نے مذہب کا امتیاز کیے بغیر اس خطے میں تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کو ترقی دینے کے لیے انجام دی تھیں۔ برطانوی دور کے اس طرز تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہر چیز کو مغرب کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگا۔

برطانوی حکومت نے ان مدرسوں کی دل کھول کر امداد کی جو عیسائیوں کے تبلیغی اداروں نے ہندوستان اور پاکستان کے چپے چپے میں قائم کیے تھے اور جن کو مشن اسکول کہا جاتا تھا۔ ان مشن

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے ملت اسلامیہ کی تاریخ حصہ دوم باب ۲۲۔ ''سونے کی چڑیا''

اسکولوں کی خود ایک انگریز نے اس طرح تعریف کی تھی:

''اگر چہ ہم ان مدرسوں کے طلبہ کو عیسائی نہیں بنا سکے لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ مسلمان، ہندو اور سکھ بھی نہیں رہ سکے''

ظاہر ہے کہ انگریزوں کے لیے اس سے زیادہ مفید اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرح انہوں نے طلباء کے ذہنوں سے ان کے اپنے وطن مذہب اور تہذیب سے محبت کا جذبہ ہی ختم کر دیا تھا اور جب کسی قوم کے اندر سے قومی احساس ختم ہو جائے تو وہ صرف غلامی ہی کر سکتی تھی۔ پھر انگریزوں نے اپنے مطلب کی یہ تعلیم بھی عام نہیں ہونے دی اور انہوں نے جب برصغیر کو چھوڑا تو یہاں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب صرف سات فیصد تھا۔ انگریزوں نے پاکستان اور ہندوستان کے باشندوں کو اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ سے زیادہ محروم رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے ادارے صرف انگلستان میں قائم کیے تاکہ برصغیر کے لوگ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکیں۔ اس جگہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ برطانیہ کا مجموعی رقبہ اگرچہ پاکستان اور ہندوستان کے رقبہ کا صرف پندرھواں حصہ ہے لیکن انگریزوں نے اپنے ملک میں اسی مدت میں ۵۳ ہزار میل لمبی ریل کی پٹریاں بچھا دیں لیکن برطانوی ہند میں اس کی پندرہ گنا وسعت کے باوجود ۴۱ ہزار میل لمبی پٹریاں بچھائیں۔

ان تمام خرابیوں کے باوجود ہمیں برطانوی دور کی ایک بڑی خوبی کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔ انگریزوں نے یہاں کے باشندوں کی مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کی اور نہ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسا اسپین کی حکومت نے اندلس کے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اور موجودہ دور میں روس کی اشتراکی حکومت مسلمانوں کے ساتھ کر رہی ہے۔ انگریزوں نے یہاں کے لوگوں کو بڑی حد تک تحریر و تقریر کی آزادی بھی دی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہاں کے باشندوں کی آزادی کے حق کو تسلیم کیا بلکہ نمائندہ حکومت کے آئینی اور جمہوری نظام کو بھی قائم کیا جس کے تحت برصغیر کے لوگ آہستہ آہستہ آزادی کی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

ہم پچھلی کتاب میں سید احمد شہید کی تحریک جہاد کی ناکامی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کا حال پڑھ چکے ہیں۔ ان تحریکوں کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا۔ مسلمانوں کو ان کی جائیدادوں اور زمینوں سے محروم کر دیا بیشمار لوگوں کو

پھانسیاں دی گئیں اور ہزاروں کو جزائر انڈمان جلا وطن کر دیا۔ کچھ تو انگریزوں کے ان مظالم کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ انگریز ان کی سلطنت کے غاصب تھے۔ مسلمانوں کو انگریزوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ ان سے کسی قسم کا تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے۔ نہ انگریزی زبان سیکھنا چاہتے تھے۔ اور نہ انگریزوں کے لائے ہوئے علوم۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی طریقہ پر تعلیم حاصل کرنے سے ان کے مذہب، تہذیب وتمدن اور اخلاق کو نقصان پہنچے گا اور لوگ بے دینی کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ وہ انگریزوں کی ملازمت کرنا بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل شروع میں انگریزوں کے لیے مفید ثابت ہوا کیونکہ ان کو مسلمانوں پر بھروسہ نہیں تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اور اعلیٰ عہدوں پر قابض ہو کر ان کے لیے خطرہ کا باعث بنیں۔ مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی۔ پورے برصغیر میں ان کی آبادی کا تناسب ۲۵ فیصد سے بھی کم تھا۔ برصغیر کی تقریباً تین چوتھائی آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ انگریزی حکومت نے ہر میدان میں ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ہندوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ انہوں نے انگریزی زبان پڑھی، جدید علوم کی تعلیم حاصل کی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے انگریزی حکومت کی ملازمتیں قبول کیں۔ انگریزوں نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا اور ان کو ذمہ داری کے کام سپرد کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں ہندو تعلیم، دولت اور سرکاری ملازمتوں کے میدانوں میں مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے اور مسلمان افلاس اور جہالت کا شکار ہو گئے۔ یہ حالات تھے کہ مسلمانوں میں ایک بہت بڑے رہنما پیدا ہوئے جن کا نام سید احمد خاں تھا، لیکن وہ سرسید کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔

سید احمد خان (۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء تا ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء)

سید احمد خاں ان رہنماؤں سے مختلف تھے جو اب تک اسلامی ہند میں پیدا ہوتے رہے تھے۔ ہمارے پچھلے رہنما عام طور پر طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے اور اگر اس طبقے سے نہیں ہوتے تھے تو وہ علماء کے زیر اثر ضرور ہوتے تھے اور ان کی تعلیم بھی قدیم طرز کے دینی مدرسوں میں ہوتی تھی۔ سید احمد خاں نے اگرچہ گھر پر مختلف علماء سے دینی نوعیت کی تعلیم حاصل کی اور قرآن، حدیث اور فقہ کا درس لیا لیکن ان کا تعلق طبقہ علماء سے نہیں تھا۔ ان کے آباد اجداد دہلی کے تیموری

بادشاہوں کے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ سید احمد خان نے رسمی تعلیم کے علاوہ ذاتی طور پر جدید علوم میں دسترس حاصل کی ان میں اپنی اسلامی حیثیت پر فخر کا احساس پایا جاتا تھا۔ اور اسلامی عقائد اور نظریات پر ان کو غیر متزلزل طور پر یقین تھا۔ تحریک جہاد کی ناکامی کے بعد علماء کے اس طبقے نے دینی علوم کی نشر و اشاعت کی اہمیت اور مسلمانوں کے لیے دینی رہنمائی کی ضرورت کا شدت سے احساس کیا اور اس مقصد سے ایک ممتاز عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے ساتھیوں نے یو پی ہی کے ایک قصبہ دیوبند (ضلع سہارنپور) میں ایک دارالعلوم قائم کیا۔ یہ دارالعلوم علی گڑھ کالج سے نو سال پہلے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا اور جلد ہی اس نے اتنی ترقی کر لی کہ انڈونیشیا، برما، لنکا اور مشرقی افریقہ جیسے دور دراز علاقوں سے طلبہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیوبند آنے لگے۔ ۱۹۱۲ء میں جب مشہور مصری عالم رشید رضا نے اس مدرسہ کو دیکھا تو انہوں نے کہا:

> ''اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتا دیا کہ ہندوستان میں بھی عربی اور دینی تعلیم کا اعلیٰ پیمانے پر انتظام ہے''

دیوبند اور علی گڑھ کے مدرسوں میں ایک اور بڑا فرق یہ تھا کہ جہاں علی گڑھ یونیورسٹی برطانوی ہند کی حکومت سے مالی امداد حاصل کرتی تھی، دارالعلوم دیوبند نے حکومت سے کسی قسم کی امداد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ علم حدیث کو عام کرنے میں اور مسلمانوں کے معاشرے سے بدعتوں اور غیر اسلامی رسوم کا قلع قمع کرنے میں دیوبند کے مدرسین اور علماء نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں کے علماء ملکی سیاست سے بھی بے تعلق نہیں رہے۔ خصوصاً شیخ الاسلام مولانا محمود الحسن (۱۸۵۱ء تا ۱۹۲۰ء)، مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء تا ۱۹۴۴ء)، مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۳۰۵ھ ۱۸۸۵ء تا ۱۳۶۹ھ، ۱۹۴۹ء) اور مولانا حسین احمد مدنی (۱۲۹۶ھ، ۱۸۷۹ء تا ۱۳۷۷ھ، ۱۹۵۷ء) نے آزادی کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا اور قید و بند کے مرحلوں سے گزرے۔

اردو ادب کا دور جدید

اردو زبان کی پیدائش برصغیر کے اسلامی دور کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس زبان کی آبیاری میں مسلمان ادباء، علماء اور صحافیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ علاوہ ازیں مولانا محمد علی، مولانا

شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، نوابزادہ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر ان رہنماؤں میں سے ہیں جنھوں نے اسلامی ہند کی قابل قدر خدمات انجام دیں اور یہ سب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طالب علم تھے۔

سید احمد خاں کی کوششوں سے جس طرح مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ ہوا اسی طرح ان کی کوششوں سے جدید اردو ادب کو بھی فروغ ہوا۔ وہ جدید اردو نثر کے بانی ہیں اور ان کو اردو ادب کے نظام شمسی میں سورج کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ خود بھی کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے جن میں آثار الصنادید اور خطبات احمدیہ بہت اہم ہیں۔ آثار الصنادید میں دہلی کی تاریخی عمارتوں اور مشاہیر کے حالات ہیں اور خطبات احمدیہ میں انہوں نے مغربی مصنفوں کے ان حملوں کا جواب دیا ہے جو وہ حضور کی ذات پر کرتے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں سید احمد خان نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جہاں انگریزی زبان کی مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس) کے نام سے ایک اور ادارہ قائم کیا جس کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم کا فروغ تھا۔ ۱۸۷۰ء میں سید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے مضامین نے مسلمانوں میں معاشرتی اصلاح اور ترقی کا جذبہ پیدا کرنے میں بڑی مدد کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی، سائنٹفک سوسائٹی، ایجوکیشنل کانفرنس اور تہذیب الاخلاق کو اسلامی ہند کی تاریخ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان اداروں کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں جدید دور کا آغاز ہوا۔

سید احمد خان ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے ہیں جب مغرب اپنے عروج کے انتہائی نقطۂ پر تھا اور مسلمان اپنی تاریخ کے انتہائی پست درجہ میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی دنیا میں اپنے ہمعصر جدید رہنماؤں کی طرح مغرب سے مرعوب تھے۔ وہ مغربی افکار اور تہذیب سے مفاہمت کرنا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں ان سے بعض دینی معاملات میں جگہ جگہ لغزشیں ہوئیں۔ سید احمد خاں میں اسلام سے محبت کے باوجود اسلامی انقلاب کا شعور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قومی بنیاد پر کام کیا اسلامی بنیاد پر کام نہ کر سکے۔ تعلیم سے متعلق بھی ان کے نظریات محدود تھے۔ اس سے یہ فائدہ تو ہوا کہ مسلمانوں کو ملازمتیں ملنے لگیں لیکن تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مقصود ملازمتوں اور ذاتی فائدوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ان کی سیرت، کردار اور فکر اسلامی نہ بن سکی۔ نظام تعلیم کی

اس خامی کا احساس جلد ہی ان کے ساتھیوں کو ہو گیا اور آخر عمر میں خود سید احمد خاں نے تعلیمی تجربہ کی اس ناکامی کا اعتراف کر لیا تھا۔ بہر حال ان تمام کوتاہیوں کے باوجود سید احمد خان کا مقام اسلامی ہند کی تاریخ بیداری میں بہت ممتاز اور نمایاں ہے۔ ان کی ہمہ گیر سرگرمیوں کے اثرات مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑے اور انہوں نے جو ٹھوس تعمیری خدمات انجام دیں ان میں اسلامی دنیا کے کم لوگ سید احمد خان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کا کردار بلند تھا اور مقصد سے ان کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آخر میں ان کے بہت سے مخالف بھی ان کے حامی ہو گئے تھے۔ سید احمد خان نے مسلمانوں کو مایوسیوں کے اندھیروں سے نکالا اور ان میں حوصلہ اور امنگ پیدا کی۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے، لیکن وفات علی گڑھ میں پائی اور اپنی قائم کردہ یونیورسٹی کے احاطے میں دفن ہوئے۔

دیوبند

جس زمانے میں سید احمد خان مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرانے کی کوشش کر رہے تھے اور جدید علوم اور جدید تعلیم سے مسلمانوں کو روشناس کر رہے تھے اسی زمانے میں علماء کا وہ طبقہ جس کا تحریک مجاہدین سے تعلق تھا اسلامی بنیادوں کو مستحکم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ لوگ انگریزی حکومت سے کوئی تعلق قائم نہیں کرنا چاہتے تھے اور مغربی تہذیب اور افکار سے مفاہمت کے خلاف تھے۔ اگرچہ علماء کے اس گروہ میں جدید ریاست کو چلانے کی صلاحیت نہیں تھی اور وہ دور جدید کے تقاضوں سے بھی ایک حد تک بے خبر تھے، لیکن انہوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا اور مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور مغرب کے عروج کے اسباب پر غور کیا۔ آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو انگریزوں کی مخالفت ترک کر دینی چاہیے۔ انگریزی حکومت سے تعاون کرنا چاہیے، حکومت کے قائم کیے ہوئے مدرسوں میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ اور جدید علوم سیکھنا چاہییں۔ سید احمد خان نے زور دیا کہ اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا تو وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ سید احمد خان کا نقطۂ نظر تقریباً وہی تھا جس کا اظہار اسی زمانے میں خیرالدین پاشا (۱۸۱۰ء تا ۱۸۸۹ء) تونس میں طہطاوی (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۳ء) اور محمد عبدہٗ (۱۸۴۹ء تا ۱۹۰۵ء) مصر میں کواکبی (۱۸۴۹ء تا ۱۹۰۲ء) شام میں مدحت پاشا

۱۸۲۰ء تا ۱۸۸۳ء اور تنظیمات کے رہنما ترکی میں کر رہے تھے۔ سرسید نے کہا کہ ہم انگریزی تعلیم اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی تہذیب کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ میں علی گڑھ میں ایک کالج بھی قائم کیا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ [1] علی گڑھ کی یہ مسلم یونیورسٹی برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی یونیورسٹی تھی۔ لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے سید احمد خاں کو یونیورسٹی قائم کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے اپنا کام پورے عزم کے ساتھ جاری رکھا۔ ان کا خلوص بالآخر کام آیا۔ لوگوں کو جیسے جیسے جدید تعلیم کے فائدے نظر آنے لگے مخالفت کم ہوتی چلی گئی۔ علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی سے مسلمانوں کو دنیوی حیثیت سے واقعی بہت فائدہ ہوا۔ یہاں کے فارغ التحصیل طالب علم نہ صرف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے لگے بلکہ انہوں نے عام مسلمانوں کی بھی بڑی رہنمائی کی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی رہنما جس کثرت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پیدا کیے اتنے برصغیر کے کسی دوسرے تعلیمی ادارے نے پیدا نہیں کیے۔ اس سے پہلے برصغیر میں کوئی مشترکہ زبان موجود نہیں تھی۔ ہندوؤں کے دور میں سنسکرت زبان کو علمی اور بعض اوقات درباری حیثیت حاصل رہی لیکن یہ عوام کی زبان نہ بن سکی۔ مسلمانوں کے دور میں عربی ان کی مذہبی اور علمی زبان اور فارسی درباری زبان بن گئی۔ اسی دور میں برصغیر کے باشندے پہلی مرتبہ سیاسی وحدت سے آشنا ہوئے۔ سیاسی استحکام اور امن و امان کی وجہ سے تجارت کو فروغ ہوا اور برصغیر کے مختلف حصوں کے باشندوں کو ایک دوسرے سے ملنے اور تعلق قائم کرنے کی سہولتیں حاصل ہوئیں۔ ان سہولتوں کی وجہ سے ایک مشترکہ زبان خود بخود وجود میں آنے لگی اس زبان کے الفاظ شمالی ہند کی عوامی زبان برج بھاشا کے تھے اور ان میں عربی اور فارسی کے الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔ لیکن سولہویں صدی کے آخر تک یہ زبان ہندی کہلاتی رہی۔ ادبی حلقوں میں اس کو ریختہ بھی کہا جاتا تھا۔ سترہویں صدی میں جب پورے برصغیر پر تیموری سلطنت کا اقتدار قائم ہو گیا تو پہلی مرتبہ اس زبان کو اردو کا نام ملا۔ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر یا فوج کے ہیں۔ اسلامی دور میں بالعموم اور تیموری دور میں بالخصوص فوج مختلف علاقوں کے لوگوں پر مشتمل

---

(1) ۲۴۔ مئی ۱۸۷۵ء، ۱۲۹۲ھ کو اس کالج کا آغاز اسکول کی حیثیت سے ہوا۔ ۸۔ جنوری ۱۸۷۷ء، ۱۲۹۳ھ میں کالج ہو گیا اور جنوری ۱۹۲۱ء، ۱۳۳۹ھ میں یونیورسٹی بنا۔

ہوتی تھی۔ اس میں ترکی، فارسی، ہندی، برج بھاشا اور دوسری مقامی زبانوں کے بولنے والے موجود ہوتے تھے۔ ان ہی مختلف عناصر کے اشتراک سے یہ مشترکہ زبان وجود میں آئی اور فوج میں پروان چڑھنے کی اسی نسبت سے اس کو اردو نام ملا۔

اردو میں نظم و نثر کا آغاز اگرچہ سولہویں صدی میں ہو چکا تھا، لیکن اس کو حقیقی ترقی دہلی اور اودھ کے درباروں میں اس وقت ملی جب اٹھارہویں صدی میں مرکزی حکومت کمزور ہو چکی تھی اور برصغیر کے مشرقی حصوں میں برطانوی اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ اردو کی اس ترقی میں کلکتہ کا حصہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو برطانوی حکومت کی سرپرستی میں اردو کا ایک بڑا مرکز [1] بن گیا تھا۔ لیکن اردو کے صف اول کے ابتدائی شاعر دہلی، آگرہ اور اودھ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہم ان کا تعارف اسی کتاب کے دوسرے حصے میں کرا چکے ہیں۔

جہاں تک اردو کے جدید ادب کا تعلق ہے اس کا آغاز برطانوی دور سے شروع ہوتا ہے۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد سے یہ ادب جدید تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اور مسلمان معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار اور رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر کسی ایک شخص کو جدید اردو ادب کا بانی کہا جا سکتا ہے تو وہ سید احمد خان کی ذات ہے۔ چنانچہ تاریخ ادب کے مصنفین نے جدید اردو ادب کے پہلے دور کو سرسید اور رفقائے سرسید کا دور کہا ہے۔ سید احمد خاں ایک مردم شناس رہنما تھے اور ان کو جہاں کہیں جوہر قابل نظر آتا تھا وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اس کو کسی نہ کسی مفید کام میں لگا دیتے تھے۔ اس طرح سید احمد خاں کے گرد اردو کے بہترین علماء، شعراء اور ادیب جمع ہو گئے تھے۔ ان میں حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور مولوی ذکاء اللہ کو اردو کے نظام شمسی کے پانچ سیارے کہا جاتا ہے۔ اور سید احمد خاں کو اس نظام میں آفتاب کی حیثیت حاصل تھی۔ کیونکہ ان میں سوائے محمد حسین آزاد کے سب سید احمد خاں کے حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں حالی (۱۸۳۷ء، ۱۲۵۳ھ تا ۱۹۱۴ء، ۱۳۳۳ھ) اور محمد حسین آزاد (۱۸۲۷ء، ۱۲۴۸ھ تا ۱۹۱۰ء، ۱۳۲۸ھ) جدید اردو شاعری کے بانی ہیں۔ انہوں نے

---

(1) اردو کا یہ مرکز فورٹ ولیم کالج تھا جسے برطانوی حکومت نے ۱۸۰۰ء میں قائم کیا تھا۔ اردو کا پہلا چھاپہ خانہ بھی یہیں قائم ہوا۔ کالج میں ایک شعبہ تصنیف و تالیف بھی تھا جس میں کئی ممتاز اہل قلم کام کرتے تھے۔ اردو نثر کا باقاعدہ آغاز کالج کے اسی شعبے سے ہوا اور اردو میں پہلی مرتبہ درسی، معلوماتی اور ادبی نوعیت کی کتابیں یہاں سے شائع ہوئیں۔

ایک نیا رنگ دیا اور نئے نئے موضوعات سے آشنا کیا۔ حالی نے خاص طور پر مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر جدید علم تنقید کی بنیاد ڈالی اور شاعروں کو غزل کی بجائے نظم لکھنے پر مائل کیا اور ادب کو اصلاح قوم اور معاشرہ کا ترجمان بنانے کی کوشش کی۔ ان کی مسدس اردو ادب میں ہمیشہ ایک یادگار رہے گی۔ اس طویل نظم میں حالی نے مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ کھینچا ہے اور ان کو عظمت رفتہ حاصل کرنے پر ابھارا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری میں اس کتاب کا بڑا حصہ ہے اور یہ اردو نظم کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے۔ یہ نظم حالی نے سید احمد خاں کی فرمائش پر لکھی تھی اور جب وہ مکمل ہوگئی تو سید احمد خاں نے اس کو پڑھ کر مسرت سے کہا:

''اس کتاب کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں۔ جب خدا مرنے کے بعد پوچھے گا کہ تو کیا لایا، تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں''

شبلی (۱۸۵۷ء، ۱۲۷۳ھ تا ۱۹۱۴ء، ۱۳۳۲ھ) اردو زبان کے سب سے بڑے مورخ اور سوانح نگار تھے۔ انہوں نے اپنی تاریخی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی عظمت گزشتہ سے واقف کرایا اور بتایا کہ تہذیب و تمدن کی ترقی میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ ان کی تصانیف میں سیرت النبی، الفاروق، المامون الغزالی اور سیرۃ النعمان بہت مشہور ہیں۔ آخر الذکر امام ابو حنیفہؒ کی سوانح عمری ہے ان میں پہلی دو کتابیں اتنی پسند کی گئیں کہ ان کا عربی، انگریزی، ترکی وردوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

شبلی کا ایک اور بڑا کارنامہ ''ندوۃ العلماء'' کے نام سے ایک تعلیمی درس گاہ کا قیام ہے۔ شبلی میں سید احمد خان اور حالی کے مقابلہ میں اسلامی شعور زیادہ بیدار تھا۔ وہ علی گڑھ اور دیوبند کے مدرسوں کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مدرسے مسلمانوں کی صحیح ضرورت پوری نہیں کرتے دیوبند سے صرف مولوی نکلتے ہیں اور علی گڑھ سے جو طلبہ تعلیم پا کر نکلتے ہیں ان میں دینی جذبہ قوی نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کو اسلام سے پوری طرح واقفیت ہوتی ہے۔ شبلی ایک ایسا مدرسہ چاہتے تھے جس میں پڑھنے کے بعد طالب علم جدید علوم اور اسلامی تعلیم دونوں سے واقف ہو۔ اور عمل اور کردار کے لحاظ سے بھی وہ باعمل مسلمان ہو۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے ۱۸۹۸ء، ۱۳۱۶ھ میں لکھنو (یوپی ہندوستان) میں ندوۃ العلماء کے نام سے ایک نیا مدرسہ قائم کیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ مدرسہ علی گڑھ اور دیوبند کے مقابلہ میں اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب ہوا۔ یہاں

کے شاگردوں میں سید سلیمان ندوی، مسعود عالم ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی نے علمی دنیا میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی کے علاوہ اس دور کے ادیبوں میں چند نام اور بھی ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں ایک ڈپٹی نذیر احمد دہلوی (۱۸۳۶ء، ۱۲۵۲ھ تا ۱۹۱۲ء، ۱۳۳۰ھ) ہیں۔ وہ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ اور انہوں نے خواتین کے مسائل اور اصلاح معاشرہ کو اپنا موضوع بنایا۔ انہوں نے مذہبی اور اخلاقی مباحث پر بھی لکھا۔ قرآن مجید کا اردو میں نیا ترجمہ کیا اور برطانوی قانون تعزیرات ہند اور قانون شہادت کا اردو میں ایسا اچھا ترجمہ کیا کہ ان کی بنائی ہوئی اصطلاحات آج بھی عدالتوں میں رائج ہیں۔ دینی امور میں ان کے بعض خیالات سے مسلمانوں نے شدت سے اختلاف کیا۔ ان میں ایک سود کا مسئلہ بھی تھا جسے وہ نہ صرف جائز تصور کرتے تھے بلکہ لیتے بھی تھے۔

مولوی ذکاء اللہ دہلوی (۱۸۳۲ء، ۱۲۴۸ء تا ۱۹۱۰ء، ۱۳۲۸ھ) اس دور کے سب سے زیادہ کثیر التصانیف مصنف تھے۔ انہوں نے تقریباً ۱۴۳ کتابیں لکھیں یا ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعات، علم الاخلاق اور سیاست کے موضوع پر ہیں۔ لیکن ذکاء اللہ کی زیادہ شہرت ایک مورخ کی حیثیت سے ہے۔ ان کی تاریخ ہندوستان جو نو ضخیم جلدوں میں ہے۔ محمد بن قاسم سے لے کر ۱۸۵۷ء تک برصغیر کے اسلامی دور کی سب سے مفصل تاریخ ہے۔ ان کی دوسری اہم کتاب، تاریخ عہد سلطنت ملکۂ معظمہ قیصر ہند" ہے۔ یہ ملکہ وکٹوریہ (۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۱ء) کے دور کی مفصل تاریخ ہے اور دو ہزار ایک سو تیس صفحات پر پھیلے ہوئے پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔

تاریخی ناولوں کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا اور اس میدان میں سب سے زیادہ شہرت عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء تا ۱۹۲۶ء) نے حاصل کی۔

اس دور کے شاعروں میں اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء) اور اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء، ۱۲۶۲ھ تا ۱۹۲۱ء، ۱۳۴۰ھ) ایک انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ اسماعیل میرٹھی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے ان کی نفسیات کو دیکھتے ہوئے نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں آج بھی شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور درس میں داخل ہیں۔ ان نظموں کی وجہ سے وہ بچوں کے شاعر

کہلاتے ہیں اور غالباً اب تک کوئی دوسرا شاعر اس میدان میں ان سے بازی نہ لے جا سکا۔

اکبر الہ آبادی اس دور کے بلکہ اردو زبان کے سب سے بڑے طنز نگار اور مزاحیہ شاعر ہیں۔ لیکن ان کا مزاح صرف تفریحی نہیں ہے بلکہ فکر انگیز ہے۔ انہوں نے اس نظریاتی کشمکش کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جو اسلامی افکار اور معاشرہ پر مغربی افکار کے اثرات سے پیدا ہوئی۔ انہوں نے بے سوچے سمجھے انگریزوں کی اندھی تقلید کرنے والوں کا بڑے دلچسپ طریقہ پر مضحکہ اڑایا ہے۔ اور نوجوانوں کے بے دینی کے رجحانات پر لطیف طنز کی ہے۔

مختصر یہ کہ سید احمد خاں اور ان کے حلقے سے تعلق رکھنے والے عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں سے اردو علمی اور ادبی زبان بن گئی اور اردو ادب کے جدید دور کا آغاز ہوا۔

آخر میں مولوی چراغ علی (۱۸۴۶ء، ۱۲۶۲ھ تا ۱۸۹۵ء، ۱۳۱۲ھ) اور سید امیر علی (۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۸ء) کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے اپنے خیالات کا اظہار انگریزی زبان میں کیا۔ یہ دونوں حضرات عقیدہ کے لحاظ سے شیعہ تھے لیکن سید احمد خاں کے حلقے ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مغربی مصنفوں کے حملوں کے خلاف اسلام کی مدافعت کی۔ مولوی چراغ علی کے موضوع عام طور پر جہاد، رسم غلامی، تعدد ازدواج اور حقوق نسواں تھے۔ انہوں نے انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی مضامین لکھے۔ جسٹس امیر علی کی سب سے زیادہ شہرت ان کی کتاب اسپرٹ آف اسلام کی وجہ سے ہے، جس میں انہوں نے اسلام کا اہل مغرب سے بھرپور تعارف کرایا ہے۔ امیر علی کی دوسری کتاب (A Short History of the saracens) ہے جو آغاز اسلام سے بغداد کی تباہی تک اسلام کی تاریخ ہے۔ ان دونوں کتابوں کا اردو اور بعض دوسری اسلامی زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ مولوی چراغ علی اور امیر علی کی تحریروں میں اگر کوئی خامی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے سید احمد خاں کی طرح معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار کیا ہے۔ وہ اسلام کے انقلابی پیغام کو مثبت انداز میں واحد طریقۂ نجات کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکے بلکہ زیادہ وقت اسلام کی طرف سے صفائی پیش کرنے پر صرف کیا اور اسلامی تاریخ کو ایک مثالی تاریخ کی حیثیت سے پیش کرنے کی بجائے ویسی ہی تاریخ ثابت کرنے کی کوشش کی جیسی دوسری بڑی قوموں کی تاریخ ہے۔ ان دونوں مصنفوں کا طرز استدلال معتزلہ کا طرز استدلال تھا جو ٹھیٹ اسلامی نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔

سیاسی بیداری اور مسلم لیگ کا قیام

برطانوی حکومت ایک آئینی بادشاہت تھی۔ یعنی اس کا سربراہ ایک بادشاہ تھا لیکن اس بادشاہ کو اختیارات حاصل نہیں تھے۔ اصل اختیارات برطانیہ کے عوام کو حاصل تھے جو ان اختیارات کا استعمال برطانوی پارلیمنٹ کے لیے نمائندے منتخب کر کے کرتے تھے۔ پھر یہ نمائندے وزیروں کی ایک کابینہ منتخب کرتے تھے۔ اور یہ کابینہ پارلیمنٹ کے مشورے سے حکومت کا نظام چلاتی تھی۔

انگریزوں نے برصغیر پر ۱۸۵۷ء، ۱۲۷۳ھ تک من مانے طریقہ پر حکومت کی۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اگرچہ برطانوی پارلیمنٹ کے احکام اور قوانین کے تحت قائم تھی اور ان ہی قوانین کے تحت حکومت کرتی تھی لیکن برصغیر کے باشندوں کی مرضی اور رائے کو حکومت میں کوئی دخل نہیں تھا۔ تاج برطانیہ کی نمائندگی وائسرائے یعنی والی ہند کرتا تھا۔ یہ وائسرائے صوبوں کے گورنر مقرر کرتا تھا اور گورنر ڈویژن اور اضلاع کے لیے کمشنر اور کلکٹر مقرر کرتا تھا۔ لیکن یہ سب انگریز ہوتے تھے۔ انیسوی صدی کے آخر میں برطانوی حکومت نے نظام حکومت کے سلسلے میں برصغیر کے باشندوں کی رائے معلوم کرنے اور ان کی شکایات اور مسائل کے بارے میں ان کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس مقصد کے لیے حکومت کی تحریک پر ہندوستان کے لوگوں نے ۱۸۸۵ء میں ''انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی جو عوام کی شکایت حکومت تک پہنچاتی تھی۔ بعد میں یہ جماعت زیادہ نمائندہ اور طاقتور ہوگئی اور ہندوستانیوں کے مطالبات زیادہ جرأت سے حکومت کے سامنے پیش کرنے لگی۔ ان مطالبوں میں ایک مطالبہ نمائندہ حکومت کا قیام تھا۔ سید احمد خاں مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے روکا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح مسلمانوں اور انگریزوں میں پھر تصادم شروع ہو جائے گا جو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کی مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور مسلمان پوری آبادی میں صرف ایک چوتھائی تھے اس لیے اگر ملک میں نمائندہ حکومت قائم ہوئی تو مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہندو اکثریت کے سامنے بے بس ہوں گے۔ پھر طریق انتخاب کا

مسئلہ بھی پیچیدہ تھا۔ اگر ملک میں مخلوط طریق انتخاب رائج کیا جاتا تو اول تو مسلمان منتخب ہی نہیں ہوسکتے تھے اور اگر ہوتے تو ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے والے مسلمان منتخب ہوتے اور ایسے نمائندے مسلمانوں کے حقوق اور آرزوؤں کی ترجمانی نہیں کرسکتے تھے۔ سید احمد خان کے انتقال کے بعد مسلمانوں نے اپنے قومی وجود کے تحفظ کے لیے ۱۹۰۶ء، ۱۳۲۴ھ میں مخلوط انتخاب کی بجائے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا جسے برطانوی حکومت نے منظور کرلیا۔ اس مطالبہ کی منظوری کے بعد مسلمانوں نے اپنی علیحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت شدت سے محسوس کی اور اس مقصد کے لیے ۳۰۔ دسمبر ۱۹۰۶ء، ۱۳۲۴ھ میں ڈھاکہ میں کل ہند مسلم لیگ کے نام سے پہلی قومی جماعت قائم کی گئی۔ جس کا پہلا باقاعدہ اجلاس دسمبر ۱۹۰۷ء، ۱۳۲۵ھ میں کراچی میں ہوا۔

مولانا محمد علی (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء تا ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء)

مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہندوستان میں نمائندہ حکومت قائم کرنے کی جدوجہد شروع ہوگئی جس میں مسلمانوں نے کانگریس سے پورا پورا تعاون کیا۔ نمائندہ حکومت کی اس جدوجہد میں جو بعد میں مکمل آزادی کی تحریک بن گئی مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء، ۱۳۰۵ھ تا 1958ء، ۱۳۷۷ھ) اور مولانا محمد علی نے نمایاں حصہ لیا۔ مولانا محمد علی بڑے پرجوش اور نڈر رہنما تھے۔ انہوں نے آزادی کے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور کئی مرتبہ قید کیے گئے۔ ۱۹۱۳ء، ۱۳۳۱ھ سے ۱۹۲۲ء، ۱۳۴۱ھ تک تحریک خلافت کے نام سے جو تحریک چلائی گئی اور جس کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بے مثال تعاون کا مظاہرہ کیا گیا اور آخر میں جس نے ترک موالات یعنی برطانوی حکومت سے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی شکل اختیار کرلی، اس میں سب سے نمایاں حصہ مولانا محمد علی کا تھا۔ تحریک ترک موالات کے زمانے میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بائیکاٹ بھی کردیا کیونکہ اس یونیورسٹی کو انگریزی حکومت سے مالی امداد ملتی تھی اور اس کی پالیسی پر انگریزی حکومت اثر انداز ہوتی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مولانا محمد نے علی گڑھ ہی میں ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک نئی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جو بعد میں دہلی منتقل ہوگئی۔

یہ تحریکیں اگرچہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں لیکن ان کی وجہ سے بہت سے حقوق مان لیے گئے اور آزادی کی راہ ہموار ہونے میں مدد ملی۔ ۱۹۳۰ء میں برطانوی حکومت نے برصغیر کے

رہنماؤں کو لندن بلایا تا کہ وہ ایک گول میز کانفرنس میں شریک ہوکر برصغیر کی آزادی کے مسئلہ پر حکومت سے گفتگو کرسکیں۔ ان رہنماؤں میں مولانا محمد علی بھی تھے۔ وہ اس زمانے میں اتنے بیمار تھے کہ ان کو اسٹریچر پر لٹا کر جہاز تک پہنچایا گیا۔ مولانا محمد علی نے صحت کی خرابی کے باوجود کانفرنس میں شرکت کی اور ایک تقریر کرتے ہوئے برطانوی حکومت کو مخاطب کر کے کہا:

''یا تو تم کو مجھے آزادی کا پروانہ دینا ہوگا یا پھر یہیں دوگز زمین دینی ہوگی۔ میں غلامی کی حالت میں وطن واپس نہیں جاؤں گا''

خدا نے ان کی بات رکھ لی۔ آزادی تو انگریزوں نے نہیں دی لیکن محنت کرنے کی وجہ سے مولانا محمد علی کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور ۴۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو ان کا لندن ہی میں انتقال ہوگیا۔ بعد میں مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی کی خواہش پر ان کی نعش کو فلسطین کے مقدس شہر بیت المقدس یعنی یروشلم لے جا کر مسجد اقصیٰ کے پاس دفن کر دیا گیا۔ مولانا محمد علی نہ صرف ایک بڑے سیاسی رہنما تھے بلکہ ایک بے باک صحافی اور خوش گو شاعر بھی تھے۔ ان کی زندگی اسلامی تعلیمات کا ایک اچھا نمونہ تھی۔ ان کے کارنامے اور ان کی زندگی مسلمان نوجوانوں کے لیے ہمیشہ قابل تقلید رہے گی۔

تحریک ترک موالات اور سول نافرمانی کی ناکامی کے بعد ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد ختم ہوگیا تھا۔ کانگریس نے ایک غیر مذہبی جماعت ہونے کے باوجود مختلف معاملات میں مسلمانوں کے مفاد کی مخالفت اور ہندوؤں کے مفاد کی حمایت کی۔ اس نے مسلم اکثریت رکھنے والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق تسلیم نہیں کیے۔ اردو[1] جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ تعاون سے وجود میں آئی تھی اور کشمیر سے لاہور اور مدراس تک اور بلوچستان سے آسام تک ہر جگہ مشترکہ زبان کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور ہر صوبے سے اردو زبان کے اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے اور عام جلسوں میں ایک صوبے کے رہنما دوسرے صوبوں کے لوگوں تک اسی زبان میں تقریر کر کے اپنے خیالات پہنچاتے تھے، اب اس کے خلاف ہندوؤں نے ایک محاذ بنا لیا تھا اور کانگریس اردو کے مقابلے میں ہندی کی سرپرستی کرنے لگی تھی۔ ہندو مسلم

---

(۱) برطانوی دور کے آغاز میں فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۸۳۵ء میں برطانوی حکومت نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا تھا۔ لیکن ہندوؤں نے اس کے بعد اردو کی اتنی شدید مخالفت کی کہ ۱۸۷۱ء میں اردو کی سرکاری حیثیت کو ختم کر کے انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا۔

اختلافات کے اس زمانے میں مولانا محمد علی کا انتقال ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگریس سے غیر مشروط تعاون شروع کر دیا اور مسلم قومیت اور احیائے اسلام کی بجائے متحدہ قومیت اور سیکولرازم کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ مولانا محمد علی کی وفات کے بعد سیاسی قیادت کے اس خلا کو ممتاز شاعر اور مفکر ڈاکٹر محمد اقبال نے نظریاتی میدان میں پر کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچایا۔

ڈاکٹر اقبال (۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء تا ۱۳۵۷/۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر محمد اقبال ۹/ نومبر ۱۸۷۷ء کو پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔اے کیا۔ اس کے چند سال بعد ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے جہاں انگلستان اور جرمنی میں انہوں نے قانون اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ اور میونخ یونیورسٹی سے ''فلسفہ عجم'' نامی کتاب لکھ کر ڈاکٹر کی سند حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ پنجاب واپس آ گئے۔ اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر اور مفکر تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار نظم اور نثر دونوں میں کیا۔ وہ انگریزی، فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے اور تینوں زبانوں میں انہوں نے لکھا۔ ان کا شاعرانہ کلام اردو سے زیادہ فارسی میں ہے۔ علمی خیالات کا اظہار انہوں نے انگریزی اور اردو کے مضامین، تقریروں اور خطوط میں کیا۔ وہ روایتی انداز کے شاعر نہیں تھے۔ انہوں نے حالی اور اکبر کی طرح شاعری کو قومی اصلاح اور بیداری کے لیے استعمال کیا اور اس نوعیت کی شاعری کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ ان کا پیغام اسلام کا پیغام تھا جس کی وجہ سے اقبال کو شاعر اسلام کہا جاتا ہے۔

اقبال میں اسلام کی انقلابی تعلیمات کا شعور ہمارے پچھلے رہنماؤں سے زیادہ تھا۔ انہوں نے سید احمد خان اور ان کے ساتھیوں کی طرح معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار نہیں کیا اور اس بات پر زور دیا کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی نجات صرف اسلام کے پیغام میں مضمر ہے۔ اقبال نے دفاعی انداز ترک کر کے خود مغربی تہذیب اور مغربی افکار پر جن کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے سخت تنقید کی۔ انھوں نے نے کہا کہ دین اور سیاست کی علیحدگی کا تصور قطعی غیر اسلامی ہے اور انسانیت کے لیے نقصان دہ انھوں نے وطنیت، قوم پرستی اور نسل پرستی کی شدت سے مخالفت کی۔ انھوں نے

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے کمزور پہلو بتائے اور کہا کہ صحیح انصاف صرف اسلام کے عدل اجتماعی کے تصور کے تحت مل سکتا ہے۔ برصغیر کی سیاست میں اقبال نے متحدہ قومیت کے نظریہ پر تنقید کی اور کہا کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں وہ کسی دوسری قومیت میں ضم نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے ملوکیت یعنی بادشاہت کے نظام کو اور آمریت کو اسلامی تعلیم کے خلاف بتایا اور کہا کہ حقیقی جمہوریت اسلامی نظام کے تحت ہی قائم ہو سکتی ہے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت کا جو نظام قائم ہوا وہ اسلام کی روح کے خلاف تھا۔

اقبال چونکہ اسلامی نظام کے علمبردار تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلمانوں کو ایک جداگانہ ریاست قائم کرنے کا حق ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے تصورات کے تحت ایک جدید ریاست قائم کر سکیں۔ انھوں نے یہ خیال سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کیا لیکن اس کمیٹی نے منظور نہیں کیا۔ اس کے بعد جب ۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۰ء ۱۳۴۹ھ کو الہ آباد میں وہ کل ہند مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں دوبارہ ''مسلم ریاست'' کے خیال کو پیش کیا اور یہ یقین ظاہر کیا کہ ایک دن یہ ریاست قائم ہو کر رہے گی۔ اس کے بعد جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کیا تو اقبال نے اپنے خطوط میں تقسیم ہند کا یہ تصور اور زیادہ واضح الفاظ میں پیش کیا۔ اس دوران میں ایک مسلمان نوجوان چودھری رحمت علی (۱۸۹۵ء تا ۱۹۵۱ء) اس نئی مسلم مملکت کے لیے ۱۹۳۳ء میں پاکستان کا نام تجویز کر چکے تھے۔ ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کا انتقال ہو گیا لیکن اس کے دو سال بعد ان کی تقسیم ہند کی تجویز کو بالآخر کل ہند مسلم لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں منظور کر لیا اور ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء، ۲۷۔ رمضان ۱۳۶۶ھ کو اقبال کا خواب ــــــ پاکستان کی آزاد مملکت کے قیام کے ساتھ پورا ہو گیا۔

قائداعظم (۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء تا ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء)

پاکستان کی آزاد مملکت مسلمانوں نے جس رہنما کی قیادت میں قائم کی وہ محمد علی جناح تھے۔ جن کو برصغیر کے مسلمان ان کی کامیاب قیادت کی وجہ سے قائداعظم کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ محمد علی جناح ۲۵۔ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سندھ مدرستہ

الاسلام کراچی میں پائی۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے جہاں انھوں نے ۱۸۹۶ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ انگلستان سے واپسی پر انھوں نے بمبئی میں رہائش اختیار کی اور وکالت کو بحیثیت پیشہ اختیار کیا۔ اور چند سال میں ایسے کامیاب بیرسٹر بن گئے کہ سارے ملک میں ان کی شہرت ہوگئی۔

قائداعظم نے ملکی سیاست میں بھی ابتدا ہی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ کانگریس کے سرگرم رہنما اور ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علمبردار تھے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ پہلی مرتبہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور ۱۹۱۶ء میں وہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور اسی سال ان کی کوششوں سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جو میثاق لکھنو کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کے تحت کانگریس نے مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کر لیے تھے اور مسلم لیگ آزادی کی جدوجہد میں کانگریس کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئی تھی۔ لیکن اس معاہدے کے دو سال بعد جب کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو قائداعظم نہ صرف کانگریس سے علیحدہ ہوگئے بلکہ سیاست سے بھی کنارہ کش ہوگئے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے ملک بھی چھوڑ دیا اور انگلستان میں رہائش اختیار کر لی برطانوی حکومت نے جب ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے تحت صوبوں کو اندرونی خودمختاری دینے کا اعلان کیا تو یہ زمانہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا۔ ملک کی سیاست میں بڑی تبدیلیاں آنے والی تھیں، مولانا محمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور مسلمانوں میں کوئی ایسا رہنما نہیں تھا جو اس موقع پر ان کی رہنمائی کر سکتا۔ ایسی صورت میں لوگوں کی نظریں قائداعظم پر پڑیں جو آئینی اور قانونی امور کے ماہر تھے اور انھوں نے قائداعظم سے وطن واپس آنے کی درخواست کی۔ قائداعظم نے مسلمانوں کی اس خواہش پر سیاست میں پھر سے حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا اور اپریل ۱۹۳۴ء میں وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ ۱۹۳۶ء میں قائداعظم مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور اس کے بعد سے وہ پاکستان قائم ہونے تک ہر سال صدر منتخب ہوتے رہے۔

اگلے سال جب ملک میں انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے اس میں حصہ لیا لیکن وہ ۴۸۴ نشستوں میں سے صرف ایک سو آٹھ نشستیں حاصل کر سکی۔

قرارداد پاکستان

قائداعظم جب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے تو مسلم لیگ صرف کاغذی جماعت تھی اور اس کو آرام طلب سیاست دانوں کی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن قائداعظم کے صدر منتخب ہونے کے بعد اس میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ اور وہ ایک عوامی جماعت بن گئی۔ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں تو مسلم لیگ کو کامیابی نہ ہوئی اور وہ ۴۸۶ مسلم نشستوں میں سے صرف ایک سو آٹھ نشستوں پر قابض ہو سکی، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مسلم لیگ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۳ء کے درمیان جو اکسٹھ ضمنی انتخابات ہوئے ان میں ۴۷ میں مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہو گئے اور صوبائی اسمبلیوں کی ۴۴۱ مسلم نشستوں میں سے ۴۲۵ پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے اور اس طرح مسلم لیگ آئینی طور پر مسلمانان ہند کی واحد ترجمان بن گئی۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء، ۱۳۵۹ھ کا دن اسلامی ہند کی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ اس دن مسلم لیگ نے لاہور کے اجلاس میں تقسیم ہند کی قرارداد منظور کی جسے عرف عام میں قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے۔ اس قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ برصغیر کے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان پر مشتمل ایک آزاد اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ یہ قرارداد مسلمانان برصغیر کے جذبات کی ترجمان تھی۔ مسلمان اسلامی احکام کے مطابق ایک مثالی حکومت قائم کرنے کی جس آرزو کی پرورش کر رہے تھے یہ اس کا بھرپور اظہار تھی۔ یہ ایک ایسی آرزو اور ایک ایسا جذبہ تھا جس کا اظہار تاریخ اسلام کے ہر دور میں کیا گیا۔ لیکن بادشاہت کے استبدادی نظام کی وجہ سے اس کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ اب جبکہ جمہوری دور شروع ہو گیا تھا اور عوام بادشاہوں کے پھندے سے آزاد ہو چکے تھے تو ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی صدیوں پرانی آرزو کو عملی جامہ پہنائیں اور خلافت راشدہ کے دور کا احیاء کریں۔ پاکستان کی یہی کشش تھی کہ جس کی وجہ سے تحریک پاکستان کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور تحریک پاکستان نے نظریۂ پاکستان کی شکل اختیار کر لی اور اس کی حمایت ان صوبوں کے مسلمانوں نے بھی کی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے

اور جن کو پاکستان بننے سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا۔

۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے تحریک آزادی کے دباؤ کی وجہ سے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ برصغیر کو چھوڑ دیں گے۔ اس فیصلے سے پہلے ملک میں عام انتخابات ہو چکے تھے جن میں مسلم لیگ کی کامیابی نے آئینی طور پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ مسلمان تقسیم ہند چاہتے ہیں اور اپنی اکثریت کے علاقوں میں وہ ایک آزاد مسلم مملکت سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گے۔ برطانوی حکومت کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی آئینی صورت نہیں تھی کہ وہ یہاں سے جاتے وقت مسلم اکثریت کے صوبوں کی حکومت مسلمانوں کے سپرد کر کے جائے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے قیام پاکستان کا مطالبہ منظور کرلیا۔ کانگریس نے بھی اس فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ صوبہ سرحد میں چونکہ مسلم لیگ اکثریت سے کامیاب نہیں ہوئی تھی اس لیے وہاں صوبہ سرحد کو پاکستان میں یا ہندوستان میں شامل کرنے کے لیے استصواب رائے کیا گیا جس میں صوبہ کے تقریباً تمام باشندوں نے پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں رائے دی۔ اسی طرح آسام کے ضلع سہلٹ میں بھی استصواب کرایا گیا کیونکہ اس صوبہ میں صرف ضلع سلہٹ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں کے باشندوں کی اکثریت نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں رائے دی۔

برطانوی حکومت نے اس کے بعد ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء مطابق ۲۷۔ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو سیاسی اقتدار پاکستان کی حکومت کو اور ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارتی حکومت کو منتقل کر دیا۔ اس طرح برصغیر ایک سو نوے سال کی غلامی کے بعد آزاد ہو گیا اور اسلامی دنیا میں ایک نئی آزاد مملکت کا اضافہ ہو گیا۔ مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل اور سکریٹری نوابزدہ لیاقت علی خان پہلے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

علم و ادب

سید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے اردو کے جس نئے ادب کی انیسویں صدی کے نصف آخر میں آبیاری کی تھی وہ بیسویں صدی کے نصف اول میں ایک مکمل باغ بن گیا۔ اب اردو میں ہر قسم کے علمی، ادبی اور فنی خیالات کا آسانی سے اظہار کیا جانے لگا اور ہر علم و فن پر کتابیں لکھی گئیں اور انگریزی، عربی اور فارسی سے وسیع پیمانہ پر کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور

جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد (دکن) میں یونیورسٹی کی سطح تک اردو تعلیمی زبان بنادی گئی۔ اس زمانے میں جن لوگوں نے علمی، دینی اور تاریخی موضوعات پر کثرت سے لکھا اور جن کی تحریریں علمی اور تحقیقی لحاظ سے بین الاقوامی سطح کی ہیں ان میں سید سلیمان ندوی[1] (۱۸۸۴ء، ۱۳۰۲ھ تا ۱۹۵۳ء، ۱۳۷۳ھ) مولانا اشرف علی تھانوی[2] (۱۸۶۳ء، ۱۲۸۰ھ تا ۱۹۴۳ء، ۱۳۶۲ھ)۔ ابوالکلام آزاد[3] (۱۸۸۸ء، ۱۳۰۵ھ تا ۱۹۵۸ء، ۱۳۷۷ھ) اقبال، عبدالماجد دریا آبادی[4] (۱۸۹۲ء، ۱۳۱۰ھ تا ۱۹۷۷ء، ۱۳۹۷ھ) محمود شیرانی (۱۸۸۰ء تا ۱۹۴۶ء) اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ادبی تنقید کے میدان میں مولوی عبدالحق[5] (۱۸۷۰ء، ۱۲۸۷ھ تا ۱۳۸۱ھ) اور رشید احمد صدیقی ۱۸۹۲ء تا ۱۹۷۷ء) اور احتشام حسن (پیدائش ۱۹۱۲ء) کے نام نمایاں ہیں۔ بیسویں صدی کے پانچ سب سے بڑے غزل گو شاعر اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ھ تا ۱۹۳۶ء، ۱۳۵۵ھ) فانی بدایونی (۱۸۷۹ء تا ۱۹۱۴ء، ۱۳۶۰ھ)، حسرت موہانی ۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۱ء، ۱۳۷۰ھ) اور جگر مراد آبادی (۱۸۹۰ء تا ۱۹۶۱ء) اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقبال اور جوش ملیح آبادی (پیدائش ۱۸۹۴ء) نے اردو نظم کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ لیکن جہاں اقبال نے

---

(۱) سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی کے سلسلے کو جس کا آغاز شبلی نے کیا تھا چھ جلدوں میں مکمل کیا۔ ارض القرآن، سیرت نبوی پر خطبات، سیرت عائشہ، عمر خیام اور عربوں کی جہاز رانی ان کی علمی تحقیقات کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ علاوہ ازیں وہ دار المصنفین، اعظم گڑھ کے بانیوں میں سے ہیں یہ ادارہ ۱۹۱۵ء میں قائم ہوا تھا اور سید سلیمان ندوی نے اس کو اسلامی ہند کا سب سے بڑا علمی اور تحقیقی ادارہ بنا دیا۔ اس ادارے کی طرف سے اب تک ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۲) اشرف علی تھانوی اسلامی ہند کے سب سے کثیر التصانیف عالم ہیں۔ تفسیر، حدیث، منطق، کلام اور تصوف سے متعلق تقریباً ایک ہزار کتابوں اور کتابچوں کے مصنف تھے۔ قرآن کی تفسیر بیان القرآن ان کی سب سے اہم کتاب ہے۔ لیکن سب سے مقبول کتاب بہشتی زیور ہے جس میں انھوں نے عورتوں کے لیے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

(۳) ابوالکلام آزاد کا شمار ان علماء میں ہوتا ہے جو وسعت مطالعہ کے ساتھ وسعت نظر بھی رکھتے ہیں۔ بعض اختلافات سے قطع نظر ان کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' بہترین تفسیر ہے۔

(۴) عبدالماجد دریابادی صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز تھے، لیکن ان کا علمی پایہ بھی بہت بلند تھا۔ فلسفہ پر لکھنے کے علاوہ انھوں نے قرآن مجید کا اردو اور انگریزی دونوں میں ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی۔

(۵) مولوی عبدالحق کا نام انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہے جو ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ میں اردو کی ترقی کے لیے قائم کی گئی تھی، پاکستان بننے کے بعد یہ انجمن دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مولوی عبدالحق جو بہت شروع زمانے سے انجمن کے سکرٹری آرہے تھے تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہوگئے اور وفات تک انجمن کے سکرٹری اور انجمن کے رسالہ اردو کے اڈیٹر رہے۔ انجمن نے قیام پاکستان سے قبل اردو میں بعض بہترین کتابیں شائع کیں۔

اپنی شاعری کو اعلیٰ خیالات اور افکار کا ترجمان بنایا وہاں جوش نے جنس پرستی اور اباحت کے فروغ میں اچھا خاصا حصہ لیا۔ اختر شیرانی (۱۹۰۵ء تا ۱۹۴۸ء) نے رومانی شاعر کی حیثیت سے انفرادیت قائم کی۔ دوسرے نظم گو شاعروں میں احسان دانش (۱۹۱۲ء) نے مزدوروں اور غریب طبقہ کے ترجمان کی حیثیت سے اور حفیظ جالندھری (پیدائش ۱۹۰۰ء) نے اپنے گیتوں کے ذریعہ اردو شاعری میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ اگرچہ حفیظ شاہنامہ اسلام کے مصنف بھی ہیں لیکن اردو ادب میں ان کا مقام گیتوں اور چند طویل نظموں کی وجہ سے زندہ جاوید رہے گا۔

ناول، افسانہ، اور ڈرامہ نئی اصناف ادب ہیں جن کا آغاز اردو ادب میں ہوا۔ ان میں ناول کا آغاز پچھلی صدی میں ڈپٹی نذیر احمد کر چکے تھے لیکن افسانے اور ڈرامے کا آغاز موجودہ صدی کے آغاز میں ہوا۔ ویسے یہ تینوں اصناف ادب اپنے عروج پر موجودہ صدی کے نصف اول یعنی زیر بحث دور ہی میں پہنچیں۔ اردو کے یہ جدید ناول اور افسانے اپنی تکنیک کے لحاظ سے مکمل ہیں اور ان میں سے بعض معیار میں مغرب کی سطح تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن ڈرامے کو اتنی ترقی نہیں دی جا سکی۔ ناول نگاروں میں راشد الخیری (۱۸۶۸ء تا ۱۹۳۶ء) اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انھوں نے عورتوں کے مسائل اور دکھ درد کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ لیکن ان کی تحریروں میں امید نظر نہیں آتی۔ رنج و غم کی کثرت ہے جس کی وجہ سے وہ مصورِ غم کہلائے۔ فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۴ء تا ۱۹۴۷ء) عظیم بیگ چغتائی (متوفی ۱۹۴۱ء) اور پطرس بخاری (۱۸۹۸ء تا ۱۹۵۸ء) اس دور کے سب سے بڑے مزاحیہ نگار تھے۔ افسانہ نویسوں میں سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰ء تا ۱۹۴۰ء) علی عباس حسینی (پیدائش ۱۸۹۹ء)، سلطان حیدر جوش (پیدائش ۱۸۸۶ء) اور سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء تا ۱۹۵۵ء) کے نام صف اول میں ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے صرف رومانی افسانے ہی نہیں لکھے بلکہ معاشرے کے مسائل بھی زیر بحث لائے۔ لیکن اس دور کے بعض افسانہ نگاروں اور شاعروں کی فکر پر مغربی یا اشتراکی تصورات کا غلبہ ہے۔ ان میں عہد سرسید کے ادیبوں اور شاعروں کے برخلاف اسلامی شعور کا فقدان نظر آتا ہے بلکہ کبھی کبھی اسلامی اقدار سے بغاوت بھی نظر آتی ہے۔

اردو کی ترقی میں ہندو اور سکھ ادیبوں نے بھی بہت اہم حصہ لیا۔ ہندو شاعروں میں چکبست (۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۶ء) تلوک چند محروم (۱۸۸۷ء تا ۱۹۶۵ء) آنند نرائن ملا (پیدائش

۱۹۰۱ء) فراق گورکھپوری (پیدائش ۱۸۹۶ء) اور ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں پریم چند (۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء) کرشن چندر آنجہانی، راجندر سنگھ بیدی کنہیالال کپور اور اپندر ناتھ اشک کے نام ممتاز ہیں۔

اردو میں ڈراما نگاری ابھی تک بلند مقام حاصل نہیں کرسکی۔ اردو ڈرامہ میں سب سے اہم نام آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۹ء تا ۱۹۳۵ء) کا ہے جو قیام پاکستان سے پہلے کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ریڈیائی ڈرامہ نے قابل قدر ترقی کی ہے۔

باب ۷

پاکستان: ایک نظریاتی مملکت

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء ۱۳۶۶ھ کو پاکستان کی آزاد مملکت کا قیام اسلامی تاریخ کا ایک عہد آفریں واقعہ ہے۔ یہ ملک کسی لسانی، نسلی یا وطنی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا، بلکہ اسلامی فکر اور مسلم قومیت اس کے وجود کا باعث بنی۔ اس لحاظ سے پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اور اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد اس نئے ملک کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بھارت کو تو بنی بنائی حکومت مل گئی لیکن پاکستان میں سارا انتظامی ڈھانچہ نئے سرے سے قائم کرنا پڑا کراچی میں پاکستان کا دارالحکومت قائم کیا گیا۔ دن رات کام کر کے سرکاری دفتروں کے لیے عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ فوجوں کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی نیا سکہ جاری کیا گیا اور ملک کی مالیات کا انتظام کرنے کے لیے دولت پاکستان بنک قائم کیا گیا۔

تنظیم مملکت کا یہ کام زیادہ مشکل نہ ہوتا لیکن بدقسمتی سے بھارت اور پاکستان کے کئی حصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے شروع ہو گئے، بھارتی پنجاب اور پاکستان پنجاب میں ان جھگڑوں نے بڑی خوفناک شکل اختیار کر لی بھارتی پنجاب یا مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے ایک منظم تحریک کے ذریعہ جس کو در پردہ سرکاری تحفظ بھی حاصل تھا۔ مسلمانوں پر ایسے ظلم کیے کہ ان کا مشرقی پنجاب میں رہنا ناممکن ہو گیا، پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف کسی قسم کی کوئی تحریک اور تنظیم نہیں تھی لیکن یہاں بھی جوابی اور انتقامی کارروائی کے طور پر مسلمانوں نے کئی علاقوں میں یہی غلط طریقہ اختیار کیا اس نازک فرقہ وارانہ صورت حال کو دیکھ کر پاکستان اور بھارت کی حکومت نے طے کیا کہ دونوں صوبوں کے مسلم اور غیر مسلم باشندوں کا تبادلہ کر دیا جائے، اس تبادلے میں تقریباً سال بھر لگ گیا، تقریباً چالیس لاکھ ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے اور اس سے زیادہ مسلمان پاکستان آ گئے۔ پنجاب کے علاوہ بھارت کے دوسرے حصوں

سے بھی مسلمان مہاجر پاکستان آئے۔ اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ لوگوں کی اس وسیع پیمانے پر نقل مکانی نے پاکستان کی معیشت کو بری طرح متاثر کیا۔ اور مہاجرین اور بے گھر لوگوں کی آبادکاری کا مسئلہ پوری طرح حل کرنے میں ۲۵ سال لگ گئے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس نقل مکانی، اور تبادلہ آبادی سے اچھے نتیجے نکلے، مسلمانوں کا تناسب پاکستان میں پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گیا اور پاکستان کو تعلیم یافتہ لوگ، ماہر کاریگر، تاجر اور صنعت کار مل گئے جن کی پاکستان میں بہت کمی تھی۔

مہاجرین کی آبادکاری کے علاوہ پاکستان کو ابتدائی دنوں میں کشمیر کے مسئلہ کی وجہ سے بھی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہ مسئلہ صوبہ پنجاب کی غلط تقسیم کی وجہ سے پیدا ہوا، قیام پاکستان کے وقت صوبہ پنجاب اس غلط طریقے سے تقسیم کیا گیا کہ ایک طرف تو پاکستان کو سیراب کرنے والی نہروں کے سرچشمے بھارت میں رہ گئے اور دوسری طرف مسلم اکثریت کے ضلع گورداسپور کو بھارت میں دے دینے کی وجہ سے بھارت کی سرحد ریاست کشمیر سے مل گئی جو مسلم اکثریت کا علاقہ ہے اور جسے اصولاً پاکستان میں شامل ہونا چاہیے، پاکستان قائم ہونے کے چند ہی دنوں بعد کشمیر کے مسلمان وہاں کے راجہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، آزادی کی اس تحریک کو کچلنے کے لیے راجہ نے بھارتی حکومت سے مدد مانگی اور بھارتی حکومت اس شرط پر مدد دینے کے لیے تیار ہوگئی کہ راجہ ریاست کشمیر کو بھارت میں شامل کردے۔ اس طرح راجہ اور بھارتی حکومت کی سازش سے کشمیر کو ہندوستان میں شامل کرلیا گیا۔ بھارتی فوجوں کی مداخلت کی وجہ سے پاکستان کو بھی کشمیر میں مداخلت کرنا پڑی اور پاکستانی فوجیں کشمیر کے ایک تہائی حصے کو بھارت کے قبضے میں جانے سے بچانے میں کامیاب ہوگئیں۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو دونوں ملکوں نے کشمیر میں لڑائی بند کرنے کا فیصلہ کیا، بھارت نے اقوام متحدہ میں وعدہ کیا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ استصواب رائے یعنی اہل کشمیر کی رائے معلوم کرکے کیا جائے گا اور یہ کہ یہ استصواب بین الاقوامی نگرانی میں ہوگا۔ لیکن بھارت نے اس وعدے کو آج تک پورا نہیں کیا، جس کی وجہ سے یہ مسئلہ پاکستان اور بھارت کے درمیان آج تک جھگڑے کی بنیاد بنا ہوا ہے۔

لیاقت علی خان (۱۸۹۶ء تا ۱۹۵۱ء)

پاکستان ابھی تقسیم ہند سے پیدا ہونے والے مسائل میں الجھا ہوا تھا کہ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا جو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بھی تھے ۱۱۔ستمبر ۱۹۴۸ء، ۱۳۶۷ھ کو انتقال ہوگیا۔ وہ چونکہ ملک کی سب سے بااثر شخصیت تھے اس لیے قیام پاکستان کے بعد اتنی جلدی ان کی وفات کا پاکستان کے مستقبل پر گہرا اثر پڑا۔ مسلم لیگ کے مختلف گروہوں کے درمیان پائے جانے والے وہ اختلافات جو قائداعظم کی زبردست شخصیت کی وجہ سے دبے ہوئے تھے ان کی وفات کے بعد ابھرنا شروع ہوگئے۔ قائداعظم کے بعد ان کی جگہ مشرقی پاکستان کے ممتاز رہنما اور مشرقی پاکستان کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین (۱۸۹۴ء، ۱۳۱۲ھ تا ۱۹۶۴ء، ۱۳۸۴ھ) کو پاکستان کا دوسرا گورنر جنرل منتخب کیا گیا۔ لیاقت علی خاں بدستور وزیراعظم رہے۔

نوابزادہ لیاقت علی خاں جنھوں نے قائداعظم کی وفات سے پیدا ہونے والے خلاء کو جلد ہی بڑی کامیابی کے ساتھ پُر کردیا۔ دہلی کے قریب موجودہ صوبے ہریانہ کے ضلع کرنال میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۱۸ء میں بی۔اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ۱۹۲۱ء میں ایم۔اے اور اگلے سال بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ وطن واپس آنے کے بعد انھوں نے صوبہ اُتر پردیش (یوپی) کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ۱۹۲۶ء میں صوبے کی اسمبلی کے رکن اور ڈپٹی اسپیکر منتخب ہوگئے۔ جب قائداعظم نے کل ہند مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کیا تو ان کی تجویز پر لیاقت علی خاں کو ۱۲۔اپریل ۱۹۳۶ء، ۱۳۵۵ھ کو مسلم لیگ کا جنرل سکرٹری منتخب کیا گیا اور وہ قیام پاکستان تک اسی منصب پر فائز رہے۔ لیاقت علی خاں، قائداعظم کے سب سے قابل اعتماد ساتھی تھے اور تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے میں قائداعظم کے بعد سب سے زیادہ ان ہی کا حصہ تھا۔ ۱۹۴۰ء میں لیاقت علی خان برطانوی ہند کی مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ آزادی سے پہلے جب ۱۹۴۶ء میں آخری برطانوی وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سربراہی میں دہلی میں عارضی حکومت قائم کی گئی تو لیاقت علی خاں کو اس میں وزیر خزانہ کا منصب ملا اور انھوں نے ایک ایسا بجٹ پیش کیا جسے تمام طبقوں اور فرقوں نے غریبوں کا بجٹ

کہہ کر سراہا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں لیاقت علی خان پاکستان کے پہلے وزیر اعظم منتخب ہوئے ان کی وزارت کے زمانے میں مہاجرین کے مسائل کشمیر کے تنازعہ اور ان تمام رُکاوٹوں کے باوجود جو بھارت نے پاکستان کی راہ میں پیدا کیں، پاکستان ترقی کو منزل پر گامزن رہا، صنعتی ترقی کی داغ بیل ڈالی گئی اور بیرونی تجارت کو فروغ دیا گیا، بری، بحری اور ہوائی فوجوں کو ترقی دی گئی۔ پاکستان کے قیام کے وقت ہندوستان کے رہنما یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان زیادہ عرصہ قائم نہیں رہے گا اور بالآخر بھارت میں شامل ہو جائے گا، لیکن لیاقت علی خاں کے مختصر دورِ حکومت میں پاکستان نے سیاسی، معاشی اور فوجی لحاظ سے اس قدر قوت اور استحکام حاصل کر لیا کہ بین الاقوامی دنیا میں اس کی ساکھ قائم ہوگئی اور بھارتی رہنماؤں کا یہ خیال غلط ثابت ہوگیا کہ پاکستان قائم نہ رہ سکے گا۔

لیاقت علی خان کے دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ایک آزاد خارجہ پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی، اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پاکستان نے اشتراکی چین کی حکومت کو تسلیم کیا اور چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی تجویز کی حمایت کی، اسی زمانے میں کوریا میں اشتراکی اور امریکی مفاد نے جنگ کی شکل اختیار کر لی لیکن پاکستان نے خود کو اس کشمکش سے الگ رکھنے کی کوشش کی اور اقوام متحدہ میں اس امریکی قرارداد پر کوئی رائے نہیں دی جس میں چین کو حملہ آور قرار دیا گیا تھا۔ لیاقت علی خاں نے اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش بھی کی اور اس مقصد سے کراچی میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس طلب کی۔

نوابزادہ لیاقت علی خان کو اپنی وزارت کے زمانے میں جن گوناگوں مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان میں ایک پیچیدہ مسئلہ پاکستان کے آئین کا تھا۔ پاکستان کو جس وقت آزادی ملی تو اس کی آئینی حیثیت ایک برطانوی نوآبادی کی تھی اور گورنر جنرل جو پاکستان کا سربراہ تھا آئینی طور پر تاج برطانیہ کا نمائندہ تھا۔ یہ بات پاکستان کی مکمل آزادی کے منافی تھی۔ پاکستان بنانے کا ایک بڑا مقصد ایسی حکومت قائم کرنا تھا جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔ لیکن اس سلسلے میں عوام کے دباؤ کے باوجود حکومت نے اب تک کوئی آئینی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ یہ قدم بالآخر ۱۲۔ مارچ ۱۹۴۹ء، ۱۳۶۸ھ کو اس وقت اٹھا لیا گیا جب دستور ساز اسمبلی نے لیاقت علی خاں کی پیش کردہ قرارداد

مقاصد کو منظور کر لیا۔

قرارداد مقاصد

اس قرارداد میں واضح طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور اہل پاکستان کی طرف سے اقتدار کا استعمال ایک مقدس امانت ہے اور یہ کہ پاکستان کی حکومت کتاب وسنت کے مطابق کام کرے گی۔ قرارداد مقاصد نہ صرف پاکستان بلکہ اسلامی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کو لیاقت علی خاں کے دور حکومت کے اہم ترین کارناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ خود لیاقت علی خان نے اس قرارداد کو حصول آزادی کے بعد پاکستان کی سیاسی زندگی کا اہم ترین واقعہ قرار دیا۔ اب تک اسلامی ملکوں کے آئین میں زیادہ سے زیادہ جس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا وہ یہ ہوتی تھی کہ ریاست کا مذہب اسلام ہوگا۔ لیکن قرارداد مقاصد میں پہلی مرتبہ اللہ کی حاکمیت کا اعتراف کیا گیا اور قوانین اور زندگی کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھالنے کا عہد کیا گیا۔ اس قرارداد کی مخالفت مسلمان ارکان اسمبلی میں صرف کمیونسٹ رہنما میاں افتخار الدین نے کی۔

قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد اصل آئین کی تیاری کا کام شروع ہوگیا۔ لیکن ابھی یہ کام جاری تھا کہ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء، ۱۳۷۱ھ کو لیاقت علی خان کو جبکہ وہ راولپنڈی کے ایک عام جلسے میں تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہورہے تھے ایک شخص نے گولی مار کر شہید کردیا۔ قتل کی وجہ آج تک نہیں معلوم ہوسکی لیکن عام طور پر یہی سمجھا گیا کہ وزیر اعظم کا یہ قتل سیاسی نوعیت کا تھا اور بعض سیاسی رہنماؤں کی طرف سے حصول اقتدار کی کشمکش کا نتیجہ تھا اور اسی وجہ سے معاملے کو دبا دیا گیا اور تحقیقاتی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

عدم استحکام کا دور (۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء تا ۱۳۷۸ھ ۱۹۵۸ء)

نوابزادہ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد پاکستان کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس کو ہم عدم استحکام کا دور کہہ سکتے ہیں۔ قائد اعظم کا انتقال پاکستان بننے کے ایک سال بعد ہی ہوگیا تھا۔ تین سال بعد لیاقت علی خاں بھی چل بسے۔ اس طرح پاکستان اپنے نازک ابتدائی دور میں دو سب سے بڑے اور بااثر رہنماؤں سے محروم ہوگیا۔ اس کا ملک کے مستقبل پر

بہت برا اثر پڑا۔ ملک میں ایسا رہنما نہ ہونے کی وجہ سے جس کا عوام پر اثر ہو اور جو عوام میں مقبول ہو، ملک میں اندرونی اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ قائداعظم کے بعد مشرقی پاکستان کے ممتاز مسلم لیگی رہنما خواجہ ناظم الدین (۱۸۹۴ء، ۱۳۱۲ھ تا ۱۹۶۴ء، ۱۳۸۴ھ) گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے، اب لیاقت علی خاں کے انتقال کے بعد انھوں نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا اور وزیر خزانہ غلام محمد کو گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ غلام محمد اپنے عہدے کی بزرگی اور غیر جانبداری کو قائم نہ رکھ سکے۔ اور انھوں نے سازشوں کا ایک جال پھیلا دیا۔ انھوں نے اپنے اختیارات سے غلط فائدہ اٹھا کر وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو اپریل ۱۹۵۳ء میں ان کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ جوڑ توڑ کی اس سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں کئی سال تک کوئی مضبوط حکومت قائم نہ ہو سکی اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک پانچ سال کے عرصے میں پانچ وزیر اعظم مقرر ہوئے اور برطرف ہوئے، اس سیاسی انتشار کی وجہ سے پاکستان کی اندرونی حالت خراب ہو گئی، اور بیرونی ملکوں میں اس کی وہ ساکھ ختم ہو گئی جو ابتدائی سالوں میں پیدا ہو گئی تھی۔

گورنر جنرل غلام محمد کا دوسرا اقدام جس سے ملک کو سخت نقصان پہنچا، یہ تھا کہ انھوں نے ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء، ۱۳۷۴ھ کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ یہ کام انھوں نے ایک ایسے موقع پر کیا جبکہ پاکستان کا نیا دستور سب کے اتفاق سے تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ غلام محمد نے یہ اسمبلی محض اس وجہ سے توڑی کہ اسمبلی کے ارکان گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنا چاہتے تھے۔

گورنر جنرل کی ان غیر جمہوری کارروائیوں کی وجہ سے ملک کی سیاست میں سازش جوڑ توڑ اور خود غرضی کا دور دورہ ہو گیا، اور مسلم لیگ کی مضبوط تنظیم جس نے پاکستان قائم کیا تھا ایک بے اثر جماعت بن کر رہ گئی، لوگ مسلم لیگ سے نکلتے گئے اور انھوں نے نئی نئی سیاسی جماعتیں بنا لیں نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں کوئی ایسی جماعت نہ رہی جسے پورے ملک کا اعتماد حاصل ہو۔

پہلا آئین

۲۸۔ مئی ۱۹۵۵ء، ۱۳۷۴ھ کو گورنر جنرل نے نئی دستور ساز اسمبلی قائم کی، اس اسمبلی کے ارکان کا انتخاب صوبائی اسمبلی نے کیا تھا اس اسمبلی نے نئے وزیر اعظم چوہدری محمد علی کی قیادت میں بہت جلد نیا دستور تیار کر لیا اور ۲۳۔ مارچ ۱۹۵۶ء، ۱۳۷۵ھ کو یہ نیا دستور نافذ بھی کر دیا گیا۔

نئے آئین کے تحت گورنر جنرل کا عہدہ ختم کر کے صدر کا عہدہ قائم کیا گیا اور پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا، غلام محمد چونکہ وفات پا چکے تھے اس لیے ان کے جانشین سکندر مرزا کو نئی جمہوریہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ اب ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت جسے پوری قوم کے اتفاق سے اختیار کیا گیا تھا ۱۹۵۹ء کے شروع میں عام انتخابات ہونے والے تھے لیکن پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں نے ملک کی بگڑتی ہوئی صورت حال کا بہانہ لے کر اکتوبر ۱۹۵۸ء ۱۳۷۸ھ میں آئینی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ اور ملک میں فوجی حکومت قائم کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کو نئے آئین کے تحت جمہوری حکومت کا تجربہ ہی نہ ہو سکا، خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد سے انقلاب ۱۹۵۸ء تک جو حکومتیں قائم رہیں وہ بھی اگرچہ حقیقی معنوں میں جمہوری حکومتیں نہ تھیں، کیونکہ وہ اندرونی سازشوں کے ذریعہ سے ظہور میں آتی تھیں لیکن پھر بھی پاکستان کا ظاہری ڈھانچہ جمہوری تھا، لیکن ۱۹۵۸ء میں مکمل درخت کی شکل اختیار کر گیا۔

عدم استحکام کے اس دور میں جو ۱۹۵۱ء، ۱۳۷۱ھ سے ۱۹۵۸ء ۱۳۷۸ھ تک رہا ملک کے داخلی اور خارجی معاملات میں کئی اہم تبدیلیاں ہوئیں، پاکستان جب قائم ہوا تھا تو مغربی پاکستان چاروں صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا گیا جو مغربی پاکستان کہلاتا تھا، اس کے علاوہ اردو اور بنگالی کو قومی زبانوں کی حیثیت دی گئی، ۱۹۵۴ء میں امریکہ سے باہمی امداد کا معاہدہ کیا گیا اور پاکستان میثاق جنوب مشرقی ایشیا کی تنظیم (سیٹو) اور معاہدہ بغداد میں شامل ہوا، یہ دونوں فوجی نوعیت کی تنظیمیں تھیں اور امریکہ اور برطانیہ نے ان کو روس اور چین کے جارحانہ مقاصد کی روک تھام کے لیے قائم کیا تھا۔ پاکستان کو اگرچہ ان مقاصد سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کی ہٹ دھرمی اور ہندوستان کے جارحانہ عزائم سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے پاکستان کو بیرونی سہارے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ پاکستان ان معاہدوں میں اس امید کے ساتھ شامل ہوا کہ ان کے ذریعہ ملک کو فوجی لحاظ سے مضبوط بنایا جا سکے گا اور اس میں شک نہیں کہ ان معاہدوں کی وجہ سے پاکستان کو فوجی اعتبار سے بہت فائدہ پہنچا، پاکستانی فوجوں کی جدید ترین انداز پر تنظیم ہوگئی، اور پاکستانی فوجیں جدید ترین اسلحہ سے بغیر کسی بڑے خرچ کے لیس کر دی گئیں، لیکن ان تنظیموں کی وجہ سے پاکستان کی وہ آزاد خارجہ پالیسی متاثر ہوئی جس کا آغاز لیاقت علی خان کے آخری دور میں کیا گیا تھا۔

پاکستان ۱۹۴۷ء میں غذائی پیداوار کے لحاظ سے خود مکتفی تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد غذائی پیداوار بڑھانے کی طرف سے غفلت کی گئی جس کی وجہ سے پاکستان کو بیرونی ملکوں سے غلّہ خریدنے پر مجبور ہونا پڑا، یہ غلہ قیمت دے کر بھی خریدا گیا اور بطور امداد بھی دیا گیا، خصوصاً امریکہ نے وسیع پیمانے پر امداد فراہم کی، لیکن فوجی امداد کی طرح غلّہ کی یہ امداد بھی پاکستان کو مغربی ممالک کے زیر اثر لانے کا ذریعہ بنی۔

عدم استحکام کے اس دور کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں صنعتی ترقی کی رفتار خاصی تیز رہی اور ملک میں بیشتر صنعتی منصوبوں کی بنیادیں اسی زمانے میں پڑیں، کپڑے، سیمنٹ اور چمڑے کی صنعت نے خاص طور پر بہت تیزی سے ترقی کی۔

صدر ایوب کا دور (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۹ء)

جنرل محمد ایوب خاں [1] نے حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ اور وہ آئین جس کو قوم نے منظور کیا تھا، منسوخ کر دیا۔ مارشل لاء تقریباً چار سال جاری رہا، اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں چند ماہروں کی مدد سے ایک نیا آئین تیار کروا کے نافذ کر دیا گیا۔ نئے آئین کے تحت ملک کی اسلامی حیثیت کو تو برقرار رکھا گیا لیکن نظام حکومت پارلیمانی کی بجائے صدارتی قرار دیا گیا اور صدر کو غیر معمولی اختیارات دیے گئے۔ اس آئین کے تحت بنیادی جمہوریت کا نظام قائم کیا گیا جس کے ذریعہ عوام کے منتخب شدہ نمائندوں کو مقامی بستیوں اور علاقوں کے انتظام میں شریک کیا گیا۔ صدر مملکت کو اور اسمبلیوں کے ارکان کو منتخب کرنے کا اختیار بھی بنیادی جمہوریت کے ارکان کو دیا گیا۔ اور اس طرح براہ راست عوام کے ذریعہ اسمبلی کے ارکان منتخب کرنے کی بجائے بالواسطہ انتخاب کے طریقے کو رائج کیا گیا، ملک کے تعلیم یافتہ طبقوں اور سیاسی رہنماؤں نے بنیادی جمہوریت کے اس نظام کی سخت مخالفت کی اور ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخاب میں انھوں نے قائداعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو ایوب خاں کے مقابلے میں اس امید کے ساتھ صدارتی

---

(۱) محمد ایوب خاں صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ کی بستی ریحانہ میں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے تھے انھوں نے انگلستان کی رائل ملٹری اکیڈمی سینڈھرسٹ میں فوجی تعلیم حاصل کی دوسری عالمی جنگ میں برما کے محاذ پر ایک بٹالین کی کمان کی پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۷ء میں میجر جنرل بنا دیے گئے، ۱۹۵۱ء میں وہ کمانڈر انچیف ہو گئے، پاکستانی فوج کی تنظیم جدید اور اعلیٰ تربیت بڑی حد تک ایوب خاں ہی کا کارنامہ تھا۔

امیدوار نامزد کیا کہ وہ کامیاب ہونے کے بعد پارلیمانی جمہوریت کا نظام بحال کر دیں گی، لیکن بنیادی جمہوریت کے غیر جمہوری نظام کے تحت محترمہ فاطمہ جناح کامیاب نہ ہوسکیں، بہر حال اس انتخابی جدوجہد نے یہ ثابت کر دیا کہ ملک میں صدر ایوب کے نظام حکومت کے خلاف شدید بے چینی پائی جاتی ہے۔

انتخابات کے بعد ۱۹۶۵ء میں پاکستان کو ہندوستان سے دو جنگیں لڑنا پڑیں۔ کشمیر کا مسئلہ اگرچہ دونوں ملکوں کے درمیان شروع سے جھگڑے کا باعث رہا ہے، لیکن ہندوستان کی تنگ نظری نے اور بھی چھوٹے چھوٹے مسئلے پیدا کر دیے ہیں، ان میں ایک مسئلہ رن کچھ کے علاقے کی حد بندی کا تھا یہ علاقہ چونکہ دلدلی ہے۔ اس لیے اس کی صحیح حد بندی نہیں ہوئی تھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ہندوستانی فوجوں نے ۱۹۶۵ء کے وسط میں بعض ایسے علاقوں پر قبضہ کر لیا جن پر پاکستان کا دعویٰ تھا ہندوستان کے اس اقدام کے جواب میں پاکستانی فوجوں کو جوابی کارروائی کرنا پڑی اور پاکستان نے جلد ہی سارے علاقے کو ہندوستانی فوجوں سے خالی کرا لیا اور ہندوستانی حکومت کو حد بندی کا پرامن فیصلہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا، اس فیصلے کی رُو سے جس میں برطانوی حکومت نے ثالثی کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۔ فروری ۱۹۶۸ء میں رن کچھ کے علاقے کی حد بندی کر دی گئی، فیصلہ کی رُو سے رن کچھ کا نوے فیصد حصہ ہندوستان کو ملا اور دس فیصد پاکستان کو۔

رن کچھ کی جنگ ختم ہوئے ابھی صرف دو ماہ گزرے تھے کہ ہندوستان نے ایک اور جنگ چھیڑ دی۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہندوستان مسئلہ کشمیر کو اہل کشمیر کی رائے سے طے کرنے کا پابند تھا۔ لیکن ہندوستان ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے استصواب رائے کو ٹالتا رہا۔ اس نے کشمیری رہنما شیخ عبداللہ کو کئی سال تک جیلوں میں بند رکھا۔ ہندوستان کے ان تاخیری حربوں نے کشمیری حریت پسندوں میں اتنی بے چینی پیدا کر دی کہ انھوں نے مقبوضہ علاقوں میں بغاوت کر دی، ہندوستانی حکومت کو رن کچھ کی جنگ میں ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے ایک موقعہ ہاتھ آ گیا۔ ہندوستانی فوجوں نے کشمیر میں جنگ بندی لائن پار کر کے آزاد کشمیر کے علاقوں پر حملے شروع کر دیے، اور حاجی پیر کے علاقے پر قبضہ بھی کر لیا۔ پاکستان کو آزاد کشمیر کی حفاظت کے لیے میدان میں آنا پڑا اور پاکستانی فوجوں نے ضلع میر پور کی طرف جنگ بندی لائن پار کر کے چھمب، جوڑیاں کے وسیع علاقے کو آزاد کرا لیا، ہندوستان نے جب کشمیر کو ہاتھ سے نکلتے دیکھا، تو ۶۔ ستمبر

۱۹۶۵ء کو بین الاقوامی سرحد پار کر کے لاہور پر حملہ کر دیا اور چند دن کے اندر اندر یہ جنگ مغربی پاکستان کے پورے محاذ پر پھیل گئی، جنگ تین ہفتے جاری رہی اور اقوام متحدہ کی مداخلت پر ۲۳۔ ستمبر کو جنگ بند کر دی گئی، تاکہ دونوں ملک اپنے اختلافات کو پر امن طریقہ پر طے کر سکیں، جنگ بندی کے فوراً بعد روس نے ثالثی کے فرائض سر انجام دیے اور تاشقند میں دونوں ملکوں کے نمائندوں کو جمع کر کے ۱۰۔ جنوری ۱۹۶۶ء کو ایک معاہدہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جو معاہدہ تاشقند کہلاتا ہے، اس معاہدے کے تحت دونوں ملکوں نے یہ عہد کیا کہ وہ آئندہ اپنے تمام جھگڑے بات چیت کے ذریعہ طے کریں گے، چنانچہ اس معاہدہ کے تحت ۲۸/ فروری تک دونوں ملکوں کی فوجوں نے اپنے اپنے مفتوحہ علاقے خالی کر دیے۔

پاکستان اور ہندوستان کی جنگ تاریخ پاکستان کا ایک زریں باب ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ جنگ جاری رہتی تو کیا ہوتا؟ آیا کشمیر پاکستان کے قبضے میں آجاتا یا پاکستان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے؟ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان نے جنگ کے دوران اپنی فوجی برتری کا واضح ثبوت دیا، ہندوستان اگرچہ پاکستان سے کئی گنا بڑا ملک ہے اور اس کی فوج کی تعداد بھی اسی نسبت سے زیادہ تھی، لیکن پاکستانی فوجوں نے نہ صرف یہ کہ ہر جگہ ہندوستانی حملہ آوروں کی پیش قدمی روک دی، بلکہ ہندوستان میں داخل ہو کر خاصے بڑے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا، اس ایک جنگ نے پاکستان کو جو شہرت اور نیک نامی دی وہ پچھلے اٹھارہ سال کی نشر و اشاعت سے بھی حاصل نہ ہو سکی تھی، اس سے بھی بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اہل پاکستان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا، اور ان کو اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔

عہد ایوبی میں تعمیر و ترقی

صدر ایوب کے دور حکومت کا ایک اہم واقعہ دارالحکومت کا کراچی سے اسلام آباد منتقل ہونا ہے، ۱۹۵۹ء میں راولپنڈی کو عارضی دارالحکومت قرار دیا گیا اور اس کے بعد راولپنڈی کے قریب اسلام آباد کے نام سے ایک نئے دارالحکومت کی تعمیر شروع کر دی گئی جس کے مکمل ہونے کے بعد حکومت پاکستان کے تمام دفاتر اسلام آباد منتقل ہو گئے۔

صدر ایوب کے عہد حکومت کا دوسرا اہم واقعہ سندھ طاس کے منصوبے کی تیاری اور تکمیل

ہے، نہری پانی کا مسئلہ مغربی پاکستان کے لیے موت و زندگی کا مسئلہ ہے، مغربی پاکستان کے بڑے حصے میں کاشتکاری کا انحصار نہری پانی پر ہے لیکن دریائے ستلج اور دریائے راوی سے نکلنے والی نہروں کے سرچشمے بھارتی علاقے میں رہ گئے تھے۔ اور بھارت ان دریاؤں سے اپنے علاقے کے لیے اتنا پانی لے لیتا تھا کہ پاکستان کے لیے ان نہروں میں پانی نہیں رہتا تھا، بھارت کے اس طرز عمل سے پاکستان کے لیے ان نہروں میں پانی نہیں رہتا تھا، بھارت کے اس طرز عمل نے پاکستان کی زراعت کو بڑا نقصان پہنچایا پاکستان کو آخر کار مجبور ہو کر ایک ایسا منصوبہ تیار کرنا پڑا جس کے تحت مغرب کے تین دریاؤں سندھ، جہلم اور چناب کا پانی ان نہروں میں منتقل کیا جاسکے۔ جن میں بھارتی علاقے سے پانی آتا تھا لیکن اس منصوبہ کا خرچ اتنا زیادہ تھا کہ تنہا پاکستان کے لیے منصوبے کی تکمیل ناممکن تھی، چنانچہ بین الاقوامی بنک اور دوسرے ملکوں کی مدد سے جن میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی قابل ذکر ہیں، بھارت اور پاکستان کے درمیان ۱۹۔ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ایک معاہدہ ہوگیا، اس معاہدے کے تحت جو سندھ کے طاس کا معاہدہ کہلاتا ہے پاکستان اور بھارت کو دیے جانے والی پانی کی مقدار مقرر کر دی گئی اور پاکستان کے لیے ایک متبادل نہری نظام کا منصوبہ تیار کیا گیا جو دریائے سندھ کے طاس کا منصوبہ[1] کہلاتا ہے، یہ دنیا کے عظیم ترین منصوبوں میں سے ہے اور ۱۹۷۰ء تک اس کا بیشتر حصہ تقریباً پانچ ارب روپے کے خرچ سے مکمل ہو چکا ہے، اس رقم کا بڑا حصہ امریکہ، برطانیہ و بھارت اور دوسرے ملکوں نے قرض اور امداد کی شکل میں فراہم کیا ہے۔

صدر ایوب کے دور حکومت کا ایک اور اہم کارنامہ علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم کا قیام ہے، یہ تنظیم جس کو انگریزی میں، آر، سی، ڈی کہا جاتا ہے ۱۹۶۴ء میں معاہدہ استنبول کے تحت قائم کی گئی ہے اور اس کا مقصد پاکستان، ایران اور ترکی کے درمیان ترقیاتی کاموں میں تعاون کو فروغ دینا ہے اس سے پہلے میثاق بغداد یا میثاق مرکزی (سیٹو) بھی ان ملکوں کے درمیان ایک

---

(۱) اس منصوبے کو منصفانہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس کے ذریعہ پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے تین دریاؤں کا پانی ہندوستان کو دیا گیا ہے اور صرف دو دریاؤں چناب اور جہلم کا پانی پاکستان کو ملا ہے، حالانکہ مشرقی پنجاب کے مقابلہ میں مغربی پنجاب کا رقبہ بھی زیادہ ہے۔ اور مشرقی پنجاب کے مقابلے میں یہاں بارش بھی کم ہوتی ہے، علاوہ ازیں دریائے راوی، جس کا پانی ہندوستان کو دے دیا گیا ہے قطعی پاکستانی دریا ہے اور ہندوستان میں صرف دو ضلعے اس سے سیراب ہوتے ہیں، سندھ کو پنجاب کا دریا نہیں کہا جاسکتا اور اس کے پانی پر صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ کا بھی حق ہے۔

طرح کے تعاون کا معاہدہ تھا لیکن میثاق مرکزی ایک فوجی معاہدہ تھا اور اس سے امریکہ اور برطانیہ کا مفاد وابستہ تھا، پاکستان نے اس میثاق میں محض اس وجہ سے شرکت کی تھی کہ پاکستان اور مغربی ملکوں کے مفاد ہم آہنگ ہو گئے تھے علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم قائم کر کے پاکستان نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ایک ایسی تنظیم قائم کرنے میں مدد کی جو بیرونی اثرات سے آزاد ہے اور جس کا مقصد تین اسلامی ملکوں کے درمیان تاریخی دوستی اور تعاون کو فروغ دینا ہے، علاقائی تعاون کی یہ تنظیم اسلامی ملکوں کے درمیان اتحاد کی طرف ایک اہم قدم ہے، اور اس تنظیم کے تحت پاکستان، ایران اور ترکی کئی صنعتی منصوبوں کو مل کر مکمل کر رہے ہیں۔

خارجہ پالیسی

صدر ایوب کے دور حکومت کا ایک اور اہم واقعہ خارجہ پالیسی میں تبدیلی ہے۔ لیاقت علی خاں مرحوم کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی بڑی حد تک مغربی ملکوں کے زیر اثر آ گئی تھی، ایوب خاں کے دور میں یہ اثرات اور زیادہ بڑھ گئے، اور پاکستان اپنے دفاعی اور معاشی معاملات میں بڑی حد تک مغربی ملکوں کا محتاج ہو گیا، لیکن ایوب خاں کے آخری دور میں یہ پالیسی بدل دی گئی۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان باہمی امداد کا معاہدہ ہوا تھا اور اس معاہدے کے تحت امریکہ نے پاکستان کو یہ ضمانت دی تھی کہ اگر پاکستان پر کوئی حملہ ہوا تو امریکہ پاکستان کی ہر طرح امداد کرے گا، اس وقت تک پاکستان کو امریکہ کا بہت بڑا حلیف سمجھا جاتا تھا اور پاکستان کو امریکہ نے جو فوجی اور معاشی امداد فراہم کی تھی، اس کے بدلے میں پاکستان نے امریکہ کی خارجی پالیسیوں کا اس حد تک ساتھ دیا کہ پاکستان اپنے پڑوسی ملکوں تک سے جن میں چین اور روس قابل ذکر ہیں، قریبی تعلقات قائم نہ کر سکا، پاکستان نے یہ موقف خود کو ہندوستان سے محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کیا تھا لیکن ۱۹۶۲ء میں جب چین اور ہندوستان کے درمیان سرحدی جھڑپیں شروع ہوئیں تو امریکہ نے ہندوستان کو فوجی اور معاشی امداد فراہم کرنا شروع کر دی پاکستان سے متعلق ہندوستان کے عزائم کے پیش نظر ہندوستان کا اس طرح مضبوط ہونا کسی طرح پاکستان کے لیے مفید نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اہل پاکستان نے امریکہ کی اس نئی پالیسی کو سخت ناپسند کیا اور اس وقت سے دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہونا شروع ہو گئی اور پاکستان نے چین روس اور دوسرے

اشتراکی ملکوں سے قریبی تعلقات قائم کرنا شروع کر دیے، ۱۹۶۵ء میں جب ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کیا تو امریکہ پاکستان کا حلیف تھا، لیکن امریکی حکومت نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کو کوئی مدد نہیں دی بلکہ ہندوستان کو حملہ آور بھی قرار نہیں دیا، اپنے ایک حلیف کے اس طرز عمل سے اہل پاکستان کو بڑی مایوسی ہوئی، گو ۱۹۵۶ء ہی سے پاکستان میں غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کی ابتدا ہو چکی تھی، لیکن اس جنگ کے بعد پاکستان نے واضح طور پر غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کر لی، اور چین اور روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں سے نہ صرف دوستانہ تعلقات قائم کیے، بلکہ وسیع پیمانے پر معاشی تعلقات بھی قائم کیے، ۱۹۶۹ء میں پشاور کا امریکی فضائی اڈہ اسی پالیسی کے تحت ختم کر دیا گیا۔

جبر و استبداد

ایوب خاں کے دور صدارت کے متعلق بعض حلقوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دور امن و امان اور تعمیر و ترقی کا دور تھا، ملک ہر قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے پاک رہا اور بیرونی دنیا میں پاکستان کی ساکھ قائم ہو گئی اس میں شک نہیں کہ ایوب خاں کے دور میں تعمیر و ترقی کا کام وسیع پیمانہ پر ہوا۔ صنعتوں نے بہت ترقی کی خصوصاً کپڑے کی صنعت پورے عروج پر پہنچ گئی لیکن جب ہم ایوب خاں کے دس سالہ دور حکومت پر گہری نظر ڈالتے ہیں تو یہ رائے بہت سطحی نظر آتی ہے اس میں شک نہیں کہ ایوب خاں کا دور اندرونی ہنگامہ آرائیوں، ہڑتالوں اور سیاسی جماعتوں کی حریفانہ کشمکش سے خالی تھا، لیکن یہ امن و سکون جبر و استبداد کا نتیجہ تھا، یہ زبردستی تھوپا گیا تھا، یہ حقیقی سکون نہیں تھا بلکہ قبر کا سکون تھا، ایوب خاں اپنے عزائم میں کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں لیکن انھوں نے ڈنڈے کے زور سے حالات سدھارنے کی جو کوشش کی اس کے نتائج اچھے نہیں نکلے، شروع میں کئی سال تک سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں رہیں، بعد میں جب سیاسی جماعتیں بحال ہوئیں تو ان کو مکمل آزادی نہیں دی گئی، بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے ذریعہ سرکاری جماعت مسلم لیگ نے حکومت کی مدد سے اپنی گرفت اتنی مضبوط کر لی تھی کہ اسی کی آواز کو ملک کی آواز سمجھا جاتا تھا حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف تھی، حکومت نے اپنی طاقت کے بل پر تمام سیاسی رہنماؤں کو جن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے پاکستان بنایا تھا اور وہ لوگ بھی شامل تھے جو ملک کی اصلاح کے لیے انتھک جدوجہد کر رہے تھے، خود غرض اور مفاد پرست قرار دیا۔ اور صدر ایوب کے حامیوں

نے ان کو تاریخ اسلام کی عظیم ترین [1] شخصیت قرار دیا۔ سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی گئیں اور اخبارات پر سنسر قائم کر کے ان کی زبان بندی کر دی گئی اور ملک کے بیشتر اخباروں کو سرکاری انتظام میں لے لیا گیا۔ اس آمرانہ طرز حکومت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی قدر بڑھ گئی جو حکومت کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اور صدر ایوب کے گرد عہد قدیم کے بادشاہوں کی طرح خوشامد پسند لوگ جمع ہو گئے، پھر جس طرح حکومت کے حامیوں نے سیاسی اجارہ داری قائم کر لی تھی، اسی طرح انھوں نے معاشی اجارہ داری بھی قائم کر لی۔ پسندیدہ لوگوں کو کاروبار اور صنعت وحرفت کے ادارے قائم کرنے کی سہولتیں دی گئیں اور ان کو اس قدر مراعات دی گئیں کہ عوام کے مفاد کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ ملک نے اس طرح صنعتی ترقی ضرور کی لیکن دولت چند ہاتھوں میں جمع ہوگئی اور غریب اور متوسط درجے میں بے چینی بڑھتی چلی گئی، گرانی نے ان کی کمر توڑ دی، عوام کی آواز کمزور ہو جانے کی وجہ سے رشوت ستانی اور بدعنوانیوں میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا۔

نظریہ پاکستان پر ضرب

صدر ایوب کے دور حکومت کا سب سے نقصان دہ پہلو یہ تھا، کہ اسلام اور نظریہ پاکستان کی بنیادیں ہل گئیں۔ اسلامی تعلیمات کو عملی شکل دینے میں پچھلی حکومتوں نے بھی تغافل سے کام لیا تھا لیکن سیاسی آزادی ہونے کی وجہ سے یہ حکومتیں عوام کی گرفت سے بالکل آزاد نہیں تھیں، اور کوئی ایسا قدم اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھیں جو مسلمانوں کو ناراض کر دے۔ صدر ایوب کی حکومت نے اپنی آمرانہ حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس معاملے میں زیادہ آزادی سے کام لیا اور اسلام کی من مانی تعبیر شروع کر دی، علماء کی متفقہ مخالفت کے باوجود ایسے عائلی قوانین نافذ کر دیے گئے جن میں واضح خامیاں تھیں اور جن میں اسلامی روح سے زیادہ مغربی روح کارفرما تھی،

---

(1) چنانچہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے جو اس وقت وزیر صنعت تھے پاکستان انیول (pakistan annual) میں لکھا تھا۔
صدر ایوب خاں اس لحاظ سے ہماری قومی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے کہ انھوں نے قوم کو طوائف الملوکی اور بدنظمی سے نجات دلائی۔ یہ تاریخ ساز شخصیت ہمارے لیے ابراہام لنکن سے بڑھ کر ہے، لینن سے بڑھ کر ہے، لینن سے بلند تر ہے۔ ایوب خاں ہمارے لیے اتاترک کا درجہ رکھتے ہیں، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی طرح ہیں۔ (ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور ۳۴۔ اگست ۱۹۷۰ء)

خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام نے بھی متعدد اخلاقی خرابیاں پیدا کیں اور اس سے فائدہ اتنا نہیں ہوا جتنا سرمایہ ضائع ہوا۔ حکومت نے اپنے نظریات کی من مانی تشریح کے لیے تحقیقات اسلامی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، عائلی قوانین اور خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق تو اختلاف رائے ہوسکتا تھا لیکن اس ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمن نے اپنی تحریروں سے اسلام کے بنیادی احکام کے بارے میں بھی شکوک پیدا کرنے شروع کر دیے۔ ایوب خاں کے آخری دور میں ان کے نظام حکومت کے خلاف جو بے چینی پیدا ہوئی اس میں ڈاکٹر فضل الرحمن کی ان تحریروں کا بھی بڑا حصہ تھا، اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے اور پاکستان کی اسلامی بنیادوں سے تغافل برتنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں ان عناصر کو تقویت حاصل ہوگئی جو لادینی یا سیکولر نظام کے حامی تھے چونکہ بیس سال تک پاکستان میں اسلام کا نام تو لیا گیا لیکن اسلام پر عمل نہیں کیا گیا اس لیے ان عناصر کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ پاکستان کی مشکلات کا حل اسلام نہیں بلکہ سوشلزم ہے اسلام کی بنیاد کمزور ہو جانے کی وجہ سے صوبائی عصبیت کو بھی فروغ ہوا اور ملک میں جئے بنگال اور جئے سندھ کے نعرے بلند ہونے لگے، ان عناصر کو اس لیے بھی تقویت ہوئی کہ صدر ایوب کے دور حکومت میں اسلام پسند عناصر کو کمزور کرنے کے لیے ان تمام صحافیوں مصنفوں اور ادیبوں اور دانشوروں کی دل کھول کر سرپرستی کی گئی جو پاکستان میں اسلامی نظام کو عملی شکل دینے کے خلاف تھے۔

مشرقی پاکستان میں احساس محرومی

ایوب خاں کے صدارتی اور آمرانہ طرز حکومت سے ایک اور بڑا نقصان یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان کے احساس محرومی میں اور اضافہ ہوگیا۔ مشرقی پاکستان کو لوٹنے اور کھسوٹنے کے الزامات تو مبالغہ آمیز کہے جاسکتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب سے خواجہ ناظم الدین کو غلام محمد نے غیر آئینی طریقے سے وزارت عظمیٰ سے ہٹایا تھا مشرقی پاکستان میں یہ احساس بڑھتا جارہا تھا کہ مغربی پاکستان کے لوگ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو جو ملک کی آبادی کا ۵۴ فیصد تھے اقتدار میں برابر کا شریک نہیں کرنا چاہتے اور اس صوبے پر اپنی مرضی تھوپنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ الزام بے بنیاد نہیں معلوم ہوتا۔ بے شک مشرقی پاکستان کی ترقی پر اس تمام عرصے میں کافی توجہ دی گئی، لیکن مشرقی پاکستان کو آئینی طریقے سے کبھی اقتدار میں نہیں آنے دیا

گیا۔ مغربی پاکستان کی نوکر شاہی نے فوج سے سازش کر کے اور اس کا سہارا لے کر اقتدار ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھا جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے لوگ اپنے صوبے کو مغربی پاکستان کی نو آبادی سمجھنے لگے۔ اس احساس کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں ہونے والے ترقی کے ہر کام کو مشکوک نظروں سے دیکھا گیا اور ان کاموں کو مشرقی پاکستان کو خوش رکھنے کی پالیسی سمجھا گیا۔ ایوب خان کے صدارتی اور آمرانہ نظام نے ان شکوک میں مزید اضافہ کیا اور مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی سازشوں اور علیحدگی کی تحریکوں کے لیے سازگار فضا پیدا کر دی۔ اسلامی نظریات اور عناصر کو کمزور کرنے کی پالیسی نے اس بنیادی قوت پر بھی ضرب لگائی جو علیحدگی پسند تحریکوں کے سدباب میں معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں شیخ مجیب الرحمن نے فروری ۱۹۶۶ء میں لاہور کی نیشنل کانفرنس میں اپنے مشہور چھ نکات [1] پیش کیے، جو دراصل مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے نکات تھے۔ اس کے بعد شیخ مجیب الرحمن نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہندوستان سے سازش کی جسے اگرتلا سازش کہا جاتا ہے اور جس کا پتہ چل جانے کے بعد صدر ایوب نے شیخ مجیب الرحمن کو گرفتار کر لیا۔

مختصر یہ کہ صدر ایوب کے دور میں ملک میں ایک نظریاتی خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اسلامی انقلاب کی منزل دور ہو گئی تھی، استبدادی انداز کے مرکزی نظام حکومت نے علاقائی عصبیتوں کو ابھار دیا تھا اور جمہوری طریقہ سے تبدیلی لانے کے راستے بند ہو جانے کی وجہ سے سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں میں مایوسی اور گھٹن کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ معاہدہ تاشقند کی وجہ سے بھی ملک میں صدر ایوب کے خلاف فضا ہموار ہوئی۔ اس معاہدہ کے خلاف اہل پاکستان نے سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ اگرچہ معاہدہ تاشقند حقیقی مجبوریوں کا نتیجہ تھا لیکن سمجھا یہی گیا کہ یہ معاہدہ کر کے صدر ایوب نے میدان جنگ میں جیتی ہوئی بازی صلح کی کانفرنس میں ہار دی۔

---

(۱) یہ نکات مختصراً حسب ذیل تھے۔ (۱) ملک میں وفاقی نظام قائم کیا جائے۔ (۲) وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع اور امور خارجہ کے محکمے ہوں باقی امور وفاقی ریاستوں کے پاس ہوں۔ (۳) ریاستوں کے لیے جداگانہ مالی پالیسی اختیار کی جائے اور مشرقی پاکستان کا سکہ الگ ہو۔ (۴) وفاقی حکومت کو ٹیکس لگانے کا اختیار نہیں ہوگا۔ (۵) مشرقی اور مغربی پاکستان کی بیرونی تجارت کے بھی علیحدہ علیحدہ حسابات ہوں گے۔ (۶) ریاستوں کو نیم فوجی علاقائی فوج دستے رکھنے کا آئینی اختیار ہوگا۔

تحریک جمہوریت اور صدر ایوب کی دست برداری

یہ وہ حالات تھے جن میں پاکستان کے جمہوریت پسند اور اسلامی فکر رکھنے والے رہنماؤں نے ۱۹۶۷ء میں بحالی جمہوریت کی تحریک شروع کی اور جس کی ہر دلعزیزی نے یہ ثابت کر دیا کہ صدر ایوب کی حکومت کا استحکام حقیقی نہیں تھا بلکہ خالی خولی تھا اور فی الحقیقت ان کی حکومت میں اندر ہی اندر گھن لگ چکا تھا۔ ۳۰۔ اپریل ۱۹۶۷ء کو ڈھاکہ میں پانچ جماعتوں نے جو جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ (نصر اللہ گروپ) قومی جمہوری محاذ اور نظام اسلام پارٹی پر مشتمل تھیں ایک متحدہ محاذ بنایا جس کا نام تحریک جمہوریت پاکستان (P.D.M) رکھا گیا۔ تحریک جمہوریت پاکستان نے مجیب الرحمن کے چھ نکات مسترد کر دیے اور آٹھ نکات پر مشتمل ایک پروگرام کا اعلان کیا جس کا مقصد چند ضروری ترمیموں کے بعد جن کے تحت مشرقی پاکستان اور دوسرے صوبوں کا تحفظ کیا گیا تھا ۱۹۵۶ء کے آئین کی بحالی تھا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کا مطالبہ اس لیے کیا گیا تھا کہ اس طرح نئے آئین کی تیاری میں مضمر پیچیدگیوں میں پڑے بغیر جمہوریت جلد از جلد بحال ہو سکتی تھی۔ تحریک جمہوریت کے رہنماؤں نے مشرقی پاکستان کے عوام کو یقین دلایا کہ ان کے حقوق غصب کرنے میں مغربی پاکستان کے عوام کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس کا ذمہ دار آمرانہ نظام ہے جس کا شکار خود مغربی پاکستان کے لوگ بھی ہیں۔ ورنہ مغربی پاکستان کے عوام اپنے مشرقی بازو کے ساتھ انصاف کے طالب ہیں۔ صدر ایوب کے اثر اور اقتدار پر پہلی ضرب تو ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخاب میں پڑی تھی، دوسری ضرب اس وقت پڑی جب انھوں نے معاہدۂ تاشقند پر دستخط کیے اب رہی سہی کسر تحریک جمہوریت نے پوری کر دی۔ صدر ایوب کا اثر بڑی تیزی سے زائل ہونے لگا اور مخالفت بڑھتی چلی گئی۔ تحریک جمہوریت پاکستان نے جلسے اور جلوسوں کے ذریعہ پارلیمانی جمہوریت بحال کرنے کا مطالبہ کیا، بعد میں طلبہ اور مزدور اور ایوبی دور کے ایک سابق وزیر ذوالفقار علی بھٹو بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے اور بحالی جمہوریت کی اس تحریک نے صدر ایوب کو سیاسی رہنماؤں سے بات چیت کرنے پر مجبور کر دیا، ایوب خان نے ماہ فروری ۱۹۶۹ء میں اس مقصد کے لیے راولپنڈی میں ایک گول میز کانفرنس طلب کی جس میں تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس میں پارلیمانی نظام حکومت کی بحالی اور مغربی

پاکستان کی وحدت کو توڑ کر سابق صوبوں کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا۔ چونکہ یہ مطالبے متفقہ طور پر کیے گئے تھے، اس لیے صدر ایوب نے ان کو منظور کر لیا۔ سیاسی رہنما ان دو مطالبوں کے علاوہ کسی اور مطالبہ کو متفقہ طور پر پیش نہ کر سکے اس لیے دوسرے آئینی امور پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، بدقسمتی سے اس دوران بعض عناصر نے جن میں علاقہ پرست اور اشتراکی خیالات رکھنے والے نمایاں تھے، ملک میں تشدد، توڑ پھوڑ اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر ایوب سے مذاکرات میں مزید کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور صدر ایوب نے ملک میں انتشار اور ہنگاموں کی روک تھام کے لیے فروری ۱۹۶۹ء میں انتظام حکومت فوج کے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ کے سپرد کر دیا اور خود صدارت سے دستبردار ہو گئے۔ تشدد پسند اور انتشار پسند عناصر کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے جمہوریت کی بحالی کی منزل ایک بار پھر دور ہو گئی۔ ۱۹۔ اپریل ۱۹۷۴ء کو ایوب خاں کا انتقال ہو گیا۔

دوسرا مارشل لا اور بنگلہ دیش کا قیام

جنرل یحییٰ خاں شروع میں مارشل لاء کے ناظم (ایڈمنسٹریٹر) کی حیثیت سے کام کرتے رہے، لیکن جلد ہی انھوں نے انتظامی ضروریات کے تحت صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے واضح الفاظ میں قوم کو یقین دلایا کہ ان کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا نہیں ہے اور حالات معمول کے مطابق آ جانے کے بعد وہ غیر جانبدارانہ فضا میں انتخابات کرائیں گے اور اقتدار عوام کے نمائندوں کو منتقل کر دیں گے۔ جنرل یحییٰ کے اس اعلان کا سارے ملک میں خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن جلد ہی ایک الجھن پیدا ہو گئی، اور وہ یہ کہ تحریک جمہوریت کے رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ ۱۹۵۶ء کا آئین ضروری ترمیمات کے بعد نافذ کر دیا جائے اور نئے انتخابات اسی آئین کے تحت ہوں۔ یہ رہنما نیا آئین تیار کرنے کے حق میں نہیں تھے اور ان کا کہنا تھا کہ اس طرح مختلف پارٹیاں پھر لڑنا جھگڑنا شروع کر دیں گی اور آئین کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ اس کے برخلاف چھ نکاتی عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کی دوسری اشتراکی اور سیکولر جماعتیں جو ملک سے زیادہ علاقوں اور صوبوں کی نمائندگی کرتی تھیں اس بات پر زور دے رہی تھیں کہ ۱۹۵۶ء، ۱۳۷۵ھ کا آئین فرسودہ ہو چکا ہے اور پاکستان کے لیے نیا آئین تیار کیا جائے اور انتخابات "دستور ساز اسمبلی بنانے کے لیے کیے جائیں۔ بدقسمتی سے جنرل یحییٰ خان نے سیکولر

عناصر اور بائیں بازو کا مطالبہ منظور کرلیا۔ دائیں بازو کی جماعتوں نے جو اسلامی محاذ کی ترجمانی کرتی تھیں دستور ساز اسمبلی بنانے کے فیصلہ کی سختی سے مخالفت کی اور جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

''اگر ملک کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا گیا ہے تو ضرور ایک آئین ساز اسمبلی بنائی جائے۔ یہ ملک کو تباہ کرنے کا مجرب نسخہ ہوگا''

مستقبل میں پیش آنے والے واقعات نے مولانا مودودی کی اس رائے کو بالکل درست اور صحیح ثابت کردیا۔ بہرحال یحییٰ خاں اپنے فیصلے پر قائم رہے اور انھوں نے نومبر ۱۹۶۹ء میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کے لیے ۵۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی تاریخ مقرر کردی جو اگست ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان میں وسیع پیمانے پر سیلاب آجانے کی وجہ سے بڑھا کر ۷۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کردی گئی۔

پہلے عام انتخابات

یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھالی گئی اور حکومت نے بعد میں مغربی پاکستان کی وحدت کو توڑ کر سابق صوبوں کی بحالی اور ایک ایسے آئینی ڈھانچہ کا اعلان کردیا جس کی پابندی کرنا سیاسی پارٹیوں پر لازمی قرار دے دی گئی۔ اس آئینی ڈھانچہ کے تحت یہ طے کر دیا گیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہوگا اور کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا، ملک کا سیاسی ڈھانچہ وفاقی ہوگا اور اس میں مشرقی پاکستان کو آبادی کے تناسب سے ۵۴ فیصدی نمائندگی حاصل ہوگی، صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہوگی لیکن مرکزی حکومت کو انتظامی، مالی اور قانون سازی کے مناسب اختیارات حاصل ہوں گے تاکہ پاکستان کی مرکزی حکومت بیرونی اور داخلی معاملات کی انجام دہی کے لیے اور ملک کی آزادی اور علاقائی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے اپنے فرائض انجام دے سکے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے یہ آئینی ڈھانچہ تسلیم کرلیا تھا لیکن جب انتخابی مہم شروع ہوئی تو سوشلزم اور سیکولرازم کی علمبردار جماعتوں نے اس کی کھل کر خلاف ورزی کی، ایک طرف عوامی لیگ نے چھ نکات کی حمایت میں ووٹ دینے کے لیے کہا تو دوسری طرف پیپلز پارٹی نے کھل کر سوشلزم کا نعرہ لگایا، اگرچہ اس کے لیے اس نے اسلامی سوشلزم کا نام لے کر عوام کو دھوکا دینے کی کوشش کی۔

اسلامی فکر رکھنے والی جماعتوں نے اس موقع پر بڑا مایوس کن کردار ادا کیا۔ آمریت کے خلاف تو وہ سب تحریک جمہوریت پاکستان کے تحت جمع ہوگئی تھیں لیکن انتخابات کے فیصلہ کن موقع پر ان کا یہ اتحاد برقرار نہ رہا۔ اس کا نتیجہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اسلامی عناصر کی شکست اور سوشلسٹ سیکولر اور صوبہ پرست عناصر کی کامیابی کی شکل میں نکلا۔ اگرچہ اسلامی جماعتوں کا اتحاد مشرقی پاکستان میں زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہاں مجیب الرحمن اور عوامی لیگ نے مغربی پاکستان کے خلاف اتنی نفرت پیدا کر دی تھی کہ اسلامی جماعتیں جو زیادہ مضبوط مرکز کی حامی تھیں وہاں کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں لیکن مغربی پاکستان میں صورت حال بالکل مختلف ہوتی، کیونکہ یہاں پیپلز پارٹی نے صرف ۳۷ فیصد ووٹ حاصل کیے، لیکن یہ ووٹ مختلف پارٹیوں کے امیدواروں میں تقسیم ہو کر ان پارٹیوں کی شکست کا سبب بنے۔ عوامی لیگ نے دستور ساز اسمبلی کی تین سو تیرہ نشستوں میں سے ۱۶۹ نشستوں پر اور پیپلز پارٹی نے ۸۶ نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ دونوں جماعتیں سیکولر اور سوشلسٹ ہونے کے علاوہ علاقائی بھی تھیں۔ کیونکہ عوامی لیگ کو کامیابی صرف مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی جہاں ۱۷۱ میں سے ۱۶۹ نشستوں پر اس کا قبضہ ہوگیا لیکن مغربی پاکستان میں اس کا ایک نمائندہ بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ اسی طرح پیپلز پارٹی کو صرف پنجاب اور سندھ میں کامیابی ہوئی۔ اگر اسلامی نظریات رکھنے والی جماعتوں میں اختلاف نہ ہوتا تو کم از کم وہ مغربی پاکستان میں یقیناً کامیاب ہو جاتیں جہاں ان کو مجموعی طور پر ۶۲ فیصد ووٹ ملے تھے۔ اور یہ بات پاکستان کے لیے فال نیک ثابت ہوتی کیونکہ یہ جماعتیں پاکستان کی وحدت پر مکمل یقین رکھتی تھیں جبکہ پیپلز پارٹی میں ایسے عناصر موجود تھے جو یہ کہتے تھے کہ مشرقی پاکستان ہمارے لیے ایک بوجھ ہے اور اس کا الگ ہو جانا ہی اچھا ہے۔

سقوط مشرقی پاکستان

انتخابات کے نتائج اگرچہ اسلامی جماعتوں کے خلاف نکلے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اب جبکہ انتخابات کے نتائج نکل آئے ہیں تو ہمیں ان کو قبول کر لینا چاہئے اور آئین سازی کے مسئلہ کو دستور ساز اسمبلی کے باہر طے کرنے کی بجائے اسمبلی کے اندر طے کرنا چاہیے۔ دستور سازی میں سب سے بڑا اختلافی مسئلہ چھ نکات کا تھا۔ یحییٰ خان نے اس مسئلہ کو

اسمبلی میں طے کرنے کی بجائے پس پردہ گفتگو کے ذریعہ طے کرنے کی کوشش کی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اسمبلی میں جانے سے پہلے شیخ مجیب الرحمن اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان کوئی مفاہمت ہو جائے لیکن جب یہ مفاہمت نہیں ہوئی تو جنرل یحییٰ خان نے فروری ۱۹۷۱ء کے آخر میں اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس التوا کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بھٹو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کے خلاف تھے اور انھوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر مغربی پاکستان کا کوئی رکن اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے ڈھاکہ[1] گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ مشرقی پاکستان میں یہ احساس پہلے ہی موجود تھا کہ مغربی پاکستان کے لوگ ان کے حقوق سلب کیے ہوئے ہیں، اب اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کے بعد یہ خیال پختہ ہو گیا۔ اسمبلی کے التوا کے اعلان کے بعد مشرقی پاکستان میں بغاوت جیسی فضا پیدا ہو گئی۔ مجیب الرحمن کی ہدایت پر سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی گئی۔ غیر بنگالی باشندوں کا قتل عام کیا گیا کیونکہ وہ وحدت پاکستان کے علمبردار تھے۔ بالآخر ۲۵۔ مارچ ۱۹۷۱ء کو مجیب الرحمن کو گرفتار کر لیا گیا اور مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع کر دی گئی۔ یہ کارروائی اتنی شدت اور سختی سے شروع کی گئی کہ مشرقی پاکستان کے باشندے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے لاکھوں کی تعداد میں فرار ہو کر ہندوستان پہنچ گئے۔ عوامی لیگ کے وہ نمائندے بھی جو اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب ہوئے تھے ہندوستان چلے گئے جہاں انھوں نے ۱۷۔ اپریل کو بنگلہ دیش کی آزاد حکومت قائم کر لی۔ ان پناہ گزین بنگالیوں نے مکتی باہنی یعنی فوج آزادی کے نام سے رضا کار دستے منظم کیے اور ان دستوں نے بھارتی حکومت کے تعاون سے مشرقی پاکستان پر چھاپے مارنا شروع کر دیے۔ ان حالات میں اسلامی جماعتوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ پاکستان کی سالمیت کے لیے یحییٰ خاں کی حکومت کی حمایت کریں۔ چنانچہ ان جماعتوں نے البدر اور الشمس کے نام سے رضا کار تنظیمیں بنا کر چھاپہ ماروں کا مقابلہ کیا اور صوبہ میں امن قائم کرنے میں حکومت کی مدد کی۔ رضا کاروں کی اس تنظیم کو قائم کرنے میں مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم اور جماعت کے دوسرے رہنماؤں کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ ان

(۱) جب پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا گیا تو ڈھاکہ کو ضمنی دارالحکومت قرار دیا گیا تھا جہاں مجلس قانون ساز یعنی قومی اسمبلی کے دفاتر قائم کیے گئے اور اسمبلی ہال تعمیر کیا گیا تھا۔

رضا کاروں نے وحدت پاکستان کو قائم رکھنے کے لیے بے مثل قربانیاں دیں جو تاریخ پاکستان کا سنہرا باب ہیں۔ نومبر کے مہینے سے بھارتی حکومت کی فوجوں نے بھی براہ راست مداخلت شروع کر دی اور ۳۔ دسمبر سے پاکستان اور ہندوستان میں باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ جنگ شروع ہونے کے تین دن بعد بھارتی حکومت نے بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ مشرقی پاکستان باقی ملک سے کٹا ہوا ہونے کی وجہ سے زیادہ مدت مقابلہ نہ کر سکا اور ۱۷۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں پاکستانی فوج نے بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ سقوط ڈھاکہ کے تین دن بعد ۲۰۔ دسمبر کو صدر یحییٰ خاں نے پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کو جو مغربی پاکستان میں اکثریتی پارٹی کے نمائندے تھے باقی ماندہ پاکستان کا اقتدار منتقل کر دیا۔ اس طرح مشرقی پاکستان ۲۴ سال تک پاکستان کا رفیق رہنے کے بعد پاکستان سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔

برصغیر میں اسلام کا نعرہ اتحاد کا پیغام لے کر آیا تھا اور اس نعرے نے دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت قائم کر دی تھی۔ لیکن اس کے بعد سوشلزم اور سیکولرازم اور قومیتوں کے نعروں نے اس اتحاد کو کمزور کیا، افتراق پیدا کیا اور بالآخر متحدہ اسلامی مملکت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔

پاکستان کے سوشلسٹ اور سیکولر قوم پرست حلقے مشرقی پاکستان میں فوج کے ساتھ تعاون کرنے پر اسلامی عناصر کی مذمت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح سیاسی تصفیہ کا راستہ بند ہوگیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصفیہ کا راستہ تو اسی دن بند ہوگیا تھا جب دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں صوبہ پرست سوشلزم کے علمبردار کامیاب ہوئے تھے۔ مجیب الرحمن مغربی پاکستان کی مخالفت اور بنگلہ قوم پرستی کی حمایت میں اتنے آگے جا چکے تھے کہ انھوں نے ہندوستان تک سے ساز باز شروع کر دی تھی۔ ان سے کوئی تصفیہ ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اگر ہوتا تو یہ تصفیہ باقی مغربی پاکستان کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی راہ ہموار کر دیتا۔ اسلامی عناصر ایک بے اثر قوت تھے۔ انھوں نے قومی اسمبلی میں آئینی مسئلہ کو طے کرنے کی حمایت کی لیکن ان کی بات نہیں مانی گئی۔ اور اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے بعد فوجی کارروائی شروع کی گئی، بنگالی قوم پرست ہندوستان پہنچ گئے جہاں انھوں نے بنگلہ دیش کی آزاد حکومت قائم کر لی۔ اور ہندوستان کی مدد سے مشرقی پاکستان پر حملے کرنے لگے۔ اب تصفیہ کی دو ہی صورتیں تھیں یا مشرقی پاکستان کو آزاد بنگلہ دیش تسلیم کر لیا جاتا یا پھر وحدت پاکستان کو قائم رکھنے کے لیے فوج کا ساتھ دیا جاتا۔ اسلام پسند عناصر

نے دوسری صورت قبول کی۔ یہ وہی راستہ ہے جسے تمام محب وطن قومیں اپنے وطن کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے اختیار کرتی ہیں۔

مغربی پاکستان

صوبے اور ان کی آبادی

۱۹۶۹ء میں مغربی پاکستان کی وحدت کو ختم کر کے سابقہ خود مختار صوبے بحال کر دیے گئے۔ مغربی پاکستان کی ۴ کروڑ ۲۸ لاکھ آبادی میں ۴ کروڑ ۱۶ لاکھ مسلمان ہیں۔ پاکستان کے اس مغربی حصے میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۹۷ فیصدی سے زیادہ ہے۔ یہ تناسب مصر، شام، سوڈان اور کئی دوسرے اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہے۔

مغربی پاکستان میں مسلمانوں کا تناسب سب سے کم صوبہ سندھ کے ضلع تھرپارکر میں ہے۔ جہاں غیر مسلم آبادی کا تناسب چالیس فیصدی ہے۔ ضلع تھرپارکر کے نو تعلقوں میں سے حسب ذیل تین تعلقوں میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے: (۱) چھاچھرو ۵۴ فی صدی۔ (۲) میٹھی ۶۲ فی صدی۔ (۳) نگر پارکر ۶۶ فی صدی۔ تعلقہ عمرکوٹ میں ہندو آبادی کا تناسب ۴۶ فیصدی ہے اور ضلع کے صدر مقام میرپور خاص میں ہندو آبادی کا تناسب تقریباً ایک تہائی ہے۔ یعنی مغربی پاکستان کے تمام شہروں سے زیادہ۔

نقشہ میں دیے ہوئے ہندسوں میں اوپر کے ہندسے صوبہ کی مجموعی آبادی کو اور نیچے کے ہندسے مسلمانوں کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔



باب ۸

متحدہ پاکستان کے ۲۴ سال

اب تک ہم نے پاکستان کے صرف سیاسی حالات پر نظر ڈالی ہے۔ آیئے اب ہم اپنے وطن کے معاشی، تعلیمی، سماجی اور دوسرے اہم پہلوؤں کا بھی ایک جائزہ لے لیں۔

قیام پاکستان کے بعد اگرچہ ہماری حکومت کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ہمارے رہنماؤں نے بھی قوم کی امیدوں کے مطابق کام نہیں کیا، پھر بھی پاکستان نے تعلیم کی کمی، تجربے کی کمی اور سرمائے کی کمی کے باوجود ۲۴ سال کے عرصے میں جو ترقی کی خاص طور پر معاشی اور صنعتی میدان میں وہ معمولی نہیں۔

پاکستان میں انگریزوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مغربی پاکستان میں نہری آبپاشی کا ایک ایسا نظام قائم کیا جو دنیا میں نہری آبپاشی کا سب سے بڑا نظام ہے لیکن انگریزوں نے یہ کام ایک سو سال کی مدت میں انجام دیا۔ اس دوران انھوں نے شمال کی نہروں کے علاوہ سکھر کا صرف ایک بند تعمیر کیا، اس کے برخلاف پاکستان نے ۲۴ سال کی مدت میں صرف مغربی پاکستان میں کالا باغ، جام شورو، گدو اور تونسہ کے مقام پر چار بند یا بیراج تعمیر کیے جن سے سکھر بیراج کے مقابلے میں کہیں زیادہ علاقہ سیراب ہو رہا ہے۔ ان کے علاوہ دریائے جہلم پر منگلا کے مقام پر ایک عظیم بند یا ڈیم تعمیر کیا گیا اور دریائے سندھ پر تربیلا کے مقام پر ایک دوسرے ڈیم کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ دونوں بند دنیا کے عظیم ترین بندوں میں شمار ہوتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں نہری آبپاشی کا نظام پہلی مرتبہ پاکستان بننے کے بعد قائم کیا گیا، کرنافلی دریا پر کپتائی کے مقام پر جو بند تعمیر کیا گیا اس کی وجہ سے لاکھوں ایکڑ زمین سیلاب سے محفوظ ہوگئی اور بڑی مقدار میں پن بجلی پیدا کی جاتی ہے، دوسرا بڑا نہری منصوبہ گنگا کوباڈک کا ہے جس سے کھلنا اور راج شاہی ڈویژن میں کئی لاکھ ایکڑ زمین سیراب کی جاتی ہے۔ اسی زمانہ میں مکمل ہوا۔

انگریزوں نے اپنے ایک سو سال سے زیادہ کے دور حکومت میں بجلی پیدا کرنے کے جو

کارخانے قائم کیے تھے، ان سے صرف ۷۷ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی لیکن پچھلے ۲۴ سالوں میں یہ مقدار بڑھ کر ۲۳ لاکھ کلوواٹ تک پہنچ چکی ہے، اسی طرح برطانوی دور میں پن بجلی کا صرف ایک کارخانہ مالہ کنڈ کے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا، جس سے صرف دس ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی، لیکن پاکستان نے صرف ۲۴ سال میں وارسک (پشاور) کرنافلی (مشرقی پاکستان) منگلا اور دوسرے مقاموں پر پن بجلی کے کئی منصوبے مکمل کر دیے جن سے آبپاشی کے علاوہ تقریباً نو لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا ہو رہی ہے۔

انگریزوں نے ۹ سال کی مدت میں مغربی پاکستان میں سوتی کپڑے کے دو کارخانے قائم کیے اور مشرقی پاکستان میں دو سو سال کی مدت میں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ قائم نہیں کیا، حالانکہ پٹ سن مشرقی پاکستان کی سب سے قیمتی زرعی پیداوار تھی لیکن پاکستان قائم ہونے کے بعد ۲۴ سال کی مدت میں سوتی کپڑے کے سوا سو سے زیادہ اور پٹ سن کے بیشمار کارخانے قائم کیے گئے۔ قیام پاکستان کے وقت ملک میں سوتی کپڑے کے کارخانوں میں ایک لاکھ ۷۷ ہزار کرگھے اور تکلے تھے، لیکن ۱۹۷۰ء میں ان کی تعداد بالترتیب ۳۵ لاکھ اور ۴۶ ہزار ہو گئی ہے اور سوتی کپڑے کی صنعت ملک کی سب سے بڑی واحد صنعت بن گئی۔ ان کارخانوں میں ہر سال ۵۳ کروڑ پونڈ سوتی تاگا اور ۷۴ کروڑ گز کپڑا تیار ہوتا تھا اور ملکی ضرورت پوری کرنے کے بعد برآمد بھی کیا جاتا تھا، یہی حال پٹ سن کی صنعت کا ہے، پٹ سن کے کارخانوں میں ۱۹۷۰ء میں ہر سال چار لاکھ ٹن مصنوعات تیار ہو رہی تھیں اور خام پٹ سن کے علاوہ پٹ سن کی مصنوعات بڑی مقدار میں برآمد ہو رہی تھیں۔

انگریزوں کے زمانے میں اون کا ایک کارخانہ بھی نہیں تھا لیکن ۱۹۷۰ء میں اونی کپڑے کے پندرہ سے زیادہ کارخانے موجود تھے۔

برطانوی دور میں پاکستانی علاقوں میں سیمنٹ کے صرف دو کارخانے تھے جن کی پیداوار صرف ساڑھے تین لاکھ ٹن تھی۔ ۱۹۷۰ء میں سارے ملک میں سیمنٹ کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں اور پیداوار تیس لاکھ ٹن تک پہنچ گئی، علاوہ ازیں پاکستان میں اب سفید سیمنٹ بھی تیار ہونے لگا جو پہلے تیار نہیں ہوتا تھا۔

برطانیہ کے ایک سو سالہ دور میں پاکستان میں کاغذ، کیمیاوی اشیاء اور کیمیاوی کھاد کا ایک بھی

کارخانہ نہیں تھا۔ لیکن گزشتہ ۲۴ سالوں میں پاکستان میں ان چیزوں کے کئی بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے۔ طباعت کے کاغذ اور اخباری کاغذ کے معاملے میں پاکستان بڑی حد تک خود کفیل ہو گیا۔ کیمیاوی کارخانوں میں ۱۹۷۰ء میں ۲۲ ہزار ٹن گندھک کا تیزاب، ۳۱ ہزار ٹن سوڈا ایش تیار ہو رہا تھا۔ کیمیاوی کھاد جو فی ایکڑ زرعی پیداوار بڑھانے کا ایک کامیاب ذریعہ ہے ہر سال دو لاکھ ٹن سے زیادہ تیار ہو رہی تھی۔

قیام پاکستان کے وقت چمڑے کی صنعت بھی نہ ہونے کے برابر تھی، لیکن گزشتہ ۲۴ سالوں میں چمڑے کے اسی سے زیادہ کارخانے قائم ہوئے، ٹائر، ٹیوب، پلاسٹک کا سامان، بجلی کا سامان، ٹیلیفون سازی، بحری جہاز سازی اور مختلف کل پرزے کے کارخانے ان کے علاوہ تھے، ریل کے ڈبے بھی پاکستان میں بنائے جانے لگے اور موٹروں کے کل پرزے جوڑ کر موٹریں بھی تیار کی جانے لگی ہیں۔

فولاد سازی اس دور کی ایک اہم ترین اور بنیادی صنعت ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں یہ صنعت بہت ترقی یافتہ تھی، لیکن پاکستان میں اس کا وجود بھی نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۶۸ء سے چاٹگام میں فولاد سازی کے ایک خاصے بڑے کارخانے نے کام کرنا شروع کر دیا تھا اور جو پاکستان کا فولاد سازی کا پہلا کارخانہ تھا اور جس کی گنجائش ڈھائی لاکھ ٹن تھی۔

قیام پاکستان کے وقت اسلحہ سازی کا بھی کوئی کارخانہ نہیں تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی کے قریب واہ میں اسلحہ سازی کا ایک بہت بڑا کارخانہ تعمیر کیا گیا جہاں ہر قسم کے چھوٹے اسلحہ اور گولہ بارود ضرورت کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں، اب اس کارخانے میں ٹریکٹر اور دوسرے آلات بھی تیار ہو رہے ہیں۔ اسی طرح کراچی کے جہاز سازی کے کارخانے میں بندوں کے دروازے، سیمنٹ اور شکر کے کارخانوں کے لیے مشینیں بھی تیار کی جا رہی ہیں۔

پاکستان میں مٹی کے تیل کی تلاش ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی ہے اور ملک میں بہت کم تیل نکلتا ہے۔ لیکن قدرتی گیس کے کثیر ذخیرے دریافت کیے گئے۔ اس گیس کو کوئلہ اور تیل کی جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے بجلی بھی پیدا کی جا سکتی ہے اس گیس کے ذخیرے ملک کے دونوں بازوؤں میں دریافت ہوئے ۱۹۷۰ء تک مشرقی ملکوں میں پاکستان واحد ملک تھا جہاں قدرتی گیس وسیع پیمانہ پر استعمال کی جا رہی تھی۔

شہروں کی کثرت صنعتی ترقی کا ثبوت ہوتی ہے۔ انگریزوں کے دور میں پاکستانی علاقوں میں صرف آٹھ شہر ایسے تھے جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھی اور ان میں ایک بھی شہر ایسا نہیں تھا جو صنعتی کہلایا جاسکے، لیکن ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں سولہ شہر ایسے تھے جن کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ تھی کراچی کی آبادی چار لاکھ سے بڑھ کر انیس لاکھ، لاہور کی چھ لاکھ سے بڑھ کر تیرہ لاکھ ڈھاکہ کی ڈھائی لاکھ سے بڑھ کر ساڑھے پانچ لاکھ، حیدرآباد (سندھ کی ½1 لاکھ سے بڑھ کر ساڑھے چار لاکھ ہوگئی۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۷۱ء میں کراچی، لاہور اور ڈھاکہ کی آبادی بالترتیب تیس لاکھ اور دس لاکھ سے زیادہ تھی آبادی میں یہ اضافہ صنعتی ترقی کی وجہ سے ہوا اور کراچی، لاہور، حیدرآباد، لائل پور، ملتان، نرائن گنج، ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا ملک کے بڑے صنعتی شہر بن گئے۔

قیام پاکستان کے بعد رسل ورسائل اور آمدورفت کے نظام نے بھی خاصی ترقی کی، مشرقی پاکستان میں خاص طور پر سڑکوں کی تعمیر وسیع پیمانے پر ہوئی ہے، مغربی پاکستان میں بھی کئی دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں جہاں پہلے پیدل چلنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا، موٹروں اور بسوں کے لیے سڑکیں بنائی گئیں۔ دریائے سندھ کی بالائی وادی کی سڑک جو ایبٹ آباد اور سوات سے گلگت تک جاتی ہے۔ اور شاہ راہ قرہ قرم کہلاتی ہے اور انجینئری کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی تعمیر بھی سقوط مشرقی پاکستان سے پہلے شروع ہوگئی تھی۔

۱۹۴۷ء میں کراچی کے بندرگاہ میں صرف چند لاکھ ٹن سامان جہازوں پر لادنے اور اتارنے کی گنجائش تھی۔ ۱۹۷۰ء میں یہ گنجائش چھیاسی لاکھ ٹن ہوگئی۔ چاٹگام کی بندرگاہ جو برطانوی دور میں ایک معمولی بندرگاہ تھی ملک کی دوسری بڑی بندرگاہ بن گئی جہاں ہر سال چالیس لاکھ ٹن سامان اتارا اور چڑھایا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں چالنا کے مقام پر ایک دوسری بندرگاہ بھی بنائی گئی جہاں تقسیم پاکستان کے وقت بیس لاکھ ٹن سامان اتارنے اور چڑھانے کی گنجائش تھی۔

یہ ہے سقوط پاکستان سے قبل تک متحدہ پاکستان کی چوبیس سالہ ترقی کا جائزہ جو اچھا خاصہ حوصلہ افزا نظر آتا ہے۔ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ آزادی ہی کی وجہ تھی کہ انگریزی دور میں ایک سو سے دو سو سال کی مدت میں جتنے کام انجام دیے

گئے ان سے کہیں زیادہ کام ہم نے چوبیس سال کی مختصر مدت میں انجام دے دیے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اہل پاکستان میں ترقی کرنے کی کتنی صلاحیت موجود تھی اور موجود ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے یہ سارے کام ناسازگار حالات اور طرح طرح کی مشکلات کے باوجود انجام دیے۔ ہندوستان کے مقابلے میں ہمارے یہاں تعلیم بھی کم تھی، سرمایہ بھی کم تھا، ہندوستان کی طرف سے پیدا کی ہوئی رکاوٹوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا بلکہ ہندوستان سے اس مدت میں دو جنگیں بھی لڑنی پڑیں۔

کوتاہیاں

یہ تو پاکستان کے حالات کا روشن پہلو تھا۔ لیکن متحدہ پاکستان کی اس روشن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو اگر تاریک نہیں تو روشن بھی نہیں ہے۔ یہ پہلو ہماری کوتاہیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ زرعی پیداوار کے مسئلے ہی کو لیجیے۔ جب پاکستان قائم ہوا تھا تو ہمارا ملک خوراک کے معاملے میں خود کفیل تھا۔ لیکن اب ہر سال کروڑوں روپے کا غلہ باہر سے خرید کر ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ دریاؤں پر جگہ جگہ باندھ باندھے گئے۔ نہریں نکالی گئیں۔ سیم اور تھور پر قابو پانے کے لیے کروڑوں روپے کی بیرونی امداد حاصل کی، لیکن ان تمام کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان غذا کے معاملے میں خود کفیل ہونے کی بجائے غلہ کا محتاج ہو گیا۔ جبکہ اسی مدت میں ہندوستان نے جو غلہ کے معاملہ میں خود کفیل نہیں تھا بڑی حد تک غذائی پیداوار میں خود کفالت حاصل کر لی۔

تعلیم کے میدان میں پاکستان نے ابتدائی چوبیس سالوں میں جو ترقی کی وہ افسوسناک حد تک مایوس کن ثابت ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزوں نے مغربی پاکستان میں اپنے صد سالہ دور میں اور مشرقی پاکستان میں دو صد سالہ دور میں صرف دو یونیورسٹیاں ڈھاکہ اور لاہور میں قائم کی تھیں، جبکہ قیام پاکستان کے بعد صرف چوبیس سال کی مدت میں دس[1] یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ صنعتی طبی اور فنی تعلیم کے اعلیٰ ادارے ان کے علاوہ ہیں لیکن اعلیٰ تعلیم کی اس فراوانی کے باوجود ملک میں جہالت اور ناخواندگی ختم نہ کی جا سکی۔ چوبیس سال کی مدت میں پاکستان میں خواندگی کا تناسب

---

(1) پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ پشاور یونیورسٹی۔ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد۔ اسلام آباد یونیورسٹی۔ سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد۔ کراچی یونیورسٹی۔ راجشاہی یونیورسٹی۔ چاٹگام یونیورسٹی اور زرعی یونیورسٹی، میمن سنگھ۔

پندرہ فیصد سے آگے نہ بڑھ سکا۔اس کے برخلاف ترکی، ایران، مصر اور انڈونیشیا اور کئی دوسرے مسلمان ملکوں میں اسی مدت میں خواندگی کا یہ تناسب ۲۵ سے ساٹھ فیصد تک پہنچ گیا۔

اخلاقی زوال

ان تمام باتوں سے زیادہ جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ مادی حیثیت سے تو پھر بھی پاکستان نے کچھ نہ کچھ ترقی کی ہے، لیکن اخلاقی میدان میں ترقی کی بجائے الٹا تنزل کیا ہے۔ حالانکہ اعلیٰ اخلاق اور کردار کے بغیر کوئی قوم بڑے کارنامے انجام نہیں دے سکتی۔ ابتدائی چوبیس سالوں میں ہم نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی کھو دیا اور یورپ کے کورے مقلد بن گئے۔ عہد زوال میں ہم اپنے آباؤ اجداد کی ہر بات پر عمل ضروری سمجھتے تھے اب یورپ کی ہر بات کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں اور اپنے دماغ سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔

ہمارے مشہور شاعر اور ادیب حالی نے انیسویں صدی کے آخر میں اپنی نظم مسدس حالی میں مسلمانوں کے زوال اور مسلم معاشرے کی جن خرابیوں کا ذکر کیا تھا، ان میں بیشتر اب بھی ہمارے اندر موجود ہیں، وقت کی قدر ابھی تک ہم نے نہیں سیکھی، امیروں کی اولاد اب بھی پہلے کی طرح بداخلاقیوں کا شکار ہے، بلکہ اب غریبوں کی اولاد بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل رہی ہے، قومی کاموں سے بہت کم لوگ دلچسپی لیتے ہیں، روپیہ کمانا اور اپنے لیے ہر طرح کا عیش و آرام فراہم کرنا ہر شخص کا سب سے بڑا مقدر بن چکا ہے اور اس کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ملک و ملت کے مفاد کا بہت کم لوگوں کو خیال ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے جو قومی جذبہ پیدا ہو گیا تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے، خدمت خلق کے کاموں سے ہم اب بھی دور بھاگتے ہیں اندھی تقلید خواہ وہ پرانے زمانے کے لوگوں کی ہو خواہ نئے لوگوں کی، اب بھی عام ہے، جس کی وجہ سے ٹھوس علمی اور سائنسی کام ہمارے ملک میں نہ ہونے کے برابر ہے، اسلام کے احکام و فرائض سے ہم پہلے سے بھی زیادہ دور ہو گئے ہیں اور خدا اور آخرت کا خوف ہمارے دلوں سے بالکل نکل گیا ہے، اپنے مذہب سے جو ایک ہزار سال تک ہماری زندگی کا سب سے بڑی قوت رہا ہے دلچسپی کم ہوتی چلی جارہی ہے اور وہ بری باتیں جن کو کرتے ہوئے پہلے ڈرا کرتے تھے، اب علی الاعلان کی جارہی ہیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا لیکن جوا، شراب، رشوت اور بے حیائی کے

کام پہلے سے زیادہ ہیں، ہمارے رہنما زبان سے اسلام کا نام بہت لیتے ہیں۔ لیکن عمل کرنے سے جی چراتے ہیں۔

اسلام سے دوری اور اخلاقی خرابیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری ہمتیں پست ہوگئیں اور مستقبل سے متعلق ناامیدی اور مایوسی پھیل گئی مایوسی کے اسی جذبے نے ہمیں خود اپنی نظروں سے گرا دیا اور اسی کی وجہ سے ہمارے اندر مغربی اور غیر اسلامی تصورات کی اندھی تقلید کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ ہمارے اندر یورپ والوں کی حب الوطنی ان کی تحقیق وتفتیش کا شوق، قانون کا احترام، ذمہ داری کا احساس، قربانی کا جذبہ اور دوسری اعلیٰ خوبیوں کو اختیار کرنے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کے لیے تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اور قربانی دینا پڑتی ہے جس کے لیے ہم تیار نہیں، ہاں اس کے برخلاف ہم یورپ کی گھٹیا باتوں اور نقصان دہ طریقوں کو تیزی سے اختیار کر رہے ہیں، کیونکہ ان پر عمل آسان ہے، ہم نے یورپ سے شراب پینا اور جوا کھیلنا سیکھا ہے ہمارے اندر یورپی معاشرے کی عریانی اور بے حیائی عام ہو رہی ہے، ناچ ورنگ سے جو اسلامی تہذیب کی رُوح کو تباہ کر دیتا ہے، ثقافت کے نام پر دلچسپی پیدا کرائی جارہی ہے اور حد تو یہ ہے کہ ہم اپنی مادری اور قومی زبانوں کا استعمال ترک کرتے جارہے ہیں۔

غلامی کے زمانے میں تو ہمارا جذبہ حب الوطنی اتنا قوی تھا کہ جامعہ ملیہ دہلی اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) میں یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم تک اردو میں دی جاتی تھی لیکن آزادی کے بعد اس معاملے میں ہم نے ترقی معکوس کی ہے۔ انگریزوں کو تو نکال دیا لیکن ان کی زبان اور تہذیب کو اپنے اوپر مسلط کرلیا۔ اعلانات انگریزی میں کیے جاتے ہیں، تقریریں انگریزی میں کی جاتی ہیں۔ اشتہارات اور نام انگریزی میں لکھوائے جاتے ہیں، گھروں میں انگریزی بولی جاتی ہے اور لوگ اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں تعلیم دلوانا فخر کی بات سمجھتے ہیں، جہاں ابتدائی جماعتوں سے ذریعہ تعلیم انگریزی ہوتا ہے مختصر یہ کہ یہ خطرناک رجحانات ہیں جن میں ملک وملت کی محبت کا پودا پروان نہیں چڑھ سکتا، یہ تو اپنے ملک کو بھلانے کا جذبہ ہے جو قوم اپنے کو بھلا دے تو پھر وہ کچھ نہیں کرسکتی، آگے بڑھنے کے لیے تو اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے جو ایمان سے پیدا ہوتا ہے جب دلوں میں ایمان ہوتا ہے، عقائد میں پختگی ہوتی ہے اور اپنے تصور اور نظریات پر پورا یقین ہوتا ہے تو انسان میں عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے اور اصلاحی اور تبلیغی جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہی جذبہ تخلیقی کاموں

کا باعث ہوتا ہے اور پھر ایسی قوم دنیا کی امام اور رہنما بن جاتی ہے۔

فکری جمود

پچھلے سو سالوں میں انگریزوں سے کشمکش کی وجہ سے ہمارے اندر یہی جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کی وجہ سے برصغیر کی ملت اسلامیہ میں کئی ایسے رہنما، مصنف اور شاعر ظہور میں آئے جن کو ہم دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیتوں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں، حالی نے اپنی نظموں سے مسلمانوں کو پستی کا احساس دلایا، اکبر الہ آبادی نے اپنی نظموں میں مغربی تہذیب کی نقالی کرنے والوں پر طنز کے تیر چلائے اور اپنی تہذیب وثقافت کی مدافعت کی اور آخر میں اقبال نے ہمارے اندر یہ یقین پیدا کیا کہ دنیا کی صحیح امامت اور رہنمائی صرف مسلمان ہی کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے نثر نویس ادیبوں نے با مقصد ناولیں اور افسانے لکھے نذیر احمد اور راشد الخیری نے اپنی ناولوں کے ذریعہ عورتوں میں بیداری پیدا کی ان خرابیوں کی نشاندہی کی جو ہمارے معاشرے میں آگئی تھیں۔ ان تمام شاعروں اور ناول نویسوں کے سوچنے کی بنیاد اسلام پر تھی، انھوں نے اسلامی تہذیب کے نمائندے کی حیثیت سے کام کیا وہ ایک مسلمان کی طرح سوچتے تھے اور ایک مسلمان کی طرح لکھتے تھے انھوں نے یورپ سے بہت کچھ سیکھا لیکن سب کو اسلامی سانچے میں ڈھال لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں جان تھی اور ان کی کتابوں نے لاکھوں انسانوں کی زندگیاں بدل دیں، اور اسی وجہ سے ان کے کارنامے اردو ادب کے غیر فانی اور تخلیقی کارنامے سمجھے جاتے ہیں۔

یہ بات قیام پاکستان کے بعد ختم ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے مصنفوں کی تحریریں زیادہ تر بے جان ہو گئیں، ان میں زندگی نہیں پائی جاتی ان میں عمل کا پیغام نہیں ہوتا، ہمارے بیشتر افسانہ نگار اور مصنفوں نے مغربی اور اشتراکی ملکوں کے تصور اور نظریات کو ہو بہو اختیار کرنا شروع کر دیا، وہ اپنے نظریات کو اسلامی سانچے میں نہیں ڈھال سکے گزشتہ ۲۳ سالوں میں سوائے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ہم ایک مصنف بھی ایسا پیدا نہ کر سکے جو بین الاقوامی شہرت رکھتا ہو یا جس کی تحریروں نے عوام کے ذہنوں کو قیام پاکستان سے قبل کے مصنفوں اور شاعروں کی طرح متاثر کیا ہو۔ اگر پاکستان کا حکمران طبقہ اور سیاسی رہنما مادی ترقی کے کاموں کے ساتھ ساتھ اخلاق اور کردار پر بھی

توجہ دیتے، پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے، علاقائی تعصبات کا شکار نہ ہوتے اور گروہی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح نہ دیتے اور وحدت پاکستان کو ہر شکل میں قائم رکھتے تو آج پاکستان نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی مملکت کی حیثیت سے قائم رہتا بلکہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی صف میں آ سکتا تھا اور اس کا وجود باقی اسلامی دنیا کے لیے بڑی تقویت کا باعث ہوتا۔ لیکن ہم نے اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے پاکستان کو جو ۱۹۴۷ء میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا تھا چوبیس سال بعد اسلامی دنیا کی تیسری مملکت بنا دیا۔

باب ۹

پاکستان: سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خاں نے سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ۲۰/ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کی حکومت، جواب صرف مغربی پاکستان تک محدود ہوگئی تھی ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کردی جو پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین تھے اور جن کی پارٹی نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مرکزی اسمبلی میں مغربی پاکستان کی ایک سو چوالیس نشستوں میں سے چھیاسی نشستیں حاصل کر کے مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کرلی تھی۔ باقی اٹھاون نشستیں اسلامی جماعتوں اور آزاد امیدواروں کو ملی تھیں۔ اس کے علاوہ پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان کے چار صوبوں میں سے دو صوبوں یعنی پنجاب اور سندھ کی صوبائی اسمبلیوں میں بھی اکثریت حاصل تھی۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد اگرچہ ذوالفقار علی بھٹو صدر پاکستان بن گئے تھے لیکن انھوں نے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے بھی کچھ مدت فرائض انجام دیے اور انھوں نے اپنی بیشتر اصلاحات مارشل لا کے تحت نافذ کیں۔ اس کے بعد انھوں نے ۲۔ جولائی ۱۹۷۲ء کو دہلی میں معاہدہ شملہ پر دستخط کیے جس کے بعد ہندوستانی فوجیں، پاکستانی علاقوں سے واپس ہوگئیں اور مشرقی پاکستان میں گرفتار ہونے والے اسیران جنگ واپس پاکستان آنا شروع ہوگئے۔

ذوالفقار علی بھٹو (۱۹۲۸ء تا ۱۹۷۹ء)

ذوالفقار علی بھٹو ۵۔ جنوری ۱۹۲۸ء کو سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں ایک ممتاز راجپوت سندھی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سر شاہنواز بھٹو سندھ کے سب سے بڑے زمینداروں میں سے ایک تھے اور تقسیم ہند کے وقت وہ ریاست جوناگڑھ[1] کے دیوان یعنی وزیر اعظم تھے۔ ۱۹۴۷ء میں بمبئی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے کیلی فورنیا

(۱) جوناگڑھ علاقہ کاٹھیاواڑ (گجرات) کی ایک مسلم ریاست تھی جس کے نواب نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے الحاق کیا تھا، لیکن ہندوستان کی حکومت نے فوجی کارروائی کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔

یونیورسٹی سے ۱۹۵۰ء میں بی، اے کیا پھر آکسفورڈ سے ایم۔اے کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ پہلے ساؤتھ ہمپٹن یونیورسٹی اور پھر سندھ مسلم لا کالج، کراچی میں بین الاقوامی قانون کے لیکچرار رہے اور کراچی میں وکالت شروع کی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۵۷ء میں صدر اسکندر مرزا کے زمانہ میں ہوا جب وہ ایک پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بھیجے گئے۔ اس کے بعد وہ اگلے سال صدر ایوب سے وابستہ ہو گئے اور آٹھ سال تک مختلف وزارتوں پر فائز رہے۔ وہ صدر ایوب کی "اندرونی کابینہ" میں شامل تھے جو سب سے قابل اعتماد چار وزیروں پر مشتمل تھی۔[1] انھوں نے خاص طور پر وزیر خارجہ کی حیثیت سے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ پاکستان اور چین کے درمیان قریبی تعلق قائم کرانے میں اور ۱۹۶۵ء میں کشمیر کی آزادی کے لیے حکومت پاکستان نے جو فوجی کارروائی کی کہا جاتا ہے کہ اس میں بھٹو صاحب نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ایک وفادار وزیر کی حیثیت سے صدر ایوب کی آمریت کو قائم رکھنے کی انھوں نے پوری کوشش کی۔ جب پاکستان کی حزب اختلاف کی جماعتیں بحالی جمہوریت کی تحریک چلا رہی تھیں تو مسٹر بھٹو صدر ایوب کو پاکستان کا تاحیات صدر بنانے کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخاب میں صدر ایوب کے مقابلے پر کھڑی ہوئی تھیں ان کو مسٹر بھٹو ایک سرپھری بڑھیا سمجھتے تھے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب پاکستان کی حکومت اپنے مقصد آزادی کشمیر میں ناکام رہی اور جنوری ۱۹۶۶ء میں اس کو معاہدہ تاشقند پر دستخط کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو صدر ایوب نے جون ۱۹۶۶ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو وزارت سے علیحدہ کر دیا۔ ان کی علیحدگی کی ایک وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق انہوں نے صدر ایوب کو غلط مشورے دیے اور غلط بیانیاں کیں اور انھوں نے پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ جنگ میں اس لیے ملوث کیا کہ وہ جانتے تھے کہ پاکستان اس جنگ میں کامیاب نہ ہو سکے گا اور صدر ایوب کی اس ناکامی کے بعد بھٹو کو اقتدار میں آنے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن مسٹر بھٹو کا کہنا تھا کہ وہ معاہدہ تاشقند سے متفق نہیں تھے اس لیے خود وزارت سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔

---

(۱) کرنٹ بایوگرافی ۱۹۷۲ء ص ۴۳۔۴۶

دسمبر ۱۹۶۷ء میں مسٹر بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے نئی سیاسی جماعت قائم کی۔ اس پارٹی کے بنیادی نعرے یہ تھے۔ (۱) اسلام ہمارا دین ہے (۲) سوشلزم ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے اور عوام قوت کا سرچشمہ ہیں۔ پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد مسٹر بھٹو صدر ایوب کے خلاف میدان میں آ گئے۔ تحریک جمہوریت پہلے ہی ایوب خاں کے خلاف میدان ہموار کر چکی تھی۔ اب پیپلز پارٹی کے میدان میں آ جانے کی وجہ سے تحریک میں اور زور پیدا ہو گیا۔ لیکن پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں اور شیخ مجیب الرحمن اور بھاشانی کے حامیوں نے مشرقی پاکستان میں وسیع پیمانے پر ہنگامے کر کے بحالی جمہوریت کی پر امن تحریک کو تشدد کے راستے پر ڈال دیا۔ ان عناصر کی کوششوں کی وجہ سے صدر ایوب نے سیاسی رہنماؤں کی جو گول میز کانفرنس اسلام آباد میں بلائی تھی ناکام ہو گئی۔ پر امن اور آئینی طریقہ پر اقتدار محب وطن عوامی نمائندوں کو منتقل نہ ہو سکا اور ملک میں ایک بار پھر مارشل لا لگا دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں جب مارشل لا کے تحت انتخابات ہوئے تو پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں کامیاب ہو گئی۔ انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی نے پاکستان کو متحد رکھنے میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایک طرف مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا خیر مقدم کیا لیکن دوسری طرف ان قوتوں کے خلاف محاذ بنا لیا جو پاکستان کو متحد رکھنے کے لیے مشرقی پاکستان میں جان کی بازی لگا رہی تھیں۔

سقوط مشرقی پاکستان کے بعد جب مغربی پاکستان میں اقتدار پیپلز پارٹی کو منتقل کر دیا گیا تو اس کے سربراہ نے مارشل لا کو زیادہ سے زیادہ مدت تک قائم رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مارشل لا کو اپنا اقتدار مضبوط بنانے اور اپنی اصلاحات کو نافذ کرنے کا ذریعہ بنایا۔ حکومت نے بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور بعض دوسری صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ زرعی اصلاحات بھی جاری کیں اور زمینوں کی تحدید کے اس سلسلے کو جو ایوب خاں کے زمانے میں شروع ہوا تھا مزید آگے بڑھایا۔

پیپلز پارٹی میں صاحب کردار لوگوں کی کمی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھانت بھانت کے لوگوں کا مجموعہ تھی۔ اس میں اگر ایک طرف کچھ محب وطن تھے تو دوسری طرف بدترین قسم کے صوبہ پرست بھی جمع ہو گئے تھے۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے شانہ بشانہ کٹر کمیونسٹ بھی پارٹی میں موجود تھے۔ کمیونسٹوں اور جاگیرداروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا عجیب وغریب کارنامہ

بھٹو جیسا ہی شخص انجام دے سکتا تھا۔ مسٹر بھٹو نے یہ اس لیے کیا تھا کہ پارٹی کمزور ہے اور اس پر ان کی گرفت مضبوط رہے۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور ۲ ۹ سال تک پاکستان پر ایک آمر مطلق کی حیثیت سے مسلط رہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کا کردار بھی اپنے بیشتر ساتھیوں سے کچھ اچھا نہ تھا۔ مسٹر بھٹو کی تعلیم و تربیت خالص مغربی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ اسلام کا نام لینے کے باوجود اسلامی انقلاب کا اتنا بھی شعور نہیں رکھتے تھے جتنا وہ رہنما رکھتے تھے جنھوں نے پاکستان بنایا۔ انھوں نے مذہب کو اپنے اقتدار کے لیے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح شراب، قمار اور جنسی بے راہ روی کا شکار تھے۔ خودغرضی اور لامحدود جاہ پسندی اور اقتدار طلبی کے جذبہ نے ان کے کردار کو داغدار کر دیا تھا۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے سب کچھ جائز سمجھتے تھے۔ ان کا ظاہر اور باطن مختلف تھا۔ صدر ایوب کی انھوں نے جس طرح چاپلوسی کی اور ان کو تاریخ کی عظیم ترین شخصیت قرار دیا اس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جب ان کی گرفتاری کے بعد فوجی حکومت نے پیپلز پارٹی کے دور حکومت سے متعلق قرطاس ابیض شائع کیا تو ان کا ایک خط بھی شائع کیا گیا جو انھوں نے جنیوا سے جہاں وہ پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے، مارچ ۱۹۵۸ء میں صدر پاکستان اسکندر مرزا کو لکھا تھا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''جب غیر جانبدار مورخ ہمارے ملک کی تاریخ لکھے گا تو آپ کا نام مسٹر جناح کے نام سے بھی پہلے لکھا جائے گا'' ان کا یہی خوشامدانہ طرز عمل صدر ایوب کے زمانہ میں بھی قائم رہا جن کو وہ مائی لارڈ یعنی میرے آقا کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور جن کو بھٹو صاحب نے تاحیات صدر بنانے کی کوشش کی تھی۔ طبیعت میں شیخی اور خودستائی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنی تعریف خود کرنے سے تھکتے نہیں تھے اور جس کے مخالف ہو جاتے تھے اس پر جھوٹے الزام لگانے سے جھجکتے نہیں تھے۔ کینہ اور انتقام ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ وہ جس کے پیچھے پڑ جاتے تھے تو اس کو موت کی گود کے علاوہ اور کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔

ان تمام کمزوریوں کے ساتھ ساتھ مسٹر بھٹو انتہائی ذہین انسان تھے۔ وہ اس بات کے ماہر تھے کہ اپنا مطلب کس طرح نکالا جائے۔ وہ سیاسی شعور کے بھی مالک تھے اور سیاسی جوڑ توڑ میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ عوام کی نفسیات کو سمجھنے کی زبردست صلاحیت تھی۔ مختصر یہ کہ ان میں ایک

بااصول اور صاحب کردار رہنما کی خصوصیات کی بجائے وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک ایسے لیڈر میں ہوتی ہیں جس کو انگریزی میں (demagogue) یعنی شورہ پشت، فتنہ انگیز اور بازاری لیڈر کہا جاتا ہے۔

آئین کا نفاذ اور جبر و استبداد

پیپلز پارٹی کی حکومت جب قائم ہوئی تو حزب اختلاف کی جماعتوں نے اس حکومت کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا کیونکہ وہ اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کو حکومت کا حقدار سمجھتی تھیں۔ خاص طور پر جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی نے مسٹر بھٹو سے ذاتی ملاقات میں کہا کہ اگر وہ جمہوری طریقہ پر عمل پیرا رہے اور حزب اختلاف کو اس کا جمہوری حق ادا کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالی تو جماعت اسلامی ان سے مکمل تعاون کرے گی لیکن پیپلز پارٹی جلد ہی اپنے اصلی روپ میں آ گئی۔ حکومت جمہوری طریقے اختیار کرنے کی بجائے ایسی جابرانہ پالیسی پر گامزن ہوگئی جس کی مثال صدر ایوب یا کسی پچھلے دور میں نہیں ملتی۔ حزب اختلاف کی جماعتوں کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے حکومت اپریل ۱۹۷۲ء میں مارشل لا ختم کرنے اور عبوری دستور نافذ کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کے بعد حزب اختلاف کے مکمل تعاون کے بعد ۱۹۷۳ء کو مستقل آئین پر بھی دستخط ہو گئے اور ۱۴۔ اگست ۱۹۷۳ء کو یہ آئین نافذ کر دیا گیا۔ آئین کے تحت پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا اور پارلیمانی طرز کی حکومت قائم کی گئی جس میں وزیراعظم کو وسیع اختیارات دیے گئے۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو صدر کا عہدہ چھوڑ کر وزیراعظم بن گئے۔ لیکن آئین کے نفاذ کے دوسرے ہی دن صدر بھٹو نے بنیادی حقوق معطل کر دیے اور اس کے بعد اگلے تین سالوں میں آئین کے اندر جو تمام جماعتوں کے اتفاق سے تیار ہوا تھا یک طرفہ طور پر چھ مرتبہ ترمیمیں کر کے اس کی شکل بگاڑ دی۔ ۱۴۔ نومبر ۱۹۷۵ء کو چوتھی ترمیم اس طرح کی گئی کہ حزب اختلاف کے تمام نمائندوں کو سکیورٹی فورس کے ذریعہ ایوان سے نکال باہر کیا اور اسمبلی کی عمارت کا دروازہ بند کر کے من مانی تبدیلی کر ڈالی گئی۔

پیپلز پارٹی کے منشور میں ''پریس ٹرسٹ'' توڑنے کا وعدہ کیا گیا تھا تاکہ اخباروں پر سے سرکاری اجارہ داری ختم کی جاسکے۔ لیکن پریس ٹرسٹ توڑنا ایک طرف رہا بیشتر مخالف اخباروں کو یا

تو بند کر دیا گیا یا ان پر طرح طرح کے دباؤ ڈال کر ان کی زبان بندی کر دی گئی۔ حزب اختلاف کی جماعتوں کے لیے جلسے کرنا تقریباً ناممکن بنا دیا گیا۔ جہاں حزب اختلاف کے جلسہ کا پروگرام بنتا تھا وہیں دفعہ ۱۴۴ لگا دی جاتی تھی۔ ۲۳۔ مارچ ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں لیاقت باغ کے جلسہ کو جس طرح درہم برہم کیا گیا وہ اس کی بدترین مثال ہے جس میں بکثرت لوگ شہید ہوئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔

سیاسی قتل جس قدر پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں ہوئے اتنے کبھی نہیں ہوئے۔ سب سے پہلا نشانہ جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما اور قومی اسمبلی کے رکن ڈاکٹر نذیر بنے جن کو ۸۔ جون ۱۹۷۲ء کو ان کے مطب میں قتل کر دیا گیا۔ دوسری اہم شخصیت جس کو قتل کیا گیا مسلم لیگ کے رہنما خواجہ رفیق تھے جن کو دسمبر ۱۹۷۲ء میں سرعام قتل کر دیا گیا۔

پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں مزدور اور طلبہ بھی گولیوں کا نشانہ بنے۔ صوبہ سندھ جس کی نصف آبادی غیر سندھی باشندوں پر مشتمل ہے اس کی سرکاری زبان صرف ''سندھی'' قرار دی گئی اور قومی زبان اردو کو نظر انداز کر دیا گیا، حالانکہ صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں جہاں پیپلز پارٹی کی حکومتیں نہیں تھیں وہاں اردو کو سرکاری حیثیت دی گئی تھی۔ جب اردو کے حامیوں نے جولائی ۱۹۷۲ء میں کراچی میں اس بے انصافی کے خلاف مظاہرہ کیا تو مظاہرین کو جن میں طلبہ پیش پیش تھے پولیس نے گولیوں کا نشانہ بنا دیا جس میں ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ اس کے بعد اردو سندھی تنازعہ کو مہاجر سندھی تنازعہ بنا کر صوبہ سندھ میں فسادات شروع کرا دیے۔ راولپنڈی کے جلسے کو منتشر کرنا اور مہاجر اور سندھیوں کو لڑانا پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت کی دو ایسی مثالیں ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسٹر بھٹو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے مختلف صوبوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑانے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے پاکستان میں صوبائی عصبیت نے بدترین شکل اختیار کر لی۔

خود پیپلز پارٹی کے رہنما اور کارکن بھی مسٹر بھٹو کے جذبۂ انتقام کا نشانہ بنے۔ پیپلز پارٹی کے جنرل سکرٹری جے۔ اے رحیم اور معراج محمد خاں جو اس جماعت کے بانیوں میں سے تھے جبر و تشدد کا نشانہ بنے۔ آزاد کشمیر میں ''دلائی کیمپ'' اور پنجاب میں شاہی قلعہ اور اٹک کا قلعہ اس دور کے بدترین تعزیری قید خانے تھے۔

بنگلہ دیش سے متعلق بھی حکومت نے متضاد پالیسی اختیار کی۔ اقتدار میں آنے کے فوراً بعد جنوری ۱۹۷۲ء میں مجیب الرحمن کو رہا کر دیا گیا پھر عوام میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے شروع میں مسٹر بھٹو نے بنگلہ دیش کی دل کھول کر مخالفت کی، اور شیخ مجیب الرحمن کو غدار قرار دیا یہاں تک کہ جب ملیشیا اور بعض چھوٹی حکومتوں نے بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم کر لیا تو ان سے سفارتی تعلقات توڑ لیے۔ لیکن جب امریکہ اور روس جیسی حکومتوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تو خاموشی اختیار کر لی اور اس کے بعد ۲۲۔ فروری ۱۹۷۴ء کو لاہور میں ہونے والی اسلامی کانفرنس کی آڑ لے کر خود بھی بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور شیخ مجیب الرحمن کو گرمجوشی سے بغل گیر کیا۔

متحدہ جمہوری محاذ اور قومی اتحاد

پیپلز پارٹی کی حکومت کے جبر وتشدد اور خلاف آئین اقدامات کا مقابلہ کرنے کے لیے ۱۲۔ مارچ ۱۹۷۳ء کو حزب اختلاف کی چھ جماعتوں نے ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا۔ یہ جماعتیں حسب ذیل تھیں۔ مسلم لیگ۔ جماعت اسلامی جمعیت علمائے اسلام جمعیت علمائے پاکستان۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی اور پاکستان جمہوری پارٹی۔ محاذ کی تشکیل کے بعد اگرچہ محاذ کا پہلا جلسہ جو ۲۳۔ مارچ کو لیاقت باغ راولپنڈی میں کیا جا رہا تھا۔ نیشنل سکیورٹی فورس کے سپاہیوں کے ذریعے جو سادہ لباس میں ملبوس تھے گولی چلا کر منتشر کر دیا گیا۔ لیکن محاذ نے اس کے باوجود بحالی جمہوریت کی مہم جاری رکھی۔

جنوری ۱۹۷۷ء میں وزیر اعظم بھٹو نے اچانک انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ انتخابات کے لیے ۷۔ مارچ ۱۹۷۷ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ حزب اختلاف کی جماعتوں نے اس کے بعد ایک نئے وسیع تر قومی اتحاد کی تشکیل کا فیصلہ کیا جس میں تحریک استقلال خاکسار تحریک اور کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس بھی شامل ہو گئیں۔ یہ قومی اتحاد ۱۱۔ جنوری ۱۹۷۷ء کو وجود میں آیا۔ لیکن ۷ مارچ کو جب ووٹ ڈالے گئے تو اس وسیع پیمانے پر سرکاری مداخلت کی گئی کہ قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے ایک سو پچپن امیدوار کامیاب ہو گئے اور قومی اتحاد کو صرف ۳۶ نشستیں حاصل ہوئیں اور وہ صرف صوبہ سرحد میں اکثریت حاصل کر سکا۔ قومی اتحاد نے انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ۱۰۔ مارچ کو ہونے والے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ قومی اتحاد نے نہ

صرف صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کیا بلکہ مسٹر بھٹو سے مستعفی ہونے اور فوج اور عدالت کی نگرانی میں ازسرنو غیر جانبدار انتخابات کرانے کا مطالبہ بھی کیا۔ جب حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا تو قومی اتحاد نے اپنے مطالبات کی حمایت میں ملک گیر مہم چلائی۔ اس مہم میں عوام نے غیر معمولی جوش و خروش سے حصہ لیا۔ مہم چار ماہ تک چلی جس کے دوران سینکڑوں لوگ گولیوں کا نشانہ بنے اور ہزاروں گرفتار ہوئے۔ آخر میں حالات اتنے بگڑ گئے کہ فوج کو مداخلت کرنی پڑی اور فوج نے ۵۔ جولائی کو حکومت پر قبضہ کر کے مارشل لا نافذ کر دیا۔ یہ ملک کا تیسرا مارشل لا تھا۔

پیپلز پارٹی کے دور پر ایک نظر

پیپلز پارٹی کا ساڑھے پانچ سال دور حکومت پاکستان کے لیے بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ بنکوں، بیمہ کمپنیوں اور بعض صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے کر اور زرعی زمینوں کی تحدید کر کے اس دور میں ایسے مفید اقدامات کیے گئے جن سے ملکی معیشت بہتر ہو سکتی تھی لیکن پیپلز پارٹی کے اندرونی اختلافات نے اور پارٹی کے خودغرض لوگوں نے ان اصلاحات سے ملک کو فائدہ نہیں پہنچنے دیا۔ جس کی وجہ سے ملک کی معیشت تباہ ہو گئی۔ صنعت، خصوصاً کپڑے کی صنعت جو پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے سے پہلے ملک کی سب سے بڑی صنعت تھی اور دنیا کی منڈیوں پر آہستہ آہستہ قبضہ کرتی چلی جا رہی تھی بالکل تباہ ہو گئی جس جس صنعت کو حکومت نے گرانی کا الزام لگا کر قومی ملکیت میں لیا اس کی مصنوعات کی قیمت میں کمی کرنے کی بجائے اور اضافہ کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کو بے دھڑک ایجنسیاں دی گئیں اور کاروباری لائسنس جاری کیے گئے۔ ان اصلاحات کا نتیجہ یہ نکلا کہ صنعتی پیداوار گر گئی اور سرمایہ کاری رک گئی۔ جنرک اسکیم کے نام سے دواسازی کی صنعت میں جو نام نہاد اصلاح کی گئی۔ اس کی وجہ سے دواؤں کی قیمتوں میں کمی بھی نہ ہوئی اور دواؤں کا معیار گر گیا اور دواسازی کی صنعت بھی تباہ ہو گئی۔ یہی حال تعلیمی اصلاحات کا ہوا۔ نجی مدرسوں کو قومی ملکیت میں لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم کا معیار اور گر گیا اور ہزارہا طلبہ داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے ہر سال تعلیم سے محروم ہونے لگے۔ سرکاری ملازمتوں سے ہزارہا ملازموں کو بدعنوانی کا الزام لگا کر یک طرفہ طور پر برطرف کر دیا گیا اور ان کی جگہ جو لوگ ملازم رکھے گئے وہ اخلاقی لحاظ سے پہلوں سے بہتر نہیں تھے۔ ان تمام کارروائیوں سے یہ مقصد تو حاصل

ہوگیا کہ معاشرہ پر پارٹی کی اجارہ داری قائم ہوگئی لیکن اس طرح ایک نیا مفاد پرست طبقہ وجود میں آ گیا۔ جس کی زندگی اور بقا کا انحصار پیپلز پارٹی پر تھا۔ لیکن ملک کا انتظامی ڈھانچہ اور ملکی معیشت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔

دینی سطح پر جو ایک اہم کام اس دور میں انجام دیا گیا وہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا ہے۔ یہ کام بھی پارٹی پروگرام کے تحت انجام نہیں دیا گیا بلکہ خود قادیانیوں نے ایسی صورت حال پیدا کردی تھی جس کی وجہ سے عوام کا دباؤ اتنا بڑھا کہ پیپلز پارٹی کے ارکان بھی قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کے حامی بن گئے۔ اور مسٹر بھٹو کو یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور قومی اسمبلی نے ۷/ ستمبر ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں کو اتفاق رائے سے اقلیت قرار دے دیا۔

ہر آمر کی طرح مسٹر بھٹو نے بھی ذرائع ابلاغ کو اپنے ذاتی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی پوری کوشش کی گئی کہ ان کو فخر ایشیا قرار دیا جائے۔ ریڈیو۔ ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ مسٹر بھٹو ایک نئے پاکستان کے معمار ہیں اور انھوں نے ملک کی کایا پلٹ دی ہے۔ اسلامی ملکوں میں مسٹر بھٹو نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اسلام کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ اشتراکی ملکوں کو یقین دلایا کہ وہ سوشلزم کے علمبردار ہیں اور ترقی پسند ہیں اور مغربی ملکوں اور امریکہ کو یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ ان کے سوشلزم سے ان کو خطرہ نہیں اور وہ جمہوریت کے علمبردار ہیں۔ اندرون ملک انھوں نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر سوشلزم کو پہلی مرتبہ ملک کے عوام کے ایک بڑے طبقہ میں قابل قبول بنا دیا۔ بیرون ملک ان کا پروپیگنڈہ کامیاب رہا اور انھوں نے ایوب خان کی طرح ہر حلقہ میں اپنے لیے جگہ بنالی۔ لیکن پاکستان کے باشندے جو ان کی پالیسیوں سے متاثر ہو رہے تھے ان کے فریب میں نہیں آئے۔

جمہوریت کی تباہی معیشت کی تباہی، عدالتوں کے کام میں مداخلت اور اخلاق کی تباہی، صوبائیت کا فروغ، عریانیت کا فروغ اور غیر اسلامی اقدار کا فروغ اور قانون کے احترام کا خاتمہ پیپلز پارٹی کے دور حکومت کے اہم کارنامے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس دور میں نظریہ پاکستان کا مذاق اڑایا گیا۔ اور یہ سب کچھ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر کیا گیا۔

تیسرا مارشل لا

جنرل ضیاء الحق نے اس اعلان کے ساتھ اقتدار سنبھالا تھا کہ وہ جلد از جلد انتخابات کرا کے حکومت عوام کے نمائندوں کے سپرد کر دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے نومبر ۱۹۷۷ء میں انتخابات کرانے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ لیکن اس دوران اُن کو سابقہ حکومت کی ایسی بدعنوانیوں کا علم ہوا جو وسیع پیمانے پر کی گئی تھیں۔ اس لیے انھوں نے یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اعلان کیا کہ اب آئندہ انتخابات اس وقت کیے جائیں گے جب بدعنوانیوں کے مرتکب افراد کا محاسبہ مکمل ہو جائے گا۔

شروع میں جنرل ضیاء الحق نے غیر سیاسی افراد پر مشتمل سول کابینہ تشکیل دی لیکن بعد میں انھوں نے سیاسی رہنماؤں کو حکومت میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس کی تا کہ اسلامی قوانین کا نفاذ جلد از جلد کیا جا سکے جس کے لیے عوام زور دے رہے تھے۔ چنانچہ ''قومی اتحاد'' نے ۲۳۔ اگست ۱۹۷۸ء کو اس شرط کے ساتھ حکومت میں شرکت کر لی۔ کہ عام انتخابات نومبر ۱۹۷۹ء میں کرائے جائیں اور اس دوران میں شرعی قوانین نافذ کر دیے جائیں۔

پاکستانی قوانین کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کے لیے اسلامی مشاورتی کونسل کے نام سے پہلے سے ایک ادارہ قائم تھا۔ لیکن حکومت کے عدم تعاون کی وجہ سے یہ ادارہ عملی طور پر مفید ثابت نہ ہو سکا۔ جنرل ضیاء الحق نے جو اب صدر ہو گئے تھے اس ادارے کی اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے تشکیل نو کی اور اس میں ملک کے قابل اعتماد علماء کو شامل کرنے کے بعد اس کو ایک خود مختار ادارہ بنا دیا۔ اس کونسل کی کوششوں سے نظریہ پاکستان کا احیاء کیا گیا اور اسلامی نظریاتی کونسل کی اپیل پر ۱۰۔ ذی الحجہ مطابق ۲۲۔ نومبر ۱۹۷۷ء/ ۱۳۹۷ھ کو سارے ملک نے تجدید میثاق کیا اور اسلام پر چلنے کا عہد کیا۔ اس کے بعد یکم محرم مطابق ۲۔ دسمبر ۱۹۷۸ء/ ۱۳۹۹ھ کو صدر ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ آئندہ کوئی قانون شریعت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے پاکستانی عدالتوں میں شریعت بنچ قائم کیے گئے۔ ۱۲۔ ربیع الاول مطابق ۱۰۔ فروری ۱۹۷۹ء/ ۱۳۹۹ھ کو زکوٰۃ اور عشر کے قانون کا اعلان کیا گیا اور چوری، رہزنی شراب اور زنا سے متعلق اسلامی تعزیرات یعنی سزاؤں کا اعلان کیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں صحیح سمت میں قدم اٹھایا گیا اور اس کا سہرا بجا طور پر صدر ضیاء الحق کے علاوہ قومی اتحاد کے رہنماؤں

کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ جو نظام مصطفیٰ اور اسلامی نظام کے قیام کا مسلسل مطالبہ کر رہے تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک کے دوران قومی اتحاد کا یہ بھی ایک مطالبہ تھا۔ قومی اتحاد اور فوجی حکومت کے درمیان یہ تعاون زیادہ دن جاری نہیں رہا اور اتحاد کے وزیروں نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر ۲۱۔ اپریل ۱۹۷۹ء کو استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد صدر ضیاء الحق کو پھر غیر سیاسی افراد پر مشتمل کابینہ تشکیل دینی پڑی۔

سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی، جداگانہ طریق انتخابات کا فیصلہ پاکستان سنٹو سے علیحدگی اور غیر جانبدار ملکوں کے بلاک میں شرکت ۲۲۔ ستمبر کو مولانا مودودی کی وفات اور ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو دو امریکی سائنس دانوں کے ساتھ پاکستانی سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل انعام ملنا۔ ۱۹۷۹ء کے اہم واقعات میں سے ہیں مسٹر بھٹو کو پیپلز پارٹی کے ایک رہنما احمد رضا قصوری کے والد محمد احمد کو قتل کرانے کے جرم میں پاکستان کی عدالت عالیہ نے طویل سماعت کے بعد سزائے موت دی۔ اور ۴۔ اپریل کو انھیں پھانسی دے دی گئی۔ بعض لوگ اس کو سیاسی قتل قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عدالت عالیہ نے کھلی سماعت اور شہادتوں کی روشنی میں جس میں مسٹر بھٹو کو ہر طرح کی سہولتیں حاصل تھیں انھیں قتل کا مجرم قرار دیا تھا۔ اس کو سیاسی پھانسی صرف اس معنوں میں کہا جاسکتا ہے کہ حکومت مقدمہ میں بے تعلق نہیں رہی اور ثبوت فراہم کرنے میں اس نے مدعی کی مدد کی۔ غیر جانبدار بلاک کا ممبر پاکستان ۳۱۔ اگست کو ہوانا کانفرنس کے موقع پر بنا۔

قیادت کا فقدان اور انتخابات کا التوا

پاکستان کی سیاست کا سب سے کمزور پہلو قیادت کا فقدان ہے۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے بعد سے یہ کمی مسلسل محسوس کی جارہی ہے اور اس کی وجہ سے ملک کی سیاست میں ابھی تک جمہوری بنیادوں پر استحکام پیدا نہیں ہوسکا ہے۔ صدر ایوب خان کے زمانے میں بظاہر قیادت کا یہ فقدان ختم ہوگیا تھا۔ لیکن ایوب خان کی قیادت کا انحصار عوام کی رائے اور مرضی پر اتنا نہیں تھا جتنا جبر اور طاقت پر تھا۔ اس کی وجہ سے ملک میں متبادل قیادت پیدا نہیں ہوسکی اور ملک گیر وطنی قیادت کی بجائے مقامی اور علاقائی قیادتوں کے ابھرنے کی راہ ہموار ہوگئی۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمان اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو عروج حاصل ہوا جو پاکستان کی تقسیم کا باعث ہوا۔

بنگلہ دیش کے الگ ہو جانے کے بعد مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی اگرچہ باقی پاکستان میں سب سے بڑی سیاسی جماعت بن گئی۔ لیکن اس کا اثر بھی زیادہ تر صوبہ پنجاب اور سندھ میں تھا۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان[1] اس کے حلقہ اثر سے باہر رہے۔ مسٹر بھٹو اگر مخلص اور باکردار رہنما ہوتے تو وہ باقی پاکستان میں قیادت کے فقدان کو ختم کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے کردار کی کمزوری نے پاکستان کو ایک نئے سیاسی بحران میں مبتلا کر دیا۔ جس سے پاکستان ابھی تک نکل نہیں سکا ہے۔

حزب اختلاف کی جماعتوں نے آمریت کے خلاف متحدہ جدوجہد کر کے اجتماعی قیادت کے لیے کئی بار کوششیں کیں۔ سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ (متحدہ محاذ) بنا جس نے صوبہ میں ۱۹۵۴ء میں مسلم لیگ کو شکست فاش دی۔ اور اس کے بعد ایوب خان کے دور میں تحریک جمہوریت اور جمہوری مجلس عمل کے نام سے متحدہ محاذ وجود میں آئے اور پیپلز پارٹی کے دور میں متحدہ جمہوری محاذ (U D F) اور پھر پاکستان قومی اتحاد کی تنظیمیں قائم ہوئیں۔ لیکن چونکہ یہ تمام مثبت کی بجائے منفی نوعیت کے تھے۔ یعنی ان کا مقصد بنیادی طور پر آمرانہ حکومت کو ختم کرنا تھا۔ اس لیے یہ محاذ بھی قیادت کے فقدان کو ختم نہ کر سکے اور اس میں شامل جماعتیں مقاصد پورا ہونے کے بعد متحد نہیں رہ سکیں۔ اس وقت بھی یہی صورت حال قائم ہے۔ پاکستان قومی اتحاد (P D F) جو اس عزم سے قائم کیا گیا تھا کہ بھٹو کی آمریت کو ختم کر کے جمہوریت کو بحال کرے گا اور ملک میں ایک مستحکم حکومت قائم کر کے اسلامی نظام نافذ کرے گا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کا تختہ پلٹنے کے بعد نئے انتخابات سے پہلے ہی انتشار کا شکار ہو گیا۔ سب سے پہلے تحریک استقلال علیحدہ ہوئی۔ پھر جمعیت علمائے پاکستان اور آخر میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی قومی اتحاد سے علیحدہ ہو گئی۔ مسلم لیگ اگرچہ آخر تک اتحاد میں شامل رہی لیکن اس کی صفوں میں بھی انتشار پیدا ہو چکا تھا۔

۳۔ اگست ۱۹۷۹ء کو صدر ضیاء الحق نے سیاسی جماعتوں کا آرڈی ننس جاری کر دیا۔ آرڈی ننس کے تحت انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ہر جماعت کے لیے رجسٹریشن کرانا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ تاکہ کوئی ایسی جماعت جو نظریہ پاکستان کے خلاف ہو یا جس کے حسابات باضابطہ نہ ہوں یا

---

(۱) ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو صرف پنجاب اور سندھ میں اکثریت حاصل ہوئی تھی سرحد اور بلوچستان میں ایک نمائندہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں بھی دھاندلی اور سرکاری مداخلت کے باوجود صوبہ سرحد میں پیپلز پارٹی کو کامیابی نہ ہو سکی۔ بلوچستان میں اس لیے کامیابی ہوئی کہ قومی اتحاد نے وہاں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔

جس کی تنظیم جمہوری بنیادوں پر قائم نہ ہوا نتخابات میں حصہ نہ لے سکے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے ستمبر میں بلدیاتی انتخابات کرانے کا فیصلہ بھی کرلیا۔ اس فیصلہ نے اور سیاسی جماعتوں کے آرڈی ننس کے مسئلہ نے سیاسی جماعتوں میں پھوٹ ڈال دی اور جب صدر ضیاء الحق نے انتخابات کے لیے ۱۷ نومبر ۱۹۷۹ء کی تاریخ مقرر کی تو یہ انتشار اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ رہے سہے ''قومی اتحاد'' نے جس میں اب صرف تین بڑی جماعتیں جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام اور مسلم لیگ باقی رہ گئی تھیں۔ جماعت اسلامی کو بھی اتحاد سے نکال دیا۔ کیونکہ اس نے خود کو رجسٹریشن کے لیے پیش کر دیا تھا اور اپنے امیدواروں کے ناموں کی فہرست بھی داخل کر دی تھی۔ حالانکہ جماعت نے یہ اس لیے کیا تھا کہ حکومت کے لیے انتخابات سے فرار کا راستہ بند ہو جائے۔ اس صورت حال میں سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ ہر ایک اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ الاپ رہا تھا۔ اور ہر جماعت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں لگی ہوئی تھی۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے ۱۹۷۷ء میں انتخابات کے موقع پر جتنی ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا ۱۹۷۹ء کے انتخابات کے موقع پر اتنی ہی غیر ذمہ داری اور خودغرضی کا ثبوت دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نمائندہ حکومت کی منزل ایک بار پھر دور ہو گئی جنرل ضیاء الحق نے سیاسی جماعتوں کی سر پھٹول دیکھ کر ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو انتخابات غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیے۔ سیاسی جماعتیں کالعدم اور سیاسی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ اور مارشل لا جو اب تک نرمی سے چلا جا رہا تھا اس میں سختی پیدا کر دی گئی۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ملک کا آئین موجود ہے۔ لیکن اس کے چند حصے معطل ہیں اور انتخابات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب ہوں گے پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت کبھی نہیں دیا تھا۔ اور پاکستان کی فوج کو سیاست میں مداخلت پر اس سے زیادہ بری الذمہ کبھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جتنا اس موقع پر دیا جا سکتا ہے۔

تعلقات خارجہ

۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کی جنگ ہونے تک پاکستان کے مغربی ملکوں خصوصاً امریکہ سے بہت قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں چین اور ہندوستان کی سرحدی جھڑپوں کے بعد جب امریکہ نے ہندوستان کو اسلحہ فراہم کرنا شروع کیا تو امریکہ اور

پاکستان کے تعلقات متاثر ہونا شروع ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد امریکہ نے ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی فوجی امداد بھی بند کر دی۔ حالانکہ پاکستان ۱۹۵۹ء کے معاہدہ کے تحت امریکہ کا حلیف تھا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات مختلف نشیب و فراز سے گزرتے رہے۔ اس دوران میں پاکستان نے معاہدہ جنوب مشرقی ایشیا (سیٹو) سے علیحدگی اختیار کر لی اور پشاور میں امریکہ کا فوجی اڈہ ختم کر دیا اس طرح چین اور روس کے ساتھ تعلقات ہموار کرنے میں مدد ملی۔ پاکستان مسٹر بھٹو کے زمانہ سے فرانس سے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن امریکہ اس کے خلاف تھا۔ صدر ضیاء الحق کے زمانہ میں جب یہ معاملہ آگے بڑھا تو امریکہ نے فرانس پر دباؤ ڈال کر پاکستان کو پلانٹ دینے سے رکوا دیا۔ حالانکہ پاکستان نے ہر طرح یقین دلایا کہ وہ ایٹم بم نہیں بنانا چاہتا۔ لیکن امریکہ نے یقین نہیں کیا اور ۱۹۷۹ء میں پاکستان کی اقتصادی امداد بھی بند کر دی۔ ۱۹۷۹ء کے آخر میں افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت کے بعد اب امریکہ کی پالیسی میں پھر تبدیلی آ رہی ہے اور وہ پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد بحال کرنا چاہتا ہے۔

روس سے پاکستان کے تعلقات ۱۹۷۲ء سے بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے اور روس کی مدد سے پاکستان میں فولاد سازی کا کارخانہ تعمیر کیا جا رہا ہے لیکن افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت کے بعد یہ تعلقات پھر خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ چین سے پاکستان کے تعلقات انتہائی دوستانہ ہیں اور چین کی طرف سے پاکستان کو فوجی اور اقتصادی امداد مل رہی ہے۔ اگرچہ وہ پاکستان کی ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔

پاکستان اپنے قیام کے زمانہ سے اسلامی اتحاد کا علمبردار رہا ہے۔ اور عربوں اور فلسطین کے معاملہ میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کرتا رہا ہے۔ فروری ۱۹۴۹ء میں کراچی میں ایک عالمی اسلامی کانفرنس بھی ہوئی تھی۔ جس کی صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی نے کی تھی۔ اس سال ۲۵۔ نومبر کو کراچی میں پہلی بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس ہوئی جس کا افتتاح وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کیا۔ جب ۱۹۶۹ء میں رباط میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تو پاکستان نے اس میں شرکت کی اور اس کے بعد سے اسلامی کانفرنس کی کاروائیوں میں سرگرمی سے حصہ لیتا رہا۔ فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا اجلاس ہوا جولائی ۱۹۷۸ء میں رابطہ عالم اسلامی کی پہلی

ایشیائی کانفرنس کراچی میں ہوئی اور اسلامی کانفرنس کا ایشیائی صدر دفتر کراچی میں قائم کیا گیا۔ جنوری ۱۹۸۰ء میں اسلامی وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس اسلام آباد میں ہوئی جس میں افغانستان میں روس کی جارحیت کی مذمت کی گئی۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم موڑ پاکستان کی غیر جانبدار ملکوں کے بلاک میں شرکت ہے۔ ۱۲۔ مارچ ۱۹۷۹ء کو پاکستان سینٹو سے بھی علیحدہ ہو گیا۔ اور اس سال ۳۱۔ اگست کو وہ ہوانا کانفرنس میں غیر جانبدار ملکوں کا رکن بنا لیا گیا۔

جماعت اسلامی

پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں جماعت اسلامی اس لحاظ سے بڑی اہم تھی کہ یہ وہ واحد سیاسی جماعت تھی۔ جس میں اسلامی انقلاب اور اس کے تقاضوں کا صحیح شعور تھا۔ اور نہ صرف یہ کہ اس نے اسلامی نظام کی وضاحت کے سلسلے میں وسیع لٹریچر تیار کیا بلکہ سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اجتماعی میدانوں میں اسلامی انقلاب لانے کے لیے مسلسل کام کیا اور اوپر کی سطح سے نچلی سطح تک ایسے کارکنوں کی تربیت کی جو نظری اور عملی حیثیت سے اسلامی انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور جنھوں نے اسلامی انقلاب کی راہ میں مسلسل قربانیاں دی ہیں۔

جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تھے۔ انھوں نے ماہنامہ ترجمان القرآن کے ذریعہ آٹھ نو سال اپنے نظریات کی وضاحت کرنے کے بعد ۲۶۔ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ جماعت اسلامی نے قیام پاکستان سے قبل عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ کیونکہ جماعت ایک ایسے آئین کے تحت سیاست میں حصہ لینے کو جائز نہیں سمجھتی تھی جس میں اللہ کی حاکمیت کو تسلیم نہ کیا گیا ہو اور جس کا مقصود اسلامی انقلاب لانا نہ ہو۔ وہ صرف قومی آزادی کو ملک کی نجات نہیں سمجھتی تھی بلکہ اسلامی انقلاب کو عوام کی نجات کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ لہٰذا اس دور میں جماعت کی زیادہ تر کوشش لوگوں میں اسلامی انقلاب کا شعور پیدا کرنے تک محدود رہی۔ اس نظریہ کے تحت جماعت نے سیکولرازم اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے نظریہ کی مخالفت کی جو کانگرس کا نظریہ تھا۔ اس کے برخلاف جماعت اسلامی نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی حمایت کی جو مسلم لیگ کا نظریہ تھا۔ تحریک پاکستان کی مولانا مودودیؒ نے مخالفت نہیں کی۔ وہ مسلمانوں کے قومی مطالبہ اور قومی وطن کی حیثیت سے پاکستان کے مطالبہ کو جائز مطالبہ سمجھتے تھے۔ لیکن مولانا

مودودی اور جماعت اسلامی کو مسلم لیگ سے یہ اختلاف تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کو صرف ایک قوم سمجھتی تھی۔ جب کہ مولانا مودودیؒ کا کہنا تھا کہ مسلمان محض ایک قوم نہیں ہیں بلکہ ایک ایسی جماعت کی حیثیت بھی رکھتے ہیں جس کا مقصد اسلامی انقلاب لانا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اسلامی انقلاب کو اپنا مطمح نظر بنانا چاہیے اور اس مقصد کے تحت ایسے کارکن تیار کرنا چاہئیں جو اسلامی انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ لوگ جن کی زندگی اسلام کے مطابق نہ ہو وہ اسلامی انقلاب نہیں لا سکتے بلکہ مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی انقلاب کی راہ میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی بھی مسلم لیگ کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ایک جماعت اسلامی ہند اور دوسری جماعت اسلامی پاکستان۔ مولانا مودودی جماعت اسلامی پاکستان کے امیر منتخب ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد جب اسلامی آئین کی مہم چلائی گئی تو اس کی حقیقی روح رواں جماعت اسلامی تھی۔

۱۹۴۹ء میں جب دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی جو آج تک پاکستان کے ہر آئین کا حصہ ہے تو جماعت اسلامی نے ملک کی عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی نے بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے کام کرنے اور ملکی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں جب جنرل ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کر کے مارشل لاء لگا دیا تو دوسری جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ ۱۹۶۲ء کے آئین کے بعد جب سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو جماعت اسلامی بحال ہوگئی اس کے بعد جماعت اسلامی نے ۱۹۵۶ء کے آئین کی بحالی پارلیمانی نظام حکومت کے قیام کے حق میں اور آمرانہ طرز حکومت کے خلاف مہم شروع کی اور حزب اختلاف کی جماعتوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنایا۔ اسلامی آئین کی طرح بحالی جمہوریت کی اس مہم میں بھی جماعت اسلامی کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی تھی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے جماعت اسلامی نے اسلامی جماعتوں کے تعاون سے اسلامی انتخابی محاذ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی جماعتوں کے ووٹ تقسیم ہوگئے اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی جو سوشلزم اور سیکولرازم کی علمبردار تھیں کامیاب ہوگئیں۔ جماعت اسلامی کے قومی اسمبلی میں صرف چار نمائندے

کامیاب ہوئے۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں جب مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی شروع ہوئی تو جماعت اسلامی نے فوج سے تعاون کیا اور اس کے منظم کردہ البدر اور الشمس کے رضا کاروں نے وحدت پاکستان کے لیے بے مثل قربانیاں دیں۔

پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد جماعت اسلامی نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی مخالفت کی کیونکہ یہ ملک ہندوستان کی جارحیت کے نتیجے میں قائم ہوا تھا پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں جب ۱۹۷۳ء میں بھٹو آمریت کا مقابلہ کرنے اور جمہوری اور بنیادی حقوق کی بحالی کے لیے متحدہ جمہوری محاذ قائم ہوا اور مارچ ۱۹۷۷ء میں انتخابی دھاندلیوں کے خلاف ملک گیر مہم چلائی تو جماعت اسلامی نے ان مہموں میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ اس موقع پر جماعت کے ممتاز رہنما اور قومی اسمبلی کے ممبر پروفیسر عبدالغفور احمد نے متحدہ جمہوری محاذ اور قومی اتحاد کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔

جماعت اسلامی سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں کے خلاف ہے۔ وہ ایک ایسے معاشی نظام کی حامی ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو اور جس میں کسی ایک طبقے کو اجارہ داری حاصل نہ ہو۔ اگرچہ جماعت قومی ملکیت اور زمین کی تحدید ملکیت کے اصولی طور پر خلاف ہے لیکن موجودہ معاشی بے انصافی کے دور ہونے تک ان کو ایک عارضی حل کے طور پر قبول کرتی ہے۔ جماعت سودی نظام کے خلاف ہے۔ موجودہ عدالتی نظام کو بدلنا چاہتی ہے اور تعلیمی نظام میں اسلامی نقطہ نظر سے بنیادی تبدیلیاں لانا چاہتی ہے۔ مختصر یہ کہ جماعت اسلامی زندگی کے ہر شعبے میں مکمل انقلاب لانا چاہتی ہے۔ خارجی امور میں جماعت اتحاد اسلامی کی علمبردار ہے۔ فلسطینی عربوں کے حقوق اور بیت المقدس کی مسلمانوں کو واپسی کی حامی ہے۔ بڑی طاقتوں میں سے وہ کسی ایک طاقت کے ساتھ وابستگی کے خلاف ہے۔ جماعت اسلامی نے اپنے اغراض و مقاصد کی ۱۹۵۸ء اور ۱۹۷۰ء کے انتخابی منشوروں میں وضاحت کی تھی اور ان کی پشت پر مولانا مودودی کا وسیع لٹریچر موجود تھا۔ جماعت اسلامی احیائے اسلام کے لیے پاکستان میں وہی کام کر رہی تھی جو ماشومی پارٹی نے انڈونیشیا میں اخوان المسلمون نے مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں انجام دیا۔

مولانا مودودی کے افکار سے جو لوگ متاثر ہوئے ہیں انھوں نے جماعت اسلامی کے تعاون سے مختلف تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں جو معاشرہ کے مختلف میدانوں میں کام کر رہی ہیں۔ ان

میں سب سے اہم تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کی ہے جو اس وقت پاکستان میں طلبہ کی سب سے بڑی اور سب سے منظم تنظیم ہے۔ پاکستانی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طلبہ کی بیشتر انجمنیں اسی تنظیم کے زیر اثر ہیں۔

مزدوروں میں جو اسلامی تنظیم کام کر رہی ہے اس کا نام نیشنل لیبر فیڈریشن ہے۔ اسی طرح کاشتکاروں کی تنظیم کا نام ''کسان بورڈ'' ہے۔ اتحاد العلماء کے نام سے ایک تنظیم علماء کی بھی ہے۔ پاکستان میں علماء کی جو تنظیمیں قائم ہیں وہ کسی نہ کسی مخصوص فقہی مسلک سے وابستہ ہیں۔ اتحاد العلماء کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر فقہی مسلک کے علماء شامل ہیں۔

جماعت اسلامی کا ایک شعبہ خدمت خلق بھی تھا جو مختلف شہروں میں زکوٰۃ، صدقات اور مخیر حضرات کی مالی مدد سے خدمت خلق کے کاموں میں مدد کرتا تھا۔ پاکستان میں خدمت خلق کا یہ ممتاز ترین غیر سرکاری ادارہ تھا۔ اس کے تحت کئی شہروں میں گشتی شفاخانے بھی کام کرتے تھے۔

پاکستان کی دوسری اہم سیاسی جماعتیں حسب ذیل تھیں:

مسلم لیگ

یہ برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت تھی جو ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں قائم کی گئی تھی۔ لیکن ایک فعال تنظیم کی حیثیت سے مسلم لیگ اس وقت نمایاں ہوئی جب قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۶ء سے اس کی تنظیم نو کی۔ ۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے لاہور کے اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور کی اور ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو اسی جماعت کی کوششوں سے پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد یہ جماعت ملک کو اسلامی رنگ دینے سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرسکی اور نوکر شاہی کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گئی جس کے نتیجے میں بتدریج عوام میں غیر مقبول ہوتی چلی گئی اور مسلم لیگ سے لوگ نکل کر نئی نئی سیاسی جماعتیں قائم کرتے چلے گئے۔ عوامی لیگ جس نے بنگلہ دیش بنایا سابق مسلم لیگیوں ہی کے ایک گروپ کی تنظیم تھی۔ اس وقت بھی مسلم لیگ مختلف گروپوں میں تقسیم ہے اور ہر گروپ اپنی تنظیم کو حقیقی مسلم لیگ کہلانے کا دعویدار ہے۔

پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی

یہ جماعت ۱۹۶۹ء میں چار پارٹیوں (نظام اسلام، عوامی لیگ نصر اللہ گروپ، نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ اور اصغر خاں کی جسٹس پارٹی کے ادغام سے وجود میں آئی۔ اصغر خاں بعد میں اس پارٹی سے الگ ہوگئے۔ ۱۹۷۰ء میں اس پارٹی کے سربراہ مشرقی پاکستان کے نور الامین واحد امیدوار تھے جو اس پارٹی کے ٹکٹ پر مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ کے مقابلہ میں کامیاب ہوئے تھے۔

تحریک استقلال

اس پارٹی کے سربراہ پاکستانی فضائیہ کے سابق ائیر مارشل اصغر خاں تھے۔ انھوں نے پہلے جسٹس پارٹی کے نام سے ایک جماعت قائم کی تھی۔ اس کے بعد اس کو توڑ کر تحریک استقلال کے نام سے نئی جماعت قائم کی۔ پاکستان میں سب سے زیادہ مغرب نواز یہی پارٹی تھی۔

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی

یہ جماعت نیشنل عوامی پارٹی کی جانشین تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے عوامی لیگ سے ٹوٹنے والے عناصر پر مشتمل تھی جو بعد میں چین نواز بھاشانی گروپ اور روس نواز ولی گروپ میں تقسیم ہوگئی۔ مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد بھاشانی گروپ بنگلہ دیش میں رہ گیا اور مغربی پاکستان میں ولی گروپ رہ گیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اس پارٹی کو سرحد اور بلوچستان میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جمعیت علمائے اسلام کے تعاون سے حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب بھٹو نے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی عائد کردی تو اس پارٹی کے حامیوں نے نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے نئی جماعت قائم کرلی۔ ولی خان اور سردار شیر باز مزاری اس پارٹی کے ممتاز رہنما تھے۔ اس پارٹی کے ابتدائی بانیوں میں چونکہ ان لوگوں کی اکثریت تھی جنھوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ساتھ دیا تھا اس لیے پاکستان میں عام طور پر اس پارٹی سے بدگمانی پائی جاتی تھی حالانکہ اس نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو پاکستان کے مفاد کے خلاف ہو۔ اس پارٹی کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ صوبہ سرحد اور بلوچستان تک محدود تھی اور اس کے بعض رہنماؤں نے

پختونستان کے مسئلہ کو ہوا دی اور افغانستان کی ہمنوائی کی۔ سابق نیشنل عوامی پارٹی کے بعض انتہا پسند رہنماؤں نے جن کا تعلق بلوچستان سے تھا نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی اور غوث بخش بزنجو اور عطاء اللہ مینگل کی قیادت میں پاکستان نیشنل پارٹی کے نام سے ایک نئی جماعت بنالی ہے جو پاکستان میں سب سے زیادہ علاقہ پرست اور اشتراکی نظریات کی حامل پارٹی ہے۔ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی پہلے سیکولرازم کی حامی تھی لیکن قومی اتحاد میں شامل ہونے کے بعد اس نے اسلامی نظام کے قیام کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا تھا۔

مذکورہ بالا جماعتوں کے علاوہ جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان بنیادی طور پر علماء کی تنظیمیں تھیں۔ یہ علماء اب تک کسی نہ کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو کر کام کرتے رہے تھے۔ لیکن پھر انھوں نے اپنی تنظیموں کو مستقل سیاسی جماعتوں کی شکل دے دی۔

جمعیت علمائے اسلام

اس جماعت کی بنیاد مولانا شبیر احمد عثمانی نے تقسیم ہند سے قبل ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو کلکتہ میں ڈالی تھی۔ یہ جماعت دارالعلوم دیوبند کے ان بلند پایہ علماء پر مشتمل تھی جنھوں نے ہندوستان کی آزادی میں اور اسلام کی نشر و اشاعت میں بڑا اہم حصہ لیا تھا۔ شروع میں دیوبند کے علمائے ہند نے پاکستان کی مخالفت کی تو علماء دیوبند کی ایک جماعت جمعیت علمائے ہند سے الگ ہو گئی اور جمعیت علمائے اسلام قائم کر کے اس نے پاکستان کی حمایت کی۔ ۱۹۴۹ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے انتقال کے بعد یہ تنظیم مردہ ہو گئی اور ۱۹۵۶ء میں جب اس کی تنظیم نو کی گئی تو اس کی قیادت ان علماء کے ہاتھ میں آ گئی جن کا تعلق جمعیت علمائے ہند سے تھا۔ لیکن اب یہ جماعت پاکستان کی پوری طرح وفادار ہو گئی اور نظریہ پاکستان کی علمبردار تھی۔ مفتی محمود جو پہلے جمعیت علمائے اسلام کے سکرٹری تھے۔ اس کے سربراہ تھے۔ انھوں نے پاکستان کی سیاست میں بڑا اہم اور تعمیری انداز میں حصہ لیا تھا۔ مفتی محمود آخر وقت تک قومی اتحاد کے سربراہ رہے۔

جمعیت علمائے پاکستان

یہ جماعت ۱۹۴۸ء میں ملتان میں قائم کی گئی اور بریلوی مکتب فکر کے علماء پر مشتمل تھی۔ ۱۹۷۰ء تک یہ جماعت بے عملی کا شکار رہی۔ جون ۱۹۷۰ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے کنونشن میں اس

کی تنظیم نو کی گئی اور شاہ احمد نورانی اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اس جماعت نے قومی اسمبلی کی سات نشستیں حاصل کیں۔ ۱۹۷۳ء میں متحدہ قومی محاذ میں شامل ہوئی لیکن پھر نکل گئی۔ ۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد میں شامل ہوئی لیکن پھر اس سے بھی نکل گئی۔ اس جماعت کے رہنماؤں کا تعلق زیادہ تر اہل خانقاہ سے تھا اور یہ جماعت اصل دین سے زیادہ فروعات پر زور دیتی تھی۔ درود و سلام، نذر و نیاز، مزاروں کی زیارت، قبروں پر چڑھاوے، بزرگوں سے عقیدت میں غلو وہ مسائل ہیں جن پر یہ جمعیت زیادہ زور دیتی ہے اور اسی وجہ سے اس گروہ کے لوگوں کو نئی جماعت کی تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی ورنہ سیاسی اور اجتماعی مسائل میں دوسرے علماء سے کوئی اختلاف نہیں۔ جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان میں سب سے بڑا بنیادی فرق یہ تھا کہ جماعت اسلامی فروعات پر زور نہیں دیتی تھیں اور وہ اپنے حامیوں کو اس معاملے میں آزاد چھوڑ دیتی تھی، لیکن جمعیت علمائے پاکستان فروعات کو اہمیت دیتی تھی۔ اس کے سب سے ممتاز رہنما شاہ احمد نورانی تھے۔

پیپلز پارٹی

پیپلز پارٹی جس کے حالات پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں بھٹو کے بعد انتشار کا شکار ہو گئی۔ ایک گروپ جس کی قیادت مسٹر بھٹو کی بیوہ نصرت بھٹو اور بیٹی بے نظیر بھٹو کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ اصل پیپلز پارٹی ہونے کی دعویدار تھی۔ دوسرے گروپ نے سابق وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کی قیادت میں ترقی پسند پیپلز پارٹی قائم کر لی تھی۔ ایک اور گروپ جو بہت پہلے پیپلز پارٹی سے الگ ہو گیا تھا اس نے حنیف رامے سابق وزیر اعلیٰ پنجاب کی قیادت میں مساوات پارٹی قائم کر رکھی تھی۔ جے۔ اے رحیم جو پیپلز پارٹی کے بانیوں میں سے تھے اور کئی سال پارٹی کے جنرل سکرٹری رہے اور سابق وزیر قانون محمود علی قصوری تحریک استقلال میں شامل ہو گئے تھے۔ پیپلز پارٹی کے ایک اور بانی رہنما معراج محمد خاں نے جو کٹر اشتراکی نظریات کے علمبردار ہیں اپنی علیحدہ جماعت قائم کر لی تھی۔ پیپلز پارٹی کے بیشتر رہنما خصوصاً قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبر بدعنوانیوں کے جرم میں ملوث ہونے کی وجہ سے سات سال کے لیے انتخابات میں حصہ لینے کے حق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔

معیشت

پاکستان بنیادی طور پر زرعی ملک ہے۔ تیس سال سے اگر چہ صنعت کو مسلسل ترقی دی جا رہی ہے لیکن پاکستان ابھی تک صنعتی ملکوں کی صف میں نہیں آ سکا ہے۔ مصنوعات زیادہ تر اشیائے صرف سے تعلق رکھتی ہیں۔ کل پرزے بنانے اور آلات میں مشینیں تیار کرنے کی صنعت ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ پاکستان کی زرعی پیداوار میں گیہوں اور چاول اہم غذائی فصلیں ہیں اور روئی، گنا اور تمباکو اہم صنعتی فصلیں ہیں۔ پاکستان جب قائم ہوا تھا تو غلہ کی پیداوار میں خود مکتفی تھا۔ لیکن گزشتہ تیس سالوں میں آبادی میں اضافے کی نسبت سے پیداوار میں اضافہ نہیں ہو سکا اور ہر سال لاکھوں ٹن گیہوں درآمد کرنا پڑتا ہے۔ صرف چاول کی پیداوار اتنی ہے کہ اس کو فروخت کر کے قیمتی زرمبادلہ حاصل کیا جاتا ہے۔ زرعی پیداوار میں اضافہ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کو تقسیم پنجاب کے نتیجے میں راوی، ستلج اور بیاس کے پانی سے محروم ہونا پڑا جس کی وجہ سے حکومت کو ایک کثیر رقم دریائے سندھ، جہلم اور چناب کا پانی حاصل کرنے کے لیے متبادل نظام آبپاشی قائم کرنے پر صرف کرنا پڑی، اگر پاکستان مشرقی دریاؤں کے پانی سے محروم نہ کیا جاتا تو یہ رقم زراعت کی پیداوار بڑھانے پر صرف کی جاسکتی تھی۔

پاکستان میں گلہ بانی، افزائش نسل، ڈیری کی صنعت اور مرغبانی کے کاروبار کو وسعت دینے کی لامحدود گنجائش ہے، لیکن سوائے مرغبانی کے کسی اور کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی ہے۔

پاکستان میں معقول مقدار میں بارش چونکہ صرف شمالی علاقوں میں ہوتی ہے اس لیے آبپاشی کا انحصار زیادہ تر نہروں پر ہے اور پاکستان کا نہری آبپاشی کا نظام دنیا کے عظیم ترین نظاموں میں سے ایک ہے۔ جہلم پر منگلا بند اور سندھ پر تربیلا بند دنیا کے بڑے اور کثیر المقاصد آبی ذخیروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان بندوں سے زراعت کے لیے پانی حاصل کرنے کے علاوہ بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے اور سیلابوں پر بھی قابو رکھا جاتا ہے۔

پاکستان ابھی تک فی ایکڑ زرعی پیداوار بڑھانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوا ہے اور اس معاملے میں ہندوستان سے بھی پیچھے ہے جہاں مشرقی پنجاب اور راجستھان میں فی ایکڑ پیداوار بڑھانے میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کئی سال سے کیمیاوی کھاد کا استعمال بڑھ رہا ہے

اوراب کیمیادی کھاد کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں اور قائم کیے جارہے ہیں اور توقع ہے کہ اگلے چند سالوں میں پاکستان فی ایکڑ پیداوار بڑھانے میں کافی کامیاب ہو جائے گا۔ مستقبل میں دریاؤں پر مزید بند بنا کر پانی بھی زیادہ مقدار میں حاصل کیا جاسکتا ہے اور مزید زمین زیر کاشت لائی جاسکتی ہے۔ بلوچستان جو ملک کے نصف رقبہ پر محیط ہے زیادہ تر بنجر ہے اور یہاں ابھی تک آبی وسائل کو ترقی نہیں دی گئی ہے حالانکہ اس کی کافی گنجائش موجود ہے۔

پاکستان سوتی کپڑے کی صنعت میں نہ صرف خود مکتفی ہے بلکہ کپڑا برآمد کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ کپڑے کی صنعت کو گزشتہ سالوں میں سخت نقصان پہنچا تھا لیکن مارشل لاء کے قیام کے بعد اب اس صنعت میں بحالی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ سیمنٹ سازی، شکر سازی، چمڑے اور پلاسٹک کی صنعتیں ملک کی دوسری اہم صنعتیں ہیں۔ اب پاکستان بھاری صنعت کے میدان میں داخل ہو رہا ہے۔ آلات اور اوزار سازی کی صنعتیں قائم کی جارہی ہیں۔ جہاز سازی کی صنعت بھی خاصی ترقی یافتہ ہے اور بیرونی ملکوں کے لیے بحری جہاز تیار کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ انجن اور دوسرے اہم کل پرزے ملک میں نہیں بنائے جاتے بلکہ درآمد کیے جاتے ہیں۔ کراچی میں فولاد سازی کا ایک بڑا کارخانہ روس کی مدد سے زیر تعمیر ہے۔ توقع ہے کہ ۱۹۸۰ء سے یہ کارخانہ کام شروع کردے گا۔ کارخانہ کی گنجائش دس لاکھ ٹن فولاد سالانہ ہے۔ جس کو بعد میں مزید بڑھایا جاسکے گا۔

کراچی، حیدر آباد، ملتان، فیصل آباد (لائل پور) اور لاہور سب سے بڑے صنعتی مرکز ہیں۔ چند سال سے راولپنڈی اور ہری پور کے درمیان ایک نیا صنعتی علاقہ وجود میں آرہا ہے۔ اسلحہ سازی کا کارخانہ، ہیوی میکینکل کمپلکس اور ہیوی فاؤنڈری اور ٹیلیفون کے آلات کا کارخانہ اس علاقے کے اہم کارخانے ہیں۔ اگر ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۷ء کی مدت میں صنعتی ترقی کو دھکا نہ لگا ہوتا تو پاکستان اس وقت صنعتی میدان میں بہت آگے جا چکا ہوتا۔ اگر موجودہ صنعتی ترقی جاری رہی تو توقع ہے کہ اگلے دس سالوں میں پاکستان بھاری صنعت کے میدان میں داخل ہو جائے گا بلکہ اسلحہ میں پاکستان خود مکتفی ہے۔

شمال کے دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں شاہراہ قرہ قرم کی تعمیر انجینئرنگ کا ایک بڑا کارنامہ ہے جو چین کی مدد سے اٹھارہ سال کی مدت میں جون ۱۹۷۸ء کو مکمل ہوا۔ اس سڑک کی تعمیر کے بعد پاکستان اور چین کے درمیان ہر موسم میں آمد و رفت ہو سکتی ہے۔

پاکستان میں معدنیات کی بہت کمی ہے۔ اب تک لوہے کے جو ذخیرے دریافت ہوئے ہیں ان کی مقدار زیادہ نہیں اور اچھے قسم کا لوہا بھی نہیں ہے۔ کوئلہ بھی کم نکلتا ہے اور اعلیٰ قسم کا نہیں۔ پٹرول کے ذخیرے مسلسل تلاش کیے جارہے ہیں لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ ضرورت کا صرف دس پندرہ فیصد تیل نکلتا ہے۔ ہاں قدرتی گیس کے معاملے میں پاکستان خوش قسمت ہے اور اس سے وسیع پیمانے میں کام لیا جارہا ہے۔ کراچی سے اسلام آباد تک گیس لائن ڈال دی گئی ہے اور گیس نہ صرف گھریلو ضروریات کے کام آرہی ہے بلکہ بجلی پیدا کرنے اور دوسرے صنعتی کاموں میں بھی استعمال کی جارہی ہے۔ گیس کے وسائل نے کوئلہ اور ایندھن کی کمی کو ایک حد تک پورا کردیا ہے۔

تعلیم اور صحافت

تعلیم کے میدان میں ترقی ہر لحاظ سے مایوس کن رہی ہے۔ اگرچہ ملک میں متعدد یونیورسٹیاں موجود ہیں اور نئی یونیورسٹیاں، کالج اور فنی اور پیشہ ورانہ تعلیمی ادارے قائم ہوتے جارہے ہیں لیکن ان کا معیار برابر گر رہا ہے۔ خاص طور پر پیپلز پارٹی کے دور میں تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد تعلیمی معیار اور گر گیا ہے۔ پاکستان میں اب تک اعلیٰ تعلیم پر توجہ دی گئی ہے جس کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستانی ڈاکٹر، انجینئر اور دوسرے فنی ماہر بڑی تعداد میں خلیج فارس کے عرب ملکوں اور افریقہ کے کم ترقی یافتہ ملکوں کی ضرورت پوری کر رہے ہیں۔ اور پاکستان کے لیے قیمتی زرمبادلہ فراہم کر رہے ہیں۔ لیکن تعلیم کو عام کرنے کی ابھی تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اور پاکستان میں خواندگی کا فی کس تناسب بہت کم ہے۔ اور تمام بڑے اسلامی ملک اس میدان میں پاکستان سے آگے ہیں۔ تعلیمی نظام کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ ابھی تک بیشتر تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیمی نظام میں ابھی تک کوئی اہم تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ صرف دینی تعلیم ابتدائی مدرسوں میں لازمی ہے۔ مختلف علوم کی تعلیم خالص مغربی نقطۂ نظر سے دی جاتی ہے جس کی وجہ سے فارغ التحصیل طلبہ دنیوی مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔ مارشل لاء کی حکومت کے دوران گزشتہ دو سال میں اس کمی کو دور کرنے کی نیم دلانہ کوشش کی گئی ہے۔ دینی تعلیم کے اگرچہ ملک میں

بکثرت مدرسے ہیں لیکن تقریباً سب قدیم طرز کے ہیں۔ بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ دینی تعلیم کی جدید طرز کی ایک اچھی درسگاہ ہے اور اب سعودی حکومت کے تعاون سے لاہور میں شریعت کالج قائم کیا جارہا ہے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد میں ایک شریعت فیکلٹی قائم کی گئی ہے۔

پاکستان میں صحافت ترکی اور مصر کے بعد سب سے ترقی یافتہ ہے۔ روزنامہ جنگ کراچی سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار ہے جو تقریباً 1/2 ۲ لاکھ چھپتا ہے۔ لاہور میں مشرق (پونے دو لاکھ)، نوائے وقت (1/2 ۱ لاکھ) اور امروز (ستر ہزار) سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اردو اخبار ہیں۔ انگریزی اخباروں میں ڈان' کراچی اور پاکستان ٹائمز، لاہور سب سے زیادہ چھپتے ہیں۔ اور ان کی اشاعت پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ روزنامہ جسارت کراچی (اردو) جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کو پیش کرتا تھا۔ اور کراچی میں جنگ کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار ہے۔ روزنامہ مساوات پیپلز پارٹی کا ترجمان تھا۔ جنگ اور نوائے وقت آزاد اخبار ہیں۔ مشرق اور پاکستان ٹائمز نیشنل پریس ٹرسٹ کے تحت نکلتے ہیں جو ایک سرکاری ادارہ ہے جسے ایوب خان کے زمانہ میں قائم کیا گیا تھا۔ پاکستانی اخبارات کی اشاعت زیادہ نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان کے اخبار موجود ہیں۔ چنانچہ کراچی سے اردو اور انگریزی کے اخباروں کے علاوہ سندھی اور گجراتی میں بھی اخبار شائع ہوتے ہیں۔ عام پسند ماہناموں کی کثرت ہے اور اشاعت بھی زیادہ ہے لیکن علمی اور ادبی رسالوں کی تعداد محدود ہے ادبی رسالوں کا معیار خاصا بلند ہے۔ لیکن علمی اور تحقیقی رسالوں کا معیار زیادہ بلند نہیں اور اشاعت بھی محدود ہے۔

پاکستان کی علمی شخصیتوں میں سب سے نمایاں نام سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ہے۔ جن کا حال ہی میں ۲۔ ستمبر ۱۹۷۹ء، ۱۳۹۹ھ کو انتقال ہوا ہے۔

مولانا مودودی (۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء تا ۱۳۹۹/۱۹۷۹ء)

سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۵۔ ستمبر مطابق ۳/ رجب ۱۳۲۱ھ، ۱۹۰۳ء کو ہندوستان کے شہر اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے تھے۔ بائیس سال کی عمر میں روزنامہ الجمعیت، دہلی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے جو جمعیۃ علمائے ہند کا ترجمان تھا۔ ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد (دکن) سے ماہنامہ ترجمان

القرآن جاری کیا جو اب تک جاری ہے۔ اس کے ذریعہ انھوں نے روایتی طریقے سے ہٹ کر اسلام کا انقلابی تصور پیش کیا اور تحریک احیائے اسلام کی بنیاد ڈالی۔ جب وہ اس رسالے کے ذریعے اپنے خیالات کی وضاحت کر چکے تو ۱۹۴۱ء، ۱۳۶۰ھ میں انھوں نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے اسلامی آئین کی تیاری، اسلامی نظام کے قیام کے اور آمریت کے خلاف اور جمہوریت کی بحالی کے لیے جو جدوجہد کی اس کا تذکرہ جماعت اسلامی کے حالات کے تحت پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

اس ساری جدوجہد میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ایک بااصول سیاست دان کی حیثیت سے ان کا کردار ہے۔ انھوں نے ساری عمر اپنے اصولوں کو ترک کر کے مفاہمت نہیں کی اور ہر قسم کی قربانی پیش کی۔ چار مرتبہ وہ گرفتار ہوئے اور ایک مرتبہ ان کو مارشل لاء کے تحت سزائے موت کا حکم بھی سنایا گیا لیکن وہ اپنے مقررہ راستے سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ ہم ان کو بلاخوف تردید پاکستان کی سیاست کا مرد بزرگ اور نظریہ پاکستان کا عظیم ترین علمبردار کہہ سکتے ہیں۔ وہ جماعت اسلامی کی تشکیل کے بعد سے ۱۹۷۲ء تک جماعت اسلامی کے امیر رہے۔ لیکن اس کے بعد بھی ضعیفی اور صحت کی کمزوری کے باوجود اپنے بیانات اور مشوروں سے قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔

فروری ۱۹۷۹ء میں سعودی عرب کی شاہ فیصل فاؤنڈیشن نے ساری دنیا کے مسلمان دانشوروں سے مشورے کے بعد مولانا مودودی کو ان کی اسلامی خدمات پر شاہ فیصل ایوارڈ دیا جو نوبل انعام کی طرز پر اسلامی دنیا کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا ہے اور جس کا ملنا اسلامی دنیا سے مولانا مودودی کی خدمات کا اعتراف ہے۔ مولانا مودودی کا ۲۲۔ ستمبر ۱۹۷۹ء کو جبکہ وہ علاج کے لیے اپنے بیٹے کے پاس امریکہ گئے ہوئے تھے انتقال ہو گیا۔ لاہور میں ان کا جلوس جنازہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔

مولانا مودودی صرف ایک عظیم سیاست داں ہی نہیں ہیں وہ ایک عظیم مفکر اور مصنف بھی ہیں۔ وہ اب تک چھوٹی بڑی ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں جن کے صفحات کی تعداد اٹھارہ ہزار سے زیادہ ہے۔ ان کی چند اہم کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ **الجہاد فی الاسلام:** یہ مولانا مودودی کی پہلی اہم تصنیف ہے۔ جبکہ ان کی عمر صرف ۲۵ سال تھی۔ جہاد کے موضوع پر اس سے بہتر کتاب کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

۲۔ "دینیات" یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات پر مختصر لیکن جامع کتاب ہے۔ مولانا کی تصانیف میں سب سے مقبول کتاب یہی ہے۔ اس کا دنیا کی تیس سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۳۔ خطبات: یہ ارکان اسلام پر ایک اور فکر انگیز کتاب ہے۔ اس میں اسلام کی حقیقت اور ارکان اسلام پر دلچسپ اور آسان زبان میں روشنی ڈالی ہے۔

۴۔ تفہیم القرآن: یہ چھ جلدوں میں قرآن کی تفسیر اور اس کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ قرآن کی بہترین تفسیروں میں سے ایک ہے۔ موجودہ دور میں اسلام کے انقلابی پیغام کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر تفسیر شاید کوئی دوسری نہیں۔

۵۔ اسلامی ریاست: اسلام کے سیاسی افکار پر انتہائی جامع اور فکر انگیز کتاب ہے۔

۶۔ تنقیحات: مغربی افکار اور اسلامی فکر کی کشمکش کے موضوع پر ایک بے مثل اور فکر انگیز کتاب ہے۔

۷۔ تجدید واحیائے دین: مختصر کتابچہ ہے جس میں تاریخ اسلام کے ممتاز مجددین کی خدمات اور کارناموں کا تنقیدی اور فکر انگیز تجزیہ ہے۔

۸۔ خلافت وملوکیت: اس کتاب میں مولانا نے بتایا ہے کہ خلافت کیا ہے اور اسلامی خلافت کس طرح ملوکیت میں تبدیل ہوئی۔ اپنے موضوع پر ایک بے مثل کتاب ہے۔

۹۔ سیرت سرور عالم: حضور کی سیرت پر انتہائی عمدہ کتاب ہے۔ اور ابھی مولانا اس کی تکمیل میں مصروف تھے کہ انتقال ہو گیا۔ اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا نے اسلام کے معاشی تصورات [۱]، اسلامی قانون [۲] اور اس کے عملی نفاذ، اسلامی تعلیم [۳]، اسلامی [۴] تہذیب اور اسلام [۵] کے عائلی قوانین پر بھی اہم کتابیں لکھی ہیں۔

---

(۱) معاشیات اسلام، اسلام اور جدید معاشی نظریات اور سود اس موضوع پر اہم ترین کتابیں ہیں۔

(۲) اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر۔

(۳) تعلیمات۔

(۴) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی۔

(۵) حقوق الزوجین۔

پاکستان اور اسلامی دنیا کی سیاست حاضرہ سے متعلق مولانا مودودی کے نظریات ان کی تقریروں، سیاسی بیانات اور اخباری ملاقاتوں پر مشتمل مجموعوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ (۱)

مولانا مودودی کی تصانیف اور تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ہر بات دلیل کے ساتھ پیش کی ہے اور اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کیا ہے۔ اسلامی علوم کے ساتھ چونکہ ان کی نظر مغربی علوم پر بھی گہری ہے اس لیے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کی کتابوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے جو دوسرے اہل علم کو حاصل نہیں ہوئی مسیحی مصنف مسٹر اسمتھ نے مولانا مودودی کو جدید اسلامی دنیا کا مربوط فکر رکھنے والا سب سے بڑا مفکر قرار دیا ہے۔ (۲) پاکستان اور اسلامی دنیا کی سیاست میں جماعت اسلامی کے اثرات اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہیں لیکن مولانا مودودی کے افکار نے ان لوگوں کو بھی متاثر کیا ہے جو جماعت اسلامی کی پالیسی سے متفق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی سیاست اور معاشرہ پر مولانا کے افکار کی چھاپ ہر جگہ نظر آئے گی۔

مشاہیر علم وادب

مولانا مودودی کے بعد جن مصنفین نے علمی، تحقیقی اور فکری میدان میں وسیع پیمانے پر نمایاں کام کیا ہے ان میں حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی صلاحیتوں کا بین الاقوامی طور پر بھی اعتراف کیا گیا ہے:

خلیفہ عبدالحکیم (۱۸۹۵ء تا ۱۹۵۹ء) ایک ممتاز اور ذہین فلسفی تھے۔ اقبال اور مولانا روم پر سند کی حقیقت رکھتے تھے۔ اس موضوع پر فکر انگیز کتابیں لکھیں جو بیشتر اردو میں ہیں۔ انگریزی زبان میں ان کی سب سے اہم کتاب (Islamic Ideology 1969) ہے۔ ۱۹۵۰ء میں لاہور میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کر کے پاکستان میں وہی خدمت انجام دی جو شبلی اور سید سلیمان ندوی نے ہندوستان میں دار المصنفین (اعظم گڑھ) قائم کر کے

---

(۱) (i) مولانا مودودی کی تقاریر مرتبہ ثروت صولت جلد اول اور دوم۔ اس مجموعہ کی آٹھ مزید جلدیں زیر طبع ہیں۔
(ii) مولانا مودودی کے انٹرویو مرتبہ ابوطارق (دو جلد) یہ دونوں مجموعے اسلامک پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔

(۲) اسلام ان موڈرن ہسٹری (انگریزی) ص ۲۳۶ (۱۹۶۱ء)

انجام دی۔ یہ ادارہ اب تک ایک سو سے زیادہ کتابیں اردو اور انگریزی میں شائع کر چکا ہے۔ اگرچہ ان سب کا معیار دارالمصنفین کے برابر نہیں۔

غلام رسول مہر (۱۸۹۵ء تا ۱۹۷۱ء) انھوں نے تحریک مجاہدین پر بنیادی اہمیت کا کام کیا۔ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں سیرت سید احمد شہید، سرگزشت مجاہدین اور جماعت مجاہدین سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (پیدائش ۱۹۰۳ء) پاکستان کے ممتاز ترین مورخ ہیں۔ انھوں نے اپنی علمی اور ادبی زندگی کا آغاز اردو ڈرامے لکھ کر کیا، لیکن بعد میں برصغیر کی اسلامی تاریخ کو اپنا موضوع بنالیا۔ ان کی تمام اہم کتابیں انگریزی میں ہیں چند کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ سلطنت دہلی کا نظم ونسق۔ ۲۔ سلطنت مغلیہ کا نظم ونسق۔ ۳۔ برصغیر پاکستان وہند کی ملت اسلامیہ۔ ۴۔ علماء اور سیاست۔ ۵۔ اکبر اعظم' ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۴ء پاکستان کی مرکزی کابینہ میں وزیر بھی رہے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کولمبیا یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر رہے۔ اس کے بعد صدر ایوب نے ان کو نو تعمیر ادارۂ تحقیقات اسلامی کا پہلا ڈائرکٹر مقرر کیا۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء تک وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور ان کی کوششوں سے اردو کو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور یونیورسٹی میں شعبۂ تالیف وترجمہ قائم کیا گیا۔

غلام احمد پرویز (پیدائش ۱۹۰۳ء) اسلامی افکار کی وضاحت اور پاکستان کے مسائل کا علمی انداز میں تجزیہ اور تحلیل کرنے کے سلسلے میں مولانا مودودی کے بعد سب سے زیادہ کتابیں غلام احمد پرویز نے لکھیں۔ لیکن ان کی کمزوری یہ ہے کہ ان کے بعض عقائد مسلمانوں کے مسلمہ عقائد کے خلاف ہیں اور وہ سنت رسول کو قانون سازی میں آئینی اور بنیادی اہمیت دینے سے انکار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی تحریروں نے فکری دنیا میں ایک ہل چل پیدا کرنے کے علاوہ کوئی تعمیری کام انجام نہیں دیا اور ان کے افکار کو علمی حلقوں میں زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

دینی میدان میں مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر قرآن ''تدبر قرآن'' جدید طرز کی بلند پایہ تفسیر ہے۔ اور مفتی محمد شفیع کی تفسیر معارف القرآن جو آٹھ جلدوں میں ہے مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ مفتی محمد شفیع نے مختلف اہم معاشرتی مسائل پر بکثرت کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن ان کا انداز قدیم اور روایتی ہے۔

ادبی نقادوں میں سید وقار عظیم (۱۹۰۹ء تا ۱۹۷۵ء)، ڈاکٹر سید عبداللہ (پیدائش ۱۹۰۴ء) جمیل جالبی (پیدائش ۱۹۲۸ء) اور محمد حسن عسکری (متوفی ۱۹۷۸ء) اور سلیم احمد (پیدائش ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۷ء) کے نام اہم ہیں۔ اگرچہ یہ تمام نقاد اسلامی فکر رکھتے ہیں لیکن محمد حسن عسکری نے اسلامی ادب اور اس کے نظریہ کی وضاحت اور تشکیل کے سلسلے میں تخلیقی نوعیت کا کام کیا ہے۔ اگرچہ وہ اس کام کو زیادہ عرصے جاری نہ رکھ سکے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

شاعروں میں جوش ملیح آبادی (پیدائش ۱۸۹۴ء)، حفیظ جالندھری پیدائش ۱۹۰۰ء) احسان دانش (پیدائش ۱۹۱۴ء) اور ماہر القادری (۱۹۰۷ء تا ۱۹۷۸ء) قیام پاکستان سے پہلے ہی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے اردو شاعری میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا۔ احسان دانش نے نظم سے زیادہ اردو لغت اور نثر کی خدمت کی اور ماہر القادری نے چند اچھی نعتیں اور نظموں کا اضافہ کیا۔ ماہر القادری نے اردو ادب کو اسلامی رنگ دینے میں اپنے رسالہ فاران کے ذریعے قابل قدر کام کیا۔ احمد ندیم قاسمی (پیدائش ۱۹۱۶ء) کی شاعری بھی دونوں دوروں سے تعلق رکھتی ہے، لیکن وہ شاعر سے زیادہ افسانہ نگار کی حیثیت سے کامیاب ہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کی حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اگرچہ اشتراکی رجحان رکھتے ہیں لیکن ان کی تحریروں میں مذہب بیزاری نہیں پائی جاتی۔

قیام پاکستان کے بعد جن شاعروں نے شہرت حاصل کی ان میں سرفہرست فیض احمد فیض (پیدائش ۱۹۱۱ء) ہیں۔ لیکن ان کی غزلیں اور قطعے جتنے دلکش ہیں نظمیں اتنی ہی پھیکی ہیں۔ نظریاتی طور پر وہ کمیونسٹ ہیں اور لینن انعام حاصل کر چکے ہیں۔ پاکستان کے موجودہ شاعروں میں عبدالعزیز خالد (پیدائش ۱۹۲۷ء) کا نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ مغلق زبان ہونے کے باوجود پڑھنے والا ان کے کلام میں ایک نیا انداز اور نیا پن محسوس کرتا ہے۔

افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ اردو ناول اور افسانہ تقسیم سے قبل ہی جدید ترین فنی معیار پر پہنچ گیا تھا۔ وہ سطح اب بھی قائم ہے۔ لیکن پاکستان اہل قلم ان اوصاف میں ابھی تک کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہیں دے سکے ہیں۔ ڈرامہ نگاری کی سطح پست ہے۔ لیکن ریڈیو ڈرامہ نے بہت ترقی کی ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کے علمی اور تنقیدی ادب میں اسلامی رجحان غالب ہے جبکہ افسانہ، ناول اور ڈرامہ میں یا تو اشتراکی عنصر کا غلبہ ہے یا پھر غیر

وابستہ ادیبوں کا۔ اردو افسانے، ناول اور ڈرامے میں اسلامی رجحانات شروع ہی سے کمزور ہیں۔ صرف تاریخ ناول نگاری میں اسلامی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ سیاسی شاعری کے سب سے بڑے نمائندے شورش کاشمیری (۱۹۱۷ء تا ۱۹۷۵ء)، حمید نظامی (۱۹۱۸ء تا ۱۹۶۲ء)، الطاف حسن قریشی اور محمد صلاح الدین مدیر جسارت کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو کے علاوہ مقامی زبانوں میں سب سے زیادہ تخلیقی کام سندھی میں ہوا ہے۔

پاکستان کے گورنر جنرل اور صدر

قائداعظم محمد علی جناح ——— اگست ۱۹۴۷ء تا ستمبر ۱۹۴۸ء

خواجہ ناظم الدین ——— ستمبر ۱۹۴۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۱ء

غلام محمد ——— اکتوبر ۱۹۵۱ء تا ستمبر ۱۹۵۵ء

سکندر مرزا ——— ستمبر ۱۹۵۵ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء

ایوب خاں ——— اکتوبر ۱۹۵۸ء تا فروری ۱۹۶۹ء

جنرل یحییٰ خاں ——— فروری ۱۹۶۹ء تا ۲۔ دسمبر ۱۹۷۱ء

ذوالفقار علی بھٹو ——— ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء

چودھری فضل الٰہی ——— ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۷ء

جنرل ضیاء الحق ——— ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۸ء

پاکستان کے وزیراعظم

لیاقت علی خان ——— اگست ۱۹۴۷ء تا اکتوبر ۱۹۵۱ء

خواجہ ناظم الدین ——— اکتوبر ۱۹۵۱ء تا اپریل ۱۹۵۳ء

محمد علی بوگرا ——— اپریل ۱۹۵۳ء تا اگست ۱۹۵۵ء

چوہدری محمد علی ——— اگست ۱۹۵۵ء تا ستمبر ۱۹۵۶ء

حسین شہید سہروردی ——— ستمبر ۱۹۵۶ء تا ستمبر ۱۹۵۷ء

چندریگر ——— ستمبر ۱۹۵۷ء تا دسمبر ۱۹۵۷ء

ملک فیروز خاں نون ——— دسمبر ۱۹۵۷ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء

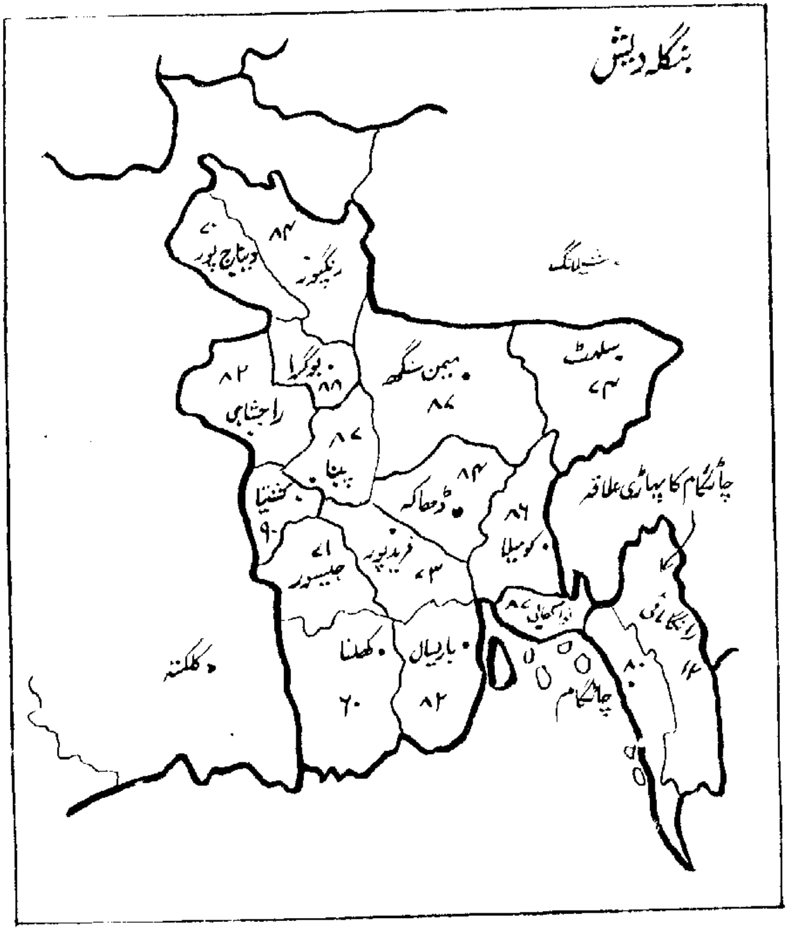
ذوالفقار علی بھٹو ——— ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۷ء

بنگلہ دیش

(مسلمانوں کی آبادی)

پاکستان کے مقابلے میں بنگلہ دیش میں غیر مسلم آبادی کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ بنگلہ دیش کی پانچ کروڑ آٹھ لاکھ آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۴ کروڑ ۸ لاکھ ہے۔ مسلمان کل آبادی کا ½۸۰ فیصدی ہیں اور غیر مسلم ½۱۹ فیصدی۔ ''ضلع چاٹگام کا پہاڑی علاقہ'' میں مسلمانوں کا تناسب صرف ۱۲ فیصدی ہے اور یہ مسلم اقلیت کا ضلع ہے۔ غیر مسلم آبادی کا دوسرا بڑا مرکز ضلع کھلنا ہے جہاں غیر مسلموں کا تناسب تقریباً چالیس فیصدی ہے۔ اس ضلع کی ایک تحصیل کھلنا سب ڈویژن میں غیر مسلم آبادی کا تناسب ۴۵ فیصدی ہے۔ اس ضلعے کے کئی تھانے ایسے ہیں جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اسی طرح ضلع فرید پور میں گوپال گنج سب ڈویژن میں ہندو آبادی کا تناسب ۵۱ فیصدی ہے۔ سلہٹ کے سب ڈویژن مولوی بازار میں اور جیسور کے سب ڈویژن نرائل میں بھی ہندو آبادی کا تناسب بالترتیب ۴۳ اور ۴۴ فیصدی ہے۔

نقشے میں دیے ہوئے ہندسے ضلع میں مسلمان آبادی کا فی صدی تناسب ظاہر کرتے ہیں۔



بنگلہ دیش
۷۰
دیناج پور
۸۴
رنگپور
شیلانگ
بوگرا
۸۸
۸۲
راجشاہی
میمن سنگھ
۸۷
سلہٹ
۷۴
۸۷
پبنا
کشتیا
۹۰
۸۴
ڈھاکہ
۸۶
کومیلا
چاٹگام کا پہاڑی علاقہ
۷۱
جیسور
فرید پور
۷۳
۸۷
نواکھالی
رانگامٹی
۱۴
کلکتہ
کھلنا
۶۰
باریسال
۸۲
۸۰
چاٹگام

باب ۱۰

بنگلہ دیش

تاریخی پس منظر

پرانے زمانے میں ہندوستان کے شمال مشرقی حصے کو جہاں بنگالی زبان بولی جاتی تھی بنگ یا بنگالہ کہا جاتا تھا۔ اس میں وہ حصہ بھی شامل تھا جو اب بنگلہ دیش ہے اور وہ حصہ بھی جو اب ہندوستان کی ریاست بنگال کہلاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے باشندے ہندومت اور بدھ مت کے پیرو تھے۔ عام طور پر یہاں آزاد حکومتیں قائم رہیں، لیکن جب کبھی شمالی ہند میں کوئی مضبوط مرکزی حکومت قائم ہو جاتی تھی تو بنگال پر بھی اس کی بالادستی قائم ہو جاتی تھی۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہاں سینا خاندان کی حکومت قائم تھی۔ جو ہندو مذہب کا پیرو تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری کے آخری زمانہ میں دہلی کے والی قطب الدین ایبک کے سپہ سالار محمد بختیار خلجی نے جب ۵۹۶ھ، ۱۲۰۰ء کے قریب بنگال پر حملہ کیا تو یہاں کے راجہ کا نام لچھمن یا لکشمن سین تھا اور بہار کا صوبہ بھی اس کی حکومت میں شامل تھا۔ یہ راجہ مسلمانوں کی مختصر سی فوج کا بھی مقابلہ نہ کر سکا اور دارالحکومت نادیا کو چھوڑ کر مشرقی بنگال کے اس حصے میں پناہ گزیں ہو گیا جہاں اب ڈھاکہ کا شہر واقع ہے۔ باقی بنگال اور بہار سلطنت دہلی کا ایک حصہ بن گئے۔ ۱۲۴۵ء میں مشرقی بنگال بھی مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور سین خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۲۰۰ء، ۵۹۲ھ سے ۱۳۳۸ء، ۷۳۷ھ تک بنگال سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا اور یہاں دہلی سے صوبیدار مقرر ہوتے رہے۔ ۱۳۳۸ء، ۷۳۷ھ میں سلطان محمد تغلق کے دور میں یہاں کے مسلمان صوبیدار نے بغاوت کر دی اور بنگال کی آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی۔ فیروز تغلق کے زمانے تک بنگال کی حکومت دہلی کی بالادستی تسلیم کرتی رہی لیکن اس کے بعد قطعی آزاد ہو گئی۔ اس زمانے میں یہاں کئی خاندانوں نے حکومت کی اور ۱۴۸۷ء، ۸۹۲ھ سے ۱۴۹۳ء، ۸۹۹ھ تک حبشی غلاموں کی حکومت بھی رہی۔ ۱۵۳۸ء، ۹۱۵ھ میں شیر شاہ سوری نے بنگال پر قبضہ کر لیا۔

سوری خاندان کے بعد یہاں کرانی پٹھان قابض ہو گئے جن کو ۱۵۷۶ء، ۹۸۴ھ میں دہلی کے تیموری حکمران اکبر نے بیدخل کر دیا[1] اور بنگال کو ایک بار پھر سلطنت دہلی کا حصہ بنا دیا۔ ۱۵۷۶ء، ۹۸۴ھ سے ۱۷۴۰ء، ۱۱۵۳ھ تک بنگال، مرکزی حکومت کا ایک صوبہ رہا اور یہاں دہلی سے صوبیدار مقرر ہوتے رہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ خطبہ اور سکہ دہلی کے تیموری بادشاہ کا جاری رہا لیکن بنگال کے حکمران عملاً آزاد ہو گئے۔ یہ آزادی بہت مختصر ثابت ہوئی کیونکہ صرف سترہ سال بعد بنگال کے حکمران نواب سراج الدولہ کو ۲۲۔ جون ۱۷۵۷ء، ۱۱۷۰ھ کو پلاسی کی جنگ میں شکست دینے کے بعد انگریزوں نے بنگال پر قبضہ کر لیا۔ بنگال پر انگریزوں کا قبضہ پورے برصغیر کی غلامی کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور نوے سال کی مختصر مدت میں برطانوی ہند کی سرحدیں افغانستان اور ایران سے جا ملیں۔

بنگال میں برطانوی اقتدار قائم ہونے تک اس صوبے پر مسلمانوں کی حکومت ساڑھے پانچ سو سال قائم رہی۔ یہ مدت اندلس میں مسلمانوں کے اقتدار کی مدت سے کم ہے اور یہاں اندلس جیسی علمی اور تمدنی ترقی بھی نہیں ہوئی۔ لیکن اندلس کے برخلاف یہاں اسلام کی توسیع اور اشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی جس کے نتیجے میں بنگال ایک مسلم خطہ میں تبدیل ہو گیا اور آج بنگلہ دیش کی حکومت آبادی کے لحاظ سے انڈونیشیا کے بعد دنیا کی دوسری سب سے بڑی مسلم مملکت ہونے کی دعویدار ہے۔ ہندوستان کے صوبے مغربی بنگال میں بھی مسلمانوں کا تناسب بیس فیصدی سے زیادہ ہے اور ایک ضلع میں ان کی واضح اکثریت ہے۔ اسی طرح آسام کے صوبہ میں کم از کم دو ضلعے ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کا تناسب چالیس فیصد کے لگ بھگ ہے۔ بنگلہ دیش کی تقریباً ۸۵ فیصد آبادی مسلمان ہے۔

برطانوی دور

برطانیہ کا دو سو سالہ دور بنگال کی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ برطانوی دور سے پہلے بنگال دنیا کے انتہائی خوشحال علاقوں میں شمار کیا جاتا تھا اور یورپ میں یہ مثل مشہور تھی کہ بنگال میں داخل ہونے کے ایک سو دروازے ہیں لیکن باہر جانے کا دروازہ ایک بھی نہیں۔ یعنی یہاں انسان

(۱) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوئم۔

کو اتنا عیش و آرام ملتا تھا کہ وہ بنگال آنے کے بعد جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ڈھاکہ کی ململ اپنی نفاست میں ساری دنیا میں مشہور تھی۔ لیکن برطانوی دور میں قحط اور افلاس عام ہو گئے اور بھوکا بنگالی ایک محاورہ بن گیا۔ مسلمانوں کو اس دور میں خاص طور پر بہت نقصان ہوا۔ مسلمانوں کو زمینوں اور جائیدادوں سے محروم کر دیا گیا۔ اور ان کی زمینیں ہندوؤں کو دے دی گئیں۔ نظام تعلیم ایسا نافذ کیا کہ مسلمان اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور سرکاری نوکریوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیے گئے۔ انگریزوں کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان غربت، افلاس اور جہالت کا شکار ہوتے گئے اور زمینیں، کاروبار، تجارت اور ملازمتیں ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلی جانے کی وجہ سے ہندو مال دولت اور عزت کے مالک بن گئے۔ (۱)

انیسویں صدی میں بنگالی مسلمانوں میں اس حالت کے خلاف ردِ عمل ہوا۔ سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں انھوں نے دل کھول کر حصہ لیا اور نہ صرف اس تحریک کو چلانے کے لیے روپے اور پیسے سے مدد کی بلکہ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں پہنچ کر انگریزوں کے خلاف جہاد میں شرکت بھی کی۔ تحریک جہاد کے دو ممتاز رہنما سید ولایت علی عظیم آبادی اور سید عنایت علی عظیم آبادی اگرچہ بہار سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کی طاقت کا اصل سرچشمہ بنگال کے دیہات تھے۔ تحریک جہاد کی ناکامی کے بعد خود بنگالی مسلمانوں میں کئی ممتاز رہنما پیدا ہوئے، جن میں فرائضی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ کا نام نمایاں ہے۔ ایک اور ممتاز رہنما نثار علی تیتو میر تھے جنھوں نے ہندوؤں کی اجارہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے ۱۸۳۱ء، ۱۲۴۷ھ میں شہید ہو گئے۔

تحریک جہاد اور فرائضی تحریک کا زور سیاسی آزادی حاصل کرنے سے زیادہ مسلمانوں کے معاشرہ کی اصلاح پر تھا۔ ان رہنماؤں کا خیال تھا کہ ہماری خرابیوں اور زوال کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام کی حقیقی تعلیمات سے دور ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی اخلاقی اصلاح کرنی چاہیے اور سچے مسلمان بننا چاہیے۔ بنگالی مسلمانوں کی بیداری کا دوسرا دور ۱۹۰۶ء، ۱۳۲۴ھ میں ڈھاکہ میں کل ہند مسلم لیگ کے قیام کے بعد سے شروع ہوا، جس کی تشکیل میں نواب صاحب

(۱) اس سلسلہ میں تفصیلات انگریز مصنف ولیم ہنٹر کی کتاب میں مطالعہ کیجیے جس کا ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کے نام سے اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

ڈھاکہ نے نمایاں حصہ لیا۔ سینکڑوں سال کے تاریخی عوامل نے اور برصغیر کی مرکزی حکومت سے مسلسل وابستگی نے بنگالیوں میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ ایک علیحدہ لسانی گروہ ہونے کے باوجود جغرافیائی اور سیاسی طور پر برصغیر پاکستان و ہند کا ایک حصہ ہیں اور مسلمان بنگالی برصغیر کی ملت اسلامیہ کا ایک حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب برطانوی ہند کے مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تو بنگال کے مسلمانوں نے اس مطالبہ کی حمایت کی۔ اس کے ساتھ ہی بنگالی مسلمانوں نے تقسیم بنگال کا مطالبہ بھی کیا کیونکہ انگریزوں نے بنگال کے نام سے جو صوبہ قائم کیا تھا اس میں مسلمانوں کی برائے نام اکثریت تھی اور اس میں ہندوؤں کی اجارہ داری قائم تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی بنگالی مسلمانوں کے اس مطالبہ کی تائید کی ۱۹۰۶ء، ۱۳۲۴ھ میں برطانوی حکومت نے یہ مطالبہ مان لیا اور مشرقی بنگال کے نام سے ایک نیا صوبہ قائم کر دیا گیا جس کا صدر مقام ڈھاکہ بنا اور جس میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی۔ لیکن ہندوؤں نے بنگال کی تقسیم کی اس شدت سے مخالفت کی کہ ۱۹۱۱ء میں یہ تقسیم منسوخ کر دی گئی اور بنگال کا سابقہ صوبہ بحال کر دیا گیا۔

پاکستان میں شمولیت

بنگال کے مسلمانوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے تحت اپنی آزادی کی جدوجہد جاری رکھی اور جب ۱۹۴۰ء، ۱۳۵۹ھ میں لاہور میں مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان منظور کی تو وہ بنگال ہی کے ایک ممتاز مسلمان رہنما مولوی فضل الحق نے پیش کی تھی۔ حکومت ہند کے ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جب صوبوں میں ۱۹۳۷ء میں حکومتیں قائم ہوئیں، تو مولوی فضل الحق بنگال میں وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اس کے بعد جب صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل ہوگئی تو ۱۹۴۳ء میں خواجہ ناظم الدین نے حکومت بنائی۔ ۱۹۴۷ء، ۱۳۶۶ھ میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تو متحدہ بنگال کے وزیراعظم مسلم لیگ کے ممتاز رہنما حسین شہید سہروردی تھے۔ اس کے بعد بنگال کو مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے دو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین مشرقی بنگال کے وزیراعظم مقرر ہوئے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس کے بعد مشرقی بنگال اسمبلی نے رضاکارانہ طور پر پاکستان کی مسلم مملکت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور اس طرح مشرقی بنگال

ہندوستان کی بجائے پاکستان کا ایک صوبہ بن گیا۔ صوبہ آسام کے ضلع سلہٹ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لیے قانون آزادی ہند کے تحت وہاں استصواب رائے عامہ کا انتظام کیا گیا اور وہاں کے باشندوں کی اکثریت نے پاکستان میں شامل ہونے کی حمایت میں ووٹ ڈالے۔ جس کے بعد ضلع سلہٹ مشرقی بنگال میں ملا دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء، ۱۳۷۵ھ کے آئین کے بعد مشرقی بنگال کا نام بھی بدل کر مشرقی پاکستان رکھ دیا گیا۔

خواجہ ناظم الدین جو مشرقی بنگال کے پہلے وزیر اعظم تھے قائد اعظم کے انتقال کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل ہو گئے اور تین سال بعد جب ۱۹۵۱ء، ۱۳۷۱ھ میں لیاقت علی خاں شہید کر دیے گئے تو خواجہ ناظم الدین پاکستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے غیر آئینی طریقے پر خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کی وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ ان کی اس برطرفی نے مشرقی پاکستان کے عوام پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ مشرقی پاکستان کو جس کی آبادی پورے ملک کی آبادی کا ۵۴ فیصد تھی اس کا جائز حق نہیں دیا جا رہا اور مغربی پاکستان کے رہنما فوج کی مدد سے مشرقی پاکستان کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

بہر حال جب ۱۹۵۶ء، ۱۳۷۵ھ کا آئین تیار ہوا تو مشرقی پاکستان کے تمام نمائندوں نے اس میں دی گئی صوبائی خود مختاری کو اور مرکزی حکومت میں مساوی نمائندگی کو تسلیم کر لیا۔ صرف دستور ساز اسمبلی کے ہندو ممبروں نے آئین کی مخالفت کی۔ لیکن جب ۱۹۵۸ء، ۱۳۷۸ھ میں پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں نے آئینی حکومت کو برطرف کر دیا اور ۱۹۵۶ء، ۱۳۷۵ھ کا آئین منسوخ کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا تو مشرقی پاکستان کے شکوک پھر تازہ ہو گئے اور وہاں علیحدگی پسند عناصر کا زور بڑھنے لگا جن کی پشت پناہی وہاں کی ہندو آبادی کر رہی تھی۔

عوامی لیگ اور بنگلہ دیش کا قیام

نوابزادہ لیاقت علی خاں کے انتقال کے بعد پاکستان مسلم لیگ انتشار کا شکار ہو گئی اور اس سے علیحدہ ہونے والوں نے مختلف سیاسی پارٹیاں بنا لیں۔ ان ہی میں ایک عوامی لیگ ہے۔ جسے مشرقی پاکستان کے ممتاز سیاسی رہنما حسین شہید سہروردی (متوفی ۱۹۶۳ء) نے ۱۹۵۲ء میں قائم

کیا تھا۔ ۱۹۵۴ء، ۱۳۷۴ھ میں مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات میں صوبہ کی دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر عوامی لیگ نے مسلم لیگ کے خلاف جگتو فرنٹ کے نام سے ایک متحدہ سیاسی محاذ بنایا۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو شکست فاش ہوئی۔ تین سو دس نشستوں میں سے مسلم لیگ کے صرف دس امیدوار کامیاب ہوئے۔ باقی امیدوار جگتو فرنٹ کے کامیاب ہوئے۔ عوامی لیگ پہلی مرتبہ صوبہ میں سب سے بڑی سیاسی پارٹی کی حیثیت سے ابھری۔ اس کے ۹۳ نمائندے کامیاب ہوئے۔ عوامی لیگ اور جگتو فرنٹ کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ بنگالی زبان کو بھی اردو کے ساتھ قومی زبان کا درجہ دیا جائے چنانچہ مئی ۱۹۵۴ء میں بنگالی کو بھی قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ جب تک حسین شہید سہروردی زندہ رہے اس وقت تک عوامی لیگ میں علیحدگی پسندی کے رجحانات نے زیادہ زور نہیں پکڑا لیکن دسمبر ۱۹۶۳ء میں ان کے انتقال کے بعد عوامی لیگ کی قیادت شیخ مجیب الرحمن کے ہاتھ میں آگئی جو نظریات کے لحاظ سے کٹر بنگالی قوم پرست تھے۔ انھوں نے مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کی کھل کر حمایت کی۔ صدر ایوب کی آمریت کے زمانہ میں ان رجحانات کو مزید تقویت ملی اور فروری ۱۹۶۶ء، ۱۳۸۵ھ میں شیخ مجیب الرحمن نے اپنے مشہور چھ نکات[1] پیش کیے جو بعد میں پاکستان کی تقسیم کا باعث بنے۔ دسمبر ۱۹۷۰ء، ۱۳۹۰ھ میں جب پاکستان کے پہلے عام انتخابات ہوئے تو ان میں مشرقی پاکستان کی ۱۶۹ نشستوں میں سے ۱۶۷ نشستوں پر عوامی لیگ کے امیدوار کامیاب ہوگئے۔ انتخابات میں کامیابی کے بعد شیخ مجیب الرحمن نے چھ نکات کی بنیاد پر پاکستان کا آئین بنانے کا اعلان کیا۔ لیکن چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان نے مسئلہ کو قومی اسمبلی اور مجلس دستور ساز میں طے کرنے کی بجائے مذاکرات سے طے کرنا چاہا اور جب مذاکرات کامیاب نہ ہوئے تو مشرقی پاکستان میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء، ۱۳۹۱ھ کو فوجی کارروائی شروع کردی جس کی تفصیل اسی کتاب میں پاکستان سے متعلق باب نمبر ۷ میں موجود ہے۔ ہندوستانی حکومت کی فوجی مداخلت کی وجہ سے یہ فوجی کارروائی کامیاب نہ ہوسکی اور ۱۷۔ دسمبر کو پاکستانی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے جنوری ۱۹۷۲ء میں مجیب

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے باب ۷ میں عنوان ''مشرقی پاکستان میں احساس محرومی''

الرحمن کو رہا کر دیا گیا اور جب وہ بنگلہ دیش پہنچے تو ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے ان کا بے مثل خیر مقدم کیا گیا اور ان کو ۱۲ جنوری کو بنگلہ دیش کا وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔

بنگلہ دیش ۲۴ سال تک پاکستان کا حصہ رہا۔ اس مدت میں معاشی میدان میں بنگلہ دیش نے کافی ترقی کی۔ چاٹگام کی بندرگاہ نے جو بہت معمولی بندرگاہ تھی ایک جدید طرز کی بین الاقوامی بندرگاہ کی شکل اختیار کر لی۔ چالنا میں ایک نئی بندرگاہ تعمیر ہوئی۔ پاکستان بننے سے پہلے بنگال کی ساری صنعت کلکتہ اور اس کے نواح میں مرتکز تھی اور مشرقی پاکستان کی حیثیت خام مال فراہم کرنے والے صوبے کی تھی۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد صنعت نے یہاں تیزی سے ترقی کی۔ ڈھاکہ اور کھلنا میں پٹ سن کے کارخانے قائم ہوئے۔ چندر گونا میں طباعت کے کاغذ کا کارخانہ اور کھلنا میں اخباری کاغذ کا کارخانہ قائم کیا گیا۔ یہ کارخانے اتنے بڑے تھے کہ پورے پاکستان کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ چاٹگام میں فولاد سازی کا کارخانہ بھی اسی زمانہ میں بنایا گیا جو پاکستان میں فولاد سازی کا پہلا کارخانہ تھا۔ کپڑے۔ شکر اور سیمنٹ کے کارخانے قائم کیے گئے۔ اس زبردست صنعتی ترقی کے نتیجے میں ڈھاکہ۔ نرائن گنج۔ کھلنا اور چاٹگام نے صنعتی شہروں کی شکل اختیار کر لی۔ ڈھاکہ جو پاکستان بننے سے پہلے ایک ضلع کا معمولی صدر مقام تھا۔ چوبیس سال کی مدت میں ملک کا بہت بڑا اور خوبصورت شہر بن گیا۔ تعلیمی ترقی بھی مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں زیادہ ہوئی۔ یہاں خواندگی کا تناسب مغربی پاکستان سے زیادہ تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے علاوہ جو پہلے سے قائم تھی انجینئرنگ اور ٹیکنیکل یونیورسٹی ڈھاکہ اور جہانگیر نگر یونیورسٹی ڈھاکہ بھی اسی دور میں قائم ہوئیں۔ بنگلہ زبان، ادب اور صحافت نے بھی تیزی سے ترقی کی۔ بنگال کی علمی اور ادبی زندگی پر پاکستان بننے سے پہلے ہندوؤں کا مکمل قبضہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ڈھاکہ سے بنگلہ اور انگریزی کے بلند پایہ اخبار نکلنے لگے اور بنگلہ زبان میں وسیع پیمانے پر اسلامی موضوعات پر کتابیں شائع ہونے لگیں۔ محقق ادیبوں میں ڈاکٹر شہید اللہ علماء اور مصنفوں میں مولانا اکرم خان اور شاعروں میں جسیم الدین اور کوی فرخ کے نام نمایاں ہیں۔ آزاد بنگالی زبان کا سب سے بڑا اور کثیر الاشاعت اخبار تھا۔ جس کے مالک مولانا اکرم خان تھے۔ آخری دور میں روزنامہ سنگرام اسلامی حلقوں کا سب سے بڑا ترجمان تھا۔ جس کو جماعت اسلامی سے متعلق لوگ نکالتے تھے۔

علیحدگی کے اسباب

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب معاشی نہیں تھے بلکہ سیاسی تھے۔ مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں نے مشرقی پاکستان کا معاشی استحصال کرنے کے لئے مغربی پاکستان پر جو الزامات لگائے ہیں وہ یا تو بے حقیقی ہیں یا مبالغہ آمیز۔ مشرقی پاکستان کا اصلی مسئلہ سیاسی محرومی کا تھا۔ مشرقی پاکستان کو آزادانہ جمہوری عمل کے ذریعہ کبھی اقتدار میں نہیں آنے دیا گیا بلکہ نوکرشاہی اور فوج کے دباؤ کے تحت جس پر مغربی پاکستان کی شروع سے اجارہ داری قائم تھی۔ مشرقی پاکستان پر حکم چلایا گیا۔ اس بات نے مشرقی پاکستان کے باشندوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کو ایک نوآبادی کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ اس سیاسی عمل کا سب سے زیادہ اثر سیاست دانوں پر پڑا اس لیے مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں نے مشرقی پاکستان کے معاشی استحصال کے مسئلہ کو آلہ کے طور پر استعمال کیا اور عوام کو گمراہ کرنے اور اپنا ہم خیال بنانے کے لیے اس سلسلہ میں انتہائی مبالغے سے کام لیا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اسلام یا نظریہ پاکستان کو تقویت دینے کی بجائے اس کو کمزور کیا گیا۔ پاکستان مسلمان قومیت کے نام پر قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اس قومیت کو جذباتی نعرہ کی شکل دے دی گئی اور وہ تقاضے پورے نہیں کیے گئے جو جداگانہ مسلم قومیت کو مستحکم کرنے کے لیے لازمی تھے ظاہر ہے مسلم قومیت کی بنیاد اسلام پر تھی۔ اگر اسلام کو ایک انقلابی سیاسی اور سماجی نظام کے طور پر پیش کیا جاتا اور اسلام کے مطابق زندگی کی ہر سطح پر تبدیلیاں لائی جاتیں اور اسلام سے وابستگی کو اولیت دی جاتی تو اہل پاکستان میں علاقائی اور لسانی تعصبات کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن جب اسلام سے حقیقی وابستگی اور وفاداری کمزور پڑ گئی تو ملک میں علاقائی اور لسانی تعصبات اور غیر اسلامی نظریات کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور آخر میں یہ تعصبات مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا باعث بنے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ خود پاکستان اور تحریک پاکستان کی بعض کمزوریاں پاکستان کی تقسیم کا باعث ہوئیں۔ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ کا نعرہ لگا کر پاکستان بنا تو لیا گیا۔ لیکن یہ نعرہ محض جذباتی رہا۔ مسلم لیگ کے پاس کوئی ایسا جامع انقلابی پروگرام نہیں تھا جو پاکستان بننے کے

بعد قوم کے سامنے پیش کیا جاتا۔ مسلم لیگ میں ہر قسم کے عناصر موجود تھے اور پارٹی کے پاس اسلام کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں میں اسلام پسندوں کے ساتھ کمیونسٹ، سوشلسٹ، بے دین، قوم پرست، مغرب پرست ہر خیال کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ نئے حالات کے تحت ملک کو ایک مربوط انقلابی قیادت نہیں دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں نظریاتی انتشار پیدا ہو گیا اور مسلم قوم پرستی کے دعویدار صوبہ پرستی اور علاقہ پرستی کے علمبردار بن گئے۔ اگرچہ زبان سے صوبہ پرستی کا نام نہیں لیا گیا لیکن مسلم لیگ کے رہنماؤں اور کارکنوں میں اسلامی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے اور عملاً یہ سب صوبہ پرستی کی ذہنیت کا شکار رہے۔

ایک اور کمزوری جو خود تخلیق پاکستان کے ساتھ پاکستان میں آئی وہ یہ تھی کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے دو حصوں کو جو ایک دوسرے سے اس قدر دور ہوں یکجا رکھنا آسان نہیں۔ ان کو صرف نظریاتی بنیاد پر متحد رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ نظریاتی بنیاد کبھی بھی حقیقی شکل اختیار نہیں کر سکی اور یہ فاصلہ دور سے دور ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

دوسری کمزوری جو تخلیق پاکستان کے ساتھ پاکستان کو ملی وہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کو پورے پاکستان میں واضح اکثریت حاصل تھی اور اس بات نے مغربی پاکستان کو خوفزدہ کر دیا کہ اگر یہاں جمہوری عمل رہا تو مشرقی پاکستان کو ہمیشہ غلبہ حاصل رہے گا۔ اس خوف کو دور کرنے کے لیے مغربی پاکستان کے رہنماؤں نے فوج اور نوکر شاہی کا سہارا حاصل کیا جس پر مغربی پاکستان کے لوگوں کا غلبہ تھا۔ یہ سہارا جمہوریت کشی اور آمریت کا باعث بنا اور آخر میں ملک کی تقسیم پر منتج ہوا۔

یہ ہیں وہ خاص خاص اسباب جو مشرقی پاکستان کے پاکستان سے علیحدگی کا باعث بنے۔ اگر مسلم لیگ کی تحریک محض ایک جذباتی قومی تحریک کے بجائے اسلامی انقلاب کی تحریک ہوتی اور اس تحریک کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آتا تو ملک کے دونوں بازوؤں کو نہ صرف متحد رکھا جا سکتا تھا بلکہ پاکستان کو ساری دنیا میں اسلامی انقلاب کے مرکز کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مسلم لیگ کی تحریک کی یہ بنیادی کمزوری پاکستان کی شکست وریخت کا باعث بنی اور اسی کمزوری کی وجہ سے پاکستان بننے کے بعد اسلامی انقلاب کی منزل قریب آنے کی بجائے اور دور ہو گئی۔ جماعت اسلامی نے پاکستان بننے کے بعد ملک کو اس صحیح راستہ پر تو رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی راہ میں

خود حکومت کی طرف سے مسلسل رکاوٹیں ڈالی گئیں اور اس تحریک کو کامیاب نہیں ہونے دیا گیا۔

شیخ مجیب الرحمن

بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کے بانی شیخ مجیب الرحمن ۱۷۔ مارچ ۱۹۲۰ء کو ضلع فرید پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ سے تاریخ اور علم السیاست میں بی۔اے کیا۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے انھوں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ کل ہند مسلم لیگ کی کونسل کے رکن رہے۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۶ء وہ اسلامیہ کالج کے طلبہ کی یونین کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۱۹۴۶ء میں بنگال اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ یہ بات کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے فوراً بعد وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے اور پاکستان مسلم اسٹوڈنٹس لیگ بنا کر انھوں نے اردو کی مخالفت شروع کر دی۔ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ شیخ مجیب الرحمن شروع ہی سے مسلم قومیت کی بجائے بنگال قومیت کے علمبردار تھے اور انھوں نے مسلم لیگ کے بہت سے دوسرے رہنماؤں کی طرح مسلم لیگ کا ساتھ محض اس لیے دیا کہ وہ اس زمانہ میں مقبول تحریک تھی۔ اور اس میں شامل ہو کر اقتدار حاصل کیا جا سکتا تھا۔

۱۹۵۲ء میں جب حسین شہید سہروردی نے عوامی لیگ قائم کی تو مجیب الرحمن نے اس کی تشکیل میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ عوامی لیگ کے جنرل سکریٹری ہو گئے اور مارچ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں وہ جگتو فرنٹ کے امیدوار کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کی تیاری میں انھوں نے حصہ لیا لیکن اس آئین میں صوبائی خود مختاری کی جو حدود مقرر کی گئی تھیں۔ مجیب الرحمن ان سے متفق نہیں تھے۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے عالمی امن کانفرنس، پیکنگ میں اور ۱۹۵۶ء میں عالمی امن کانفرنس، اسٹاک ہولم میں شرکت کی۔ اسی سال کے آخر میں وہ پارلیمانی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اشتراکی چین بھی گئے۔ فروری ۱۹۶۶ء میں انھوں نے پہلی مرتبہ نیشنل کانفرنس لاہور کے اجلاس میں چھ نکات پیش کیے۔

مجیب الرحمن اپنی انتہاپسندانہ سرگرمیوں کی وجہ سے کئی مرتبہ گرفتار کیے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں ان کو ڈھاکہ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا اور وہ تین سال جیل میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء میں ایوب خاں کے دور میں قید رہے، پھر اگرتلہ سازش کے الزام میں مئی ۱۹۶۶ء میں

گرفتار ہوئے، لیکن فروری ۱۹۶۹ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے بعض سیاسی رہنماؤں کے دباؤ ڈالنے پر ان کو رہا کر دیا گیا اور مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں جب پاکستان کے عام انتخابات ہوئے تو شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ نے بے مثل کامیابی حاصل کر کے مشرقی پاکستان کی نمائندگی کا آئینی حق حاصل کر لیا اور پاکستان کا نیا آئین چھ نکات کی بنیاد پر بنانے کا اعلان کیا جب صدر یحییٰ خاں نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس طلب نہیں کیا تو مارچ ۱۹۷۱ء میں مجیب الرحمن نے عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی جس کی وجہ سے ۲۵۔ مارچ ۱۹۷۱ء کو فوج نے ان کو گرفتار کر لیا اور مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع کر دی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء، ۱۳۹۱ھ میں جب یہ کارروائی ناکام ہوگئی اور ڈھاکہ میں پاکستانی فوجوں نے مجیب الرحمن کی حمایت میں لڑنے والی بھارتی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو ۸۔ جنوری ۱۹۷۲ء کو مجیب الرحمن کو رہا کر دیا گیا اور وہ لندن اور دہلی کے راستے ۱۰۔ جنوری کو ڈھاکہ پہنچے اور ۱۲۔ جنوری کو انھیں بنگلہ دیش کا وزیر اعظم نامزد کر دیا گیا۔

عوامی لیگ سوشلزم اور سیکولرازم کی حامی تھی' اس لیے بنگلہ دیش کی حکومت نے ان ہی بنیادوں پر اصلاحات کا کام شروع کیا۔ پٹ سن، کپڑے سازی اور جہاز سازی کی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ نیا آئین سال بھر کے اندر تیار کر لیا گیا جس کے تحت بنگلہ دیش کو ایک سوشلسٹ اور سیکولر جمہوریہ قرار دیا گیا۔ نئے آئین کے تحت مارچ ۱۹۷۳ء کے انتخابات میں عوامی لیگ نے تین سو میں سے ۲۹۲ نشستوں پر قبضہ کر لیا شیخ مجیب الرحمن نے ان تمام جماعتوں کو جنھوں نے وحدت پاکستان کے لیے کام کیا تھا خلاف قانون قرار دے دیا۔

مجیب الرحمن نے ہندوستان سے خصوصی تعلقات قائم کیے کیونکہ بنگلہ دیش کو پاکستان سے الگ کرانے میں سب سے بڑا ہاتھ ہندوستان ہی کا تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں ہندوستان سے دوستی کا معاہدہ کیا گیا۔ ہندوستان نے اپنی امداد کی بھاری قیمت وصول کی۔ ہندوستانی فوجیوں نے بنگلہ دیش خالی کرنے سے پہلے بے شمار کارخانوں کی مشینیں ہندوستان منتقل کر دیں۔ خصوصی مراعات کی وجہ سے تجارتی معاملات میں ہندوستان کو برتری حاصل ہوگئی اور بنگلہ دیش کی معیشت ہندوستان کی محتاج ہوگئی۔ سازگار فضا دیکھ کر مغربی بنگال کے ہندوؤں نے بھی مشرقی پاکستان واپس آنا شروع کر دیا۔ ۱۹۷۴ء میں ملک میں زبردست قحط پڑا۔ ان تمام اسباب نے بنگلہ دیش

میں ایک بار پھر بے چینی کی لہر دوڑا دی اور عوامی لیگ اور مجیب الرحمن کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔ مجیب الرحمن نے اس بے چینی کو سختی سے دبانا چاہا۔ دسمبر ۱۹۷۴ء میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور آئینی حقوق معطل کر دیے گئے۔ آئین میں بھی کئی ترمیمیں کی گئیں، ملک میں صدارتی نظام قائم کر دیا گیا اور جنوری ۱۹۷۵ء میں مجیب الرحمن صدر ہو گئے اور محمد منصور علی وزیر اعظم۔ مجیب الرحمن نے ان ترمیموں کے ذریعہ سارے اختیارات خود حاصل کر لیے۔ بنگالی جو فطرتاً جمہوریت پسند واقع ہوئے ہیں اس جبر و استبداد کو برداشت نہیں کر سکے اور فوج نے بغاوت کر کے ۱۵۔ اگست ۱۹۷۵ء، ۱۳۹۵ھ کو مجیب الرحمن کو قتل کر دیا۔ وزیر اعظم منصور علی اور عوامی لیگ کے کئی رہنما جیل میں قتل کر دیے گئے اور ملک میں مارشل لا لگا دیا گیا۔

صدر ضیاء الرحمن

فوج نے اس کے بعد ایک اعتدال پسند رہنما خوندکر مشتاق کو صدر بنا دیا۔ چیف آف اسٹاف بریگیڈیر خالد مشرف نے جوابی انقلاب کی کوشش کی لیکن ۲۱۔ اپریل ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الرحمن (پیدائش ۱۹۳۶ء) نے اس کو ناکام بنا دیا۔ مشتاق احمد مستعفی ہو گئے اور ایک خصوصی فوجی عدالت نے اختیارات کے ناجائز استعمال پر ان کو مارچ ۱۹۷۷ء میں پانچ سال کی سزا دے دی۔ شروع میں ایک دس رکنی انقلابی کونسل قائم کی گئی اور چیف جسٹس ابو سادات محمد ہاشم کو صدر بنا دیا گیا۔ پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن یہ پابندیاں جلد ہی اٹھا لی گئیں۔ خود صدر ضیاء الرحمن نے نیشنل پولیٹیکل فرنٹ کے نام سے چھ جماعتوں پر مشتمل ایک انتخابی محاذ بنایا، جن میں مسلم لیگ کا ایک گروپ اور نیشنل عوامی پارٹی کا مسیح الرحمن گروپ شامل ہے۔ ۳۔ جون ۱۹۷۸ء کو صدارتی انتخابات ہوئے جن میں ضیاء الرحمن بڑی اکثریت سے صدر منتخب ہو گئے۔ اس دوران میں جماعت اسلامی کے رہنماؤں پر سے بھی پابندیاں اٹھا لی گئیں۔[1] ۱۸۔ فروری ۱۹۷۹ء کو عام انتخابات ہوئے۔[2] اس موقع پر جماعت

(۱) جماعت اسلامی پر سے پابندیاں اگرچہ ۱۹۷۸ء میں اٹھا لی گئی تھیں لیکن جماعت اسلامی نے باقاعدہ کام یکم فروری ۱۹۸۰ء سے شروع کیا۔

(۲) صدر ضیاء الرحمن نے عام انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد ۔ جون ۱۹۷۹ء کو شراب اور قمار پر پابندی لگا دی۔

اسلامی نظام اسلام پارٹی، ڈیموکریٹک پارٹی اور مسلم لیگ کے ایک گروپ نے اسلامک ڈیموکریٹک لیگ کے نام سے ایک انتخابی محاذ بنایا۔ اس محاذ کے بیس نمائندے کامیاب ہو گئے جن میں چھ جماعت اسلامی کے ہیں۔ اسلامک ڈیموکریٹک لیگ کے صدر مولانا عبدالرحیم اور سکرٹری مولانا عبدالسبحان ہیں۔ اسلامک ڈیموکریٹک لیگ کے ایک ممتاز رہنما مولانا عباس علی خاں اپریل ۱۹۷۸ء میں جب پاکستان آئے تھے تو انھوں نے کراچی میں روزنامہ جسارت کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ:

''شیخ مجیب کی حکومت کے زمانے میں اسلام کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی جگہ ہندو تہذیب و تمدن کو رائج کیا جا رہا تھا۔ مذہبی جماعتوں پر مکمل پابندی تھی۔ دینی مدارس کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ آزادیٔ اظہار پر بھی پابندی تھی۔ صدر ضیاء الرحمن نے اسلامی تہذیب و تمدن کی ترقی اور فروغ کے لیے کوششیں شروع کر دی ہیں۔ ہندو تہذیب و تمدن کے پروپیگنڈہ پر پابندی لگا دی ہے اور حکومت نے دینی مدارس کو دوسرے تعلیمی اداروں کی طرح تسلیم کر لیا ہے۔ اور ہر قسم کی سیاسی آزادیاں بحال کر دی ہیں''

مولانا عباس علی خان نے یہ بھی بتایا کہ:

''اسلامک ڈیموکریٹک لیگ کے منشور اور مقاصد وہی ہیں جو پاکستان میں قومی اتحاد کے ہیں''

انھوں نے کہا کہ:

''ہماری پارٹی بنگلہ دیش میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور لادینی اور کمیونسٹ عناصر کا مقابلہ کر رہی ہے''

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ:

''وہ ''تحریک پاکستان سے بنگلہ دیش کے قیام تک'' عنوان سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ [1]

جماعت اسلامی اور اسلامک ڈیموکریٹک لیگ کے ایک اور رہنما مولانا ابوالکلام یوسف نے ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں جماعت اسلامی کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ:

''عوامی لیگ دو بڑے دھڑوں میں بٹ گئی ہے اور پھر ان دھڑوں میں بھی کئی ذیلی

---

(۱) جسارت، کراچی/۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء

دھڑے ہیں۔ بھارت نواز دھڑے کی قیادت سابق طالب علم رہنما طفیل کر رہے ہیں۔ جبکہ دوسرے دھڑے کی قیادت میزان الرحمن کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسلم لیگ بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔[1] عوامی لیگ کی قومی اسمبلی میں صرف چونتیس نشستیں ہیں"

بنگلہ دیش میں اسلامی تحریک

بنگلہ دیش میں اسلامی نظام کی تحریک اسی زمانے میں شروع ہوگئی تھی جب یہ ملک پاکستان کا ایک حصہ تھا۔ شروع میں اس تحریک کے ہراول جمعیت علمائے اسلام اور اس کی شاخ نظام اسلام پارٹی کے رہنما تھے جن میں مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا اطہر علی کا نام نمایاں ہے۔ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کی باقاعدہ تنظیم قائم ہوئی۔ جماعت اسلامی کے کارکنوں خصوصاً مولانا عبدالرحیم کی کوششوں سے اسلام سے متعلق کتابوں اور مولانا مودودی کی تصانیف کے بڑی تعداد میں بنگلہ زبان میں ترجمے شروع کیے گئے اور صدر ایوب کے برسر اقتدار آنے تک اسلامی تحریک کی بیالیس کتابیں اور کتابچے اردو سے بنگلہ میں ترجمہ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد پروفیسر غلام اعظم کے ۱۹۵۴ء میں جماعت اسلامی میں شریک ہوجانے اور خاص طور پر ان کے مشرقی پاکستان کی جماعت کے امیر منتخب ہو جانے کے بعد مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی، تحریک اسلامی کی سب سے فعال اور سرگرم قوت بن گئی، جس کا اظہار ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ہوا۔ جب جماعت نے عوامی لیگ کے بعد سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ ۱۹۷۱ء میں جماعت اسلامی کے کارکنوں نے البدر اور الشمس کی تنظیمیں قائم کر کے بنگالی علیحدگی پسندوں کے مقابلے میں وحدت پاکستان کی جنگ لڑی اور بے مثل قربانیاں پیش کیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنگلہ دیش قائم ہوجانے کے بعد جماعت اسلامی خلاف قانون قرار دے دی گئی اور اس کے کئی رہنماؤں کی شہریت منسوخ ہوگئی۔ مولانا عبدالرحیم، مولانا عبدالخالق، مولانا ابوالکلام یوسف، مولانا عباس علی خان اور مولانا عبدالسبحان جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے سرگرم رہنما تھے۔ اور اب بنگلہ دیش میں یہی رہنما اسلامی تحریک کی قیادت کر رہے ہیں۔

۱۵۔ جولائی ۱۹۷۸ء کو جماعت اسلامی لاہور کی طرف سے دیے جانے والے ایک

---

(۱) جسارت، کراچی ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء

استقبالیہ میں مولانا عبدالرحیم نے بتایا کہ:

''۱۶۔دسمبر ۱۹۷۱ء کو بنگلہ دیش میں تاریکی کا جو دور شروع ہوا تھا وہ ۱۵ / اگست ۱۹۷۵ء کو ختم ہو گیا''

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ:

''مولانا عبدالخالق کی سربراہی میں اسلامک ٹرسٹ قائم ہو گیا ہے جس کے تحت روزنامہ سنگرام کی اشاعت شروع ہو گئی ہے۔ اور اس کے بعد مزید اخبار اور رسالے بھی نکالے جائیں گے''

بنگلہ دیش میں اسلامی تحریک کے رہنماؤں میں مولانا عبدالخالق (۱۹۲۳ء تا ۱۹۷۹ء) کا نام بہت اہم ہے۔ وہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے رکن بنے اور ۱۹۶۸ء میں مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی کے سکرٹری منتخب ہوئے۔ البدر کی رضا کار تنظیم میں ان کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا اور ان کے صاحبزادے ۱۹۷۱ء میں البدر رضا کار کی حیثیت سے وحدت پاکستان کا تحفظ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ جب بنگلہ دیش میں اسلامک ڈیموکریٹک لیگ قائم ہوئی تو وہ اس کے سینئر نائب صدر منتخب ہوئے موت سے قبل وہ اخبار اتحاد کے ایڈیٹر اور روزنامہ ''سنگرام'' کے مینجنگ ڈائرکٹر تھے۔ اسلامک ٹرسٹ کے سربراہ بھی وہی تھے۔ ۵۔ جون ۱۹۷۹ء کو ان کا ڈھاکہ میڈیکل کالج میں انتقال ہو گیا۔ مجیب شیخ اور یہودی سازش ان کی اہم تصانیف ہیں۔

اسلامی تحریک کے کارکن مزدوروں میں بھی سرگرم ہیں۔ ان مزدور رہنماؤں میں بیرسٹر قربان علی کا نام سرفہرست ہے۔ متحدہ پاکستان میں انھوں نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان مزدور اتحاد کی بنیاد ڈالی تھی۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ان کی شہریت منسوخ کر دی گئی تھی اور ان کی جائیداد ضبط کر لی گئی تھی اور ان کو بنگلہ دیش سے فرار ہونا پڑا تھا۔ اگست ۱۹۷۶ء میں جب صدر ضیاء الرحمن نے جماعت اسلامی کے کئی رہنماؤں کی شہریت بحال کی تو ان کی شہریت بھی بحال کر دی گئی۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں جب اسلامک ڈیموکریٹک لیگ قائم ہوئی تو وہ اس کے ایڈیشنل سکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۵ء سے پہلے بنگلہ دیش کے مزدوروں میں اسلامی ذہن رکھنے والی قیادت کا فقدان تھا۔ ان کی کوششوں سے ۱۹۷۱ء میں پاکستان میں ایک سو انیس مزدور یونینیں اسلامی انقلاب کی علمبردار تھیں اب بنگلہ دیش میں قربان علی صاحب کی کوششوں سے مزدوروں میں پھر کام شروع ہو گیا اور اسلامی

اثرات برابر بڑھ رہے ہیں۔ [1]

بنگلہ دیش میں اسلامی جمعیت طلبہ (اسلامی چھاترو شنگھو) کی سرگرمیاں بھی پھر شروع ہوگئی ہیں اور کئی کالجوں میں اس کو کامیابیاں بھی ہوئی ہیں۔ کشتیا میں ایک اسلامی یونیورسٹی کی بنیاد بھی ڈالی گئی ہے۔ جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے سابق امیر پروفیسر غلام اعظم جنھوں نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں وحدت پاکستان کو قائم رکھنے کے لیے زبردست جدوجہد کی تھی ان لوگوں میں سے تھے جن کی شہریت مجیب حکومت نے منسوخ کر دی تھی وہ اس تمام عرصے میں ملک سے باہر رہے۔ ۱۹۷۸ء میں ان کو بنگلہ دیش آنے کی اجازت مل گئی ہے۔ ان کی شہریت ابھی بحال نہیں ہوئی۔ مولانا عبدالخالق کی نماز جنازہ انھوں نے ہی پڑھائی۔ اسلامی عناصر کی ان کامیابیوں کے بعد بنگلہ دیش کو اسلامی جمہوریہ قرار دینے اور اسلامی نظام نافذ کرنے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔

بنگلہ دیش کے معدنی وسائل پاکستان سے بھی کم ہیں۔ لیکن زمین بہت زرخیز ہے جس کی وجہ سے بنگلہ دیش شاید جاوا کے بعد دنیا کا سب سے گنجان آباد خطہ ہے۔ آبادی کی کثرت اور رقبہ کی کمی ملک کا بہت بڑا اقتصادی مسئلہ ہے۔ بارشیں بہت ہوتی ہیں اور دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے۔ لیکن جہاں پانی کی کثرت زمین کی زرخیزی اور پیداوار میں اضافہ کا باعث ہے وہاں سیلابوں اور طوفان کے ذریعے تباہی بھی لاتی رہتی ہے۔ بنگلہ دیش میں آزادی کے بعد ہندوستان کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے جو صنعتی تباہی آئی تھی اب اس کی تلافی کر لی گئی ہے اور ملک میں تمام کارخانے پوری طرح کام کر رہے ہیں۔ سیلابوں پر بھی قابو پالیا گیا ہے اور وسیع علاقہ پر کاشت شروع ہوگئی ہے۔ بنگلہ دیش کو سعودی عرب سے بڑے پیمانہ پر اقتصادی امداد مل رہی ہے اور جنوری ۱۹۸۰ء میں افغانستان میں روسی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام آباد میں جو کانفرنس بلائی گئی تھی اس کی تحریک بنگلہ دیش نے کی تھی۔

---

(۱) روزنامہ جسارت کراچی ۲۱۔ دسمبر ۱۹۷۹ء۔ بیرسٹر قربان علی کا انٹرویو۔



۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست جموں اور کشمیر کا رقبہ ۸۴ ہزار مربع میل اور آبادی چالیس لاکھ ۳۵ ہزار تھی۔ مسلمانوں کی تعداد اکتیس لاکھ کے قریب تھی یعنی کل آبادی کا ۷۷ فی صدی سے زیادہ۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق مقبوضہ کشمیر کی آبادی ۳۵ لاکھ ۶۰ ہزار ہے اور مسلمانوں کی تعداد ۲۴ لاکھ ۳۲ ہزار ہے یعنی ۶۹ فیصدی۔ آزاد کشمیر کی ابھی تک مردم شماری نہیں ہوئی لیکن آزاد کشمیر کی تقریباً ساری آبادی مسلمان ہے۔ مقبوضہ کشمیر کا رقبہ ۵۳ ہزار مربع میل ہے۔ اور آزاد کشمیر کا رقبہ ۳۱ ہزار مربع میل۔ نقشے میں ریاست جموں اور کشمیر کی ضلع وار آبادی (۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق) اور مسلمانوں کی تعداد دکھائی گئی ہے۔ اوپر کے ہندسے ضلع کی کل آبادی کو اور نیچے کے ہندسے مسلمانوں کی آبادی کو ظاہر کرتے ہیں۔

باب ۱۱

کشمیر جنت نظیر

کشمیر جو اپنی سرسبزی و شادابی اور مناظر کی خوبصورتی کی وجہ سے دنیا کے حسین ترین خطوں میں شمار ہوتا ہے اور جس کو کشمیر جنت نظیر کہا جاتا ہے، اسلامی دنیا کے ان علاقوں میں سے ہے جن کے مستقبل کا ابھی تک تعین نہیں ہو سکا۔ اور جرمنی اور کوریا کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہے۔ برصغیر پاکستان و ہند میں کشمیر کا علاقہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے تحت سب سے آخر میں آیا۔ ۱۳۰۰ء تک مسلمان پاکستان، شمالی ہند، بنگال حتیٰ کہ جنوبی ہند کو بھی اپنے زیر اقتدار لے آئے تھے لیکن کشمیر اس وقت بھی مسلمانوں کی حاکمیت کے دائرہ سے باہر تھا۔ کشمیر پر مسلمانوں کا اقتدار فوج کشی کے نتیجے میں قائم نہیں ہوا بلکہ خود کشمیر کے باشندوں نے اسلام اور مسلمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ۱۳۲۴ء کے قریب جبکہ ہندوستان میں محمد تغلق کی حکومت قائم تھی یہاں کے ایک حکمران رنجن شاہ نے ایک مسلمان مبلغ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور اس کے ساتھ ہی کشمیر میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا آغاز ہو گیا۔ کشمیر ڈھائی سو سال سے زیادہ مقامی حکمرانوں کے تحت رہا اور اس عرصے میں یہاں کے باشندوں کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ ۱۵۸۶ء/۹۹۴ھ میں کشمیر، دہلی کی تیموری سلطنت کا ایک حصہ بنا لیا گیا۔ تیموری خاندان کا اقتدار ختم ہونے کے بعد ۱۷۵۳ء میں کشمیر پر افغان قابض ہو گئے۔ ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر لاہور کا سکھ حکمران رنجیت سنگھ قابض ہو گیا اور اس طرح تقریباً پانچ سو سال مسلمانوں کے پاس رہنے کے بعد یہ خطۂ جنت نظیر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

مسلمانوں کا پانچ سو سالہ دور کشمیر کی تاریخ کا زریں دور ہے۔ زراعت، صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن نے ترقی کی۔ وہ تمام پھل اور پھول جن کی وجہ سے کشمیر آج مشہور ہے ان کی کاشت مسلمانوں کے زمانہ ہی میں شروع ہوئی۔ زعفران کی کاشت بھی اسی زمانہ میں شروع ہوئی۔ قالین سازی اور شال سازی کی صنعت جس کی وجہ سے ایک زمانہ میں ساری دنیا میں

نام روشن تھا اسی زمانہ میں شروع کی گئی۔ مسلمانوں کے زمانے میں جگہ جگہ شہر اور بستیاں آباد کی گئیں اور شاندار عمارتیں، پل اور باغ بنائے گئے۔ تیموری دور میں کشمیر سیر و سیاحت کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ دہلی کے تیموری سلاطین اکثر موسم گرما میں یہاں آتے تھے اور بے شمار دولت یہاں خرچ کرتے تھے جس سے نہ صرف یہاں کے باشندوں میں خوشحالی آئی بلکہ صنعت و حرفت اور علم و ادب کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ ان کے بنائے ہوئے باغات خصوصاً شالامار باغ، نشاط باغ، نسیم باغ اور چشمہ شاہی آج بھی سیاحوں کے لیے کشش رکھتے ہیں۔ کشمیر اب دنیا سے کٹا ہوا خطہ نہیں رہا بلکہ دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ یہاں آنے جانے لگے اور کشمیر کا صدر مقام سرینگر برصغیر کے اہم شہروں کی صف میں آ گیا۔ اس دور میں کشمیر میں علم و ادب نے بھی خوب فروغ پایا۔ فارسی زبان کو فروغ ہوا۔ سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے۔ مختلف علوم وفنون پر کتابیں لکھی گئیں اور یہاں ایران اور ہندوستان کے شاعروں کی محفلیں جمنے لگیں۔ خود کشمیریوں میں فارسی اور کشمیری زبان کے بلند پایہ شاعر اور ادیب پیدا ہوئے جن میں غنی کشمیری متوفی ۱۶۶۱ء کا نام بہت ممتاز ہے۔

ڈوگرا راج

۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء تک کشمیر پر سکھ قابض رہے۔ ۱۸۴۶ء میں جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کر کے سکھ حکومت ختم کی تو کشمیر پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہوگئی۔ انھوں نے ۱۶/ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدۂ امرتسر کے تحت جموں کے ہندو راجہ گلاب سنگھ ڈوگرا کے ہاتھ کشمیر کو پچاس لاکھ روپے میں فروخت کر دیا اور اس طرح موجودہ ریاست جموں اور کشمیر وجود میں آئی، جو اندرونی معاملات میں برطانوی ہند کی دوسری ریاستوں کی طرح آزاد تھی لیکن اس پر انگریزوں کی بالادستی قائم تھی۔ سکھوں کا ۲۷ سال کا مختصر دور اور ڈوگرا خاندان کا صد سالہ دور کشمیر کی تاریخ کا بدترین دور ہے۔ کشمیر کی خوشحالی ختم ہوگئی اور مسلمانوں کی حیثیت جو ریاست کی اصل آبادی تھے غلاموں سے بدتر ہوگئی۔ اس دور میں جو انگریز سیاح کشمیر آئے انھوں نے ڈوگرا مظالم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس مختصر باب میں اس کا تذکرہ ممکن نہیں۔ موجودہ صدی کے آغاز میں جب برطانوی ہند میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو کشمیر بھی متاثر ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں انگریز

وائسرائے لارڈ ریڈنگ کشمیر آیا تو مسلمانوں کے ایک وفد نے اس کے سامنے ایک یادداشت پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ:

۱۔ کشمیری عوام کو ان کے حقوق دیے جائیں۔

۲۔ غیر ملکیوں کی بجائے ملکی افسر مقرر کیے جائیں۔

۳۔ شہری آزادیاں بحال کی جائیں۔

۴۔ ان تمام عبادت گاہوں اور مسجدوں کو جن پر ڈوگروں نے قبضہ کر رکھا ہے مسلمانوں کو واپس دلایا جائے۔

لارڈ ریڈنگ نے مہاراجہ کشمیر کو مسلمانوں کی ان شکایتوں کی طرف متوجہ کیا، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ۱۳۔ جولائی ۱۹۳۱ء کو ایک مقدمہ کے سلسلے میں راجہ کی پولیس نے گولی چلا کر بائیس مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ اور ان کے دور رہنماؤں چودھری غلام عباس (۱۹۰۴ء تا ۱۹۶۷ء) اور شیخ محمد عبداللہ ۱۹۰۵ء) کو گرفتار کر لیا۔ یہ حادثہ کشمیری مسلمانوں میں بیداری کا باعث بنا اور پاکستان کے مسلمانوں نے کشمیری بھائیوں کی حمایت میں زبردست تحریک چلائی جس کے نتیجے میں برطانوی ہند کی حکومت مہاراجہ کے مظالم کی تحقیقات پر مجبور ہوئی اور اس نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جس نے ان شکایات کے ازالے کے لیے دوسری اصلاحات کے ساتھ ریاست میں ایک مجلس قانون ساز قائم کرنے کی سفارش کی۔ اس دوران میں کشمیری رہنما رہا کر دیے گئے اور انھوں نے ۱۷۔ اکتوبر کو سرینگر میں کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ شیخ عبداللہ کانفرنس کے صدر اور چودھری غلام عباس جنرل سکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں جب ریاستی اسمبلی قائم ہوئی تو انتخابات میں مسلمانوں کی اکیس نشستوں میں سے سولہ پر مسلم کانفرنس کے نمائندے کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء کے انتخابات میں اکیس مسلمان نشستوں پر انیس نمائندے مسلم کانفرنس کے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کا نام نیشنل کانفرنس رکھ دیا گیا لیکن شیخ عبداللہ نے کانگریس کی طرف رجحان ظاہر کیا تو چودھری غلام عباس الگ ہوگئے اور ۱۹۴۱ء میں انھوں نے مسلم کانفرنس کو بحال کر دیا۔ اس کے بعد اپنی وفات تک چودھری غلام عباس مسلم کانفرنس کے صدر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ریاستی اسمبلی کے تیسری بار انتخابات ہوئے تو اکیس میں سے پندرہ نشستوں پر مسلم کانفرنس کے نمائندے کامیاب ہوگئے۔

باقی چھ نشستوں پر کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان نشستوں سے مسلم کانفرنس کے جن امیدواروں نے کاغذات نامزدگی داخل کیے تھے وہ مسترد کردیے گئے تھے۔ اس طرح تقسیم ہند سے چند ماہ قبل ہونے والے انتخابات نے بھی یہ ثابت کردیا کہ مسلم کانفرنس ہی کشمیر میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ یہ انتخابات بھی ایسے حالات میں ہوئے تھے کہ مسلم کانفرنس کے صدر چودھری غلام عباس کو ریاستی حکومت نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کرنے کے الزام میں ۱۹۴۶ء میں قید کردیا تھا اور وہ مارچ ۱۹۴۸ء تک قید میں رہے۔

پاکستان سے الحاق کا مطالبہ

حکومت برطانیہ نے ۱۹۴۷ء میں جب برطانوی ہند کو آزادی دینے اور ملک کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تو ۳۔ جون کے منصوبہ کے تحت ریاستوں کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ ریاستوں کے حکمران بھارت یا پاکستان جس ملک سے چاہیں الحاق کرسکتے ہیں۔ لیکن اس اجازت کے ساتھ یہ بات از خود فرض کرلی گئی تھی کہ ریاستوں کے حکمران اپنی اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اپنے عوام کی خواہشات اور ریاست کی جغرافیائی حیثیت کو بھی مدنظر رکھیں گے۔ ریاست جموں اور کشمیر کی اکثریت چونکہ مسلمانوں پر مشتمل تھی اس لیے وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں تھے۔ جغرافیائی طور پر بھی کشمیر پاکستان ہی کا ایک حصہ ہے۔ ۱۹۴۷ء تک آمد و رفت کے سارے راستے پاکستان سے ہو کر جاتے تھے۔ ہندوستان سے ملانے والی ایک سڑک بھی موجود نہیں تھی۔ چنانچہ ۱۹۔ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلمانان کشمیر کی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس نے ایک قرارداد کے ذریعہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا رسمی طور پر اعلان بھی کردیا۔ قرارداد میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر مہاراجہ نے اس کے علاوہ کوئی اور قدم اٹھایا تو جموں اور کشمیر کے مسلمان اس کی مخالفت کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں نے ساری ریاست میں پاکستان سے الحاق کے حق میں مظاہرے شروع کردیے۔

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان کی آزاد مملکت وجود میں آئی تو کشمیر کے راجہ نے پاکستان سے معاہدۂ قائمہ (stand still agreement) کرلیا جس کے تحت کشمیر کے ذرائع رسل و رسائل پاکستان کے حوالے کردیے گئے اور کشمیر کے ڈاکخانوں پر پاکستان کا پرچم لہرانے

لگا۔ بھارت نے اس موقع پر کشمیر سے معاہدہ قائمہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پاکستان نے اس عارضی معاہدۂ قائمہ کے بعد مہاراجہ سے مکمل الحاق کے لیے کہا، لیکن مہاراجہ نے بات کو التوا میں ڈال دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے راشٹر سیلوک سنگھ جیسی دہشت پسند تنظیموں اور مشرقی پنجاب کی سکھ ریاستوں کے تعاون سے مشرقی پنجاب میں جس کے کئی اضلاع میں مسلمان سب سے بڑی واحد اکثریت تھے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ یہی عمل راجہ نے ریاست کے صوبہ جموں میں دہرایا تاکہ اس پورے صوبے کو مسلمانوں سے خالی کرالے۔ لیکن جموں کے کئی حصوں میں مسلمانوں نے راجہ کی فوج اور پولیس کی زبردست مزاحمت کی اور ۲۷۔ اگست ۱۹۴۷ء کو تحصیل باغ ضلع پونچھ کے مقام نیلا بٹ میں سردار عبدالقیوم نے جن کو مجاہد اول کہا جاتا ہے سب سے پہلے علم بغاوت بلند کر دیا اور دو ماہ کے اندر پونچھ، میر پور اور ریاسی کے اضلاع کا بڑا حصہ آزاد کرالیا۔ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پلندری کے مقام پر آزاد کشمیر کی حکومت قائم کر دی گئی جس کا صدر سردار ابراہیم خاں کو مقرر کیا گیا۔

مہاراجہ ادھر مسلمانوں کا قتل عام کرا رہا تھا ادھر شیخ عبداللہ، کانگریس اور حکومت ہند سے مذاکرات کر کے کشمیر کا ہندوستان سے الحاق کرنے کی سازش کر رہا تھا۔ اس سازش کے تحت شیخ عبداللہ کو جو چودھری غلام عباس کی طرح ۱۹۴۶ء سے قید تھے ۲۹۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی سے پہلے ان کو غیر مشروط طور پر وزیر اعظم بنانے اور کانگریس سے تعاون پر راضی کیا گیا اور یقین دلایا گیا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ استصواب رائے کے ذریعہ کیا جائے گا۔ شیخ عبداللہ رہائی کے بعد دہلی گئے۔ اس کے بعد ۲۷۔ اکتوبر کو مہاراجہ کی درخواست پر حکومت ہند نے کشمیر کا ہندوستان سے الحاق منظور کر لیا۔ مہاراجہ نے الحاق کی درخواست میں یہ کہا تھا کہ ریاست کو پاکستان کی طرف سے پٹھان قبائلیوں کے داخل ہو جانے کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہ پٹھان پہلی مرتبہ ۲۲/۲۱ اکتوبر کو داخل ہوئے تھے اور مہاراجہ نے الحاق کی تیاریاں ستمبر سے شروع کر دی تھیں۔ اور جموں کا بیشتر علاقہ بھی مسلمانوں کا قتل عام کر کے مسلمانوں سے وسط اکتوبر تک خالی کرالیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے جموں جیل میں چودھری غلام عباس سے کئی ملاقاتیں کیں اور ان کو بتایا کہ "ڈوگرہ فوجوں نے ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ کشمیر میں ہندوستانی فوج آچکی ہے اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ آپ سرینگر آجائیں اور میرے ساتھ مل کر کشمیر کی آزادی

کے لیے کوشش کریں، لیکن چودھری غلام عباس نے انکار کر دیا اور شیخ عبداللہ سے کہا کہ وہ ان کو پاکستان پہنچا دیں"

۳۱۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خاں کو تار دیا کہ:

"ہمارا یہ وعدہ کہ امن و امان قائم ہوتے ہی ہم اپنی فوجوں کو واپس بلا لیں گے اور ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ریاست کے عوام کی مرضی پر چھوڑ دیں گے صرف آپ ہی کے سامنے نہیں ہے بلکہ ریاستی عوام اور پوری دنیا کے سامنے ہے"

ہندوستانی فوجیں اکتوبر کے آخر میں سرینگر پہنچنا شروع ہو گئیں۔ ۱۸۔ اگست ۱۹۴۷ء کو حد بندی کمیشن نے مسلم اکثریت کے ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھانکوٹ ہندوستان کو دے دی تھی اور اس طرح ہندوستان کی سرحدیں جموں سے مل گئیں اور اگرچہ پٹھان کوٹ سے جموں تک کوئی راستہ نہیں تھا لیکن ریاست کے ہندوستان سے الحاق کے بعد دریائے راوی پر کشتیوں کا عارضی پل بنا دیا گیا اور سڑک تعمیر کر دی گئی اور اس طرح ہندوستانی فوجوں کے لیے بری راستہ سے کشمیر پہنچانے کی شکل نکال لی گئی۔ ہندوستان نے جب دیکھا کہ کشمیر میں فوج کے ذریعہ مسئلہ کو حل نہیں کیا جا سکتا تو اس نے سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چنانچہ ۲۱۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے تنازعہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے پاکستان اور ہندوستان کی حکومت سے مشورے کے بعد جنگ بندی کرنے اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب کے ذریعہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی قرارداد منظور کی۔ [1] دونوں حکومتوں نے اس قرارداد کو منظور کر لیا۔ اس کے بعد یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے جنگ بندی کر دی گئی اور ۲۷۔ جولائی ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی لائن قائم کر دی گئی۔ استصواب کی نگرانی کے لیے امیر البحر چیسٹر نمٹز (Nimitz) کو ناظم استصواب بھی مقرر کر دیا گیا۔ لیکن کشمیر کے بڑے حصہ پر قابض ہو جانے کے بعد ہندوستان کسی نہ کسی بہانے استصواب رائے کو ٹالتا رہا۔ تنازعہ کو حل کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی طرف سے کئی سال تک ایک

---

(۱) مئی ۱۹۴۸ء تک آزاد کشمیر کے باشندے پٹھان قبائل کی مدد سے ہندوستانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد جب ہندوستانی خطرہ پاکستان کی سرحدوں سے قریب آنے لگا تو پاکستان نے بھی اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر دیں۔

تجویز کے بعد دوسری تجویز پیش ہوتی رہی۔ پاکستان نے ہر تجویز منظور کر لی لیکن ہندوستان کی طرف سے ہر تجویز رد کر دی گئی۔ اس دوران ہندوستان نے کشمیر میں اپنی حکومت مستحکم کر لی اور ۱۹۶۳ء میں چین اور بھارت کی جنگ کے بعد سلامتی کونسل نے بھی سرد مہری اختیار کر لی اور ہندوستان نے روس کی حمایت حاصل کر لی اور اس کے بل پر کشمیر میں استصواب کے وعدہ سے صاف مکر گیا اور آئینی تبدیلیاں کر کے مقبوضہ کشمیر کو ہندوستان کا مستقل حصہ بنا لیا۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ کشمیر کا ۵۳ ہزار مربع میل کا علاقہ ہندوستان کے پاس ہے۔ اور ۳۱ ہزار مربع میل کا علاقہ آزاد ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو راجہ کی حکومت ختم کر دی گئی۔ اور ۲۶۔ جنوری ۱۹۵۷ء کو ریاست کا نیا آئین تیار کیا گیا اور ۱۹۶۷ء سے ریاست کو ہندوستانی پارلیمنٹ میں نمائندگی دے دی گئی۔ آزاد کشمیر میں گلگت اور بلتستان کے شمالی علاقے اس وقت حکومت پاکستان کے براہ راست انتظام میں ہیں اور باقی اضلاع میں آزاد کشمیر کی حکومت قائم ہے جس کا صدر مقام مظفر آباد ہے۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے مقبوضہ کشمیر کی آبادی ۴۶ لاکھ ہے۔ جس میں تیس لاکھ چالیس ہزار یعنی ۶۶ فیصد مسلمان ہیں۔ آزاد کشمیر کی تقریباً ساری آبادی مسلمان ہے پوری ریاست کی آخری مردم شماری ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت جموں اور کشمیر کی آبادی چالیس لاکھ ۳۵ ہزار تھی جس میں مسلمانوں کی آبادی اکتیس لاکھ تھی۔ یعنی کل آبادی کا ۷۷ فیصد۔ تیس سال میں آبادی دوگنی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ۱۹۷۱ء میں پوری ریاست میں کل اسی لاکھ آبادی ہونی چاہیے۔ اور مسلمانوں کی تعداد ۶۲ لاکھ۔ ۱۹۴۱ء میں ان علاقوں کی مجموعی آبادی جو اس وقت مقبوضہ کشمیر میں شامل ہیں ۲۶ لاکھ ۲۵ ہزار تھی جس میں مسلمان اٹھارہ لاکھ نواسی ہزار تھے یعنی کل آبادی کا ۷۲ فیصد۔ لیکن ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں مقبوضہ کشمیر کی آبادی ۴۶ لاکھ اور مسلمانوں کی تعداد تیس لاکھ چالیس ہزار یعنی ۶۶ فیصد بتائی گئی ہے۔ حالانکہ تیس سال میں آبادی دوگنی ہو جاتی ہے۔ اور ۱۹۷۱ء میں مقبوضہ کشمیر کی آبادی ۵۲ لاکھ پچاس ہزار اور مسلمانوں کی تعداد ۳۷ لاکھ ۸۹ ہزار ہونی چاہیے۔ جہاں تک غیر مسلم آبادی کی تعداد کا تعلق ہے تو وہ اس مدت میں دوگنی سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں مقبوضہ علاقوں میں سات لاکھ ۳۶ ہزار غیر مسلم تھے۔ اضافہ بھی دوگنی شرح سے ۱۹۷۱ء میں ان کی تعداد چودہ لاکھ ۷۲ ہزار ہونی چاہیے لیکن ان کی تعداد پندرہ لاکھ

ساٹھ ہزار ہے۔ آزاد کشمیر کے علاقوں میں ۱۹۴۱ء میں صرف ایک لاکھ ۴۳ ہزار ہندو تھے اور وہ سب مقبوضہ کشمیر نہیں گئے بلکہ ان کی بڑی تعداد ہندوستان چلی گئی ہے۔ لہٰذا ہندوؤں کی آبادی اضافہ آبادی کے اصول کے مطابق تیس سال میں دوگنی ہوگئی لیکن مسلمانوں کی آبادی میں ساڑھے سات لاکھ کی کمی آ گئی۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ وادی کشمیر کے باہر ادھم پور کٹھوعہ اور جموں میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹۴۱ء میں تین لاکھ چوالیس ہزار تھی۔ جس کو یا تو قتل کرا دیا گیا یا ریاست چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اگر یہ تعداد ریاست میں ہوتی تو اس وقت ان کی تعداد سات لاکھ ہو جاتی۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ صوبہ جموں کا بیشتر حصہ مسلمانوں سے خالی ہے اور ریاسی اور پونچھ کے اضلاع میں بھی جہاں مسلمانوں کا تناسب ۱۹۴۱ء میں بالترتیب ۶۸ فیصد اور ۹۰ فیصد تھا۔ مسلمان اقلیت میں ہو چکے ہیں۔ آزاد کشمیر میں ابھی تک باضابطہ مردم شماری نہیں ہوئی لیکن اندازہ ہے کہ شمالی علاقوں کو شامل کرنے کے بعد آزاد کشمیر کی آبادی ۲۵ لاکھ سے زیادہ ہے۔

کشمیر کا مسئلہ اسلامی دنیا کا اہم مسئلہ ہے۔ ۵۳ ہزار مربع میل کی اراضی اور ۴۶ لاکھ کی آبادی معمولی چیز نہیں ہوتی۔ رقبہ آبادی اور وسائل کے اعتبار سے مقبوضہ کشمیر کی اہمیت فلسطین، ارٹیریا، فلپائن کے جنوبی جزائر، پٹانی (تھائی لینڈ) اور ارکان کے مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ یہ دنیا کا حسین ترین خطہ ہے۔ جنت ارضی ہے اور جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کے دفاع اور معیشت کے لیے بنیادی اہمیت بھی رکھتا ہے لیکن اس وقت اسلامی دنیا کے مسائل میں سب سے کم توجہ اس مسئلہ کشمیر پر دی جا رہی ہے۔ اور تنازعہ کشمیر پاکستان کی بے بسی اور اسلامی دنیا کی بے حسی کا زندہ ثبوت بن گیا ہے۔

آزاد کشمیر

آزاد کشمیر کا علاقہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیر کا سب سے پس ماندہ علاقہ تھا۔ نہ یہاں سڑکیں تھیں اور نہ مدرسے اور شفاخانے۔ گزشتہ تیس سالوں میں حکومت پاکستان کی مدد سے اس علاقے کو کافی ترقی دی گئی ہے۔ تمام حصہ پہاڑی ہے۔ اور سڑکوں کی تعمیر بہت مشکل ہے اس کے باوجود آزاد کشمیر کے بیشتر علاقے اب پختہ سڑکوں سے ملا دیے گئے ہیں۔ سب سے اہم سڑک وہ ہے جو

چین اور پاکستان کو ملاتی ہے۔ اس کا نصف حصہ کشمیر کے شمالی حصوں سے گزرتا ہے۔ گلگت اور ہنزہ کے قصبے اس سڑک پر واقع ہیں۔ دریائے نیلم کی وادی دنیا کے خوبصورت ترین علاقوں میں سے ہے۔ اس کے بڑے حصہ میں بھی پختہ سڑکیں بن گئی ہیں یا جیپ کے لائق سڑکیں بن گئی ہیں۔ پاکستان کا تربیلا کے بعد دوسرا بڑا بند منگلا آزاد کشمیر کی حدود میں واقع ہے۔ میرپور آزاد کشمیر کا جدید ترین اور صنعتی شہر ہے جو منگلا جھیل کے کنارے واقع ہے۔ مظفر آباد دریائے جہلم اور دریائے کشن گنگا کے سنگم پر ایک تنگ وادی میں آباد ہے۔ پہلے یہ مقام ایک بڑے گاؤں سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اب چالیس پچاس ہزار آبادی کا اچھا خاصا شہر بن گیا جو پہاڑوں کے ڈھلانوں پر آباد ہے۔ راولاکوٹ پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تیسرا بڑا شہر ہے۔ ان تمام شہروں اور قصبوں میں بھی مدرسے اور کالج موجود ہیں۔ اور جدید طبی سہولتیں فراہم ہیں۔ دھیرکوٹ، چکار اور بیجوسہ کو صحت افزا اور تفریحی مقامات کے طور پر ترقی دی جارہی ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی وادئ نیلم میں بھی سیاحوں کے لیے جدید سہولتیں فراہم ہوجائیں گی۔

آزاد کشمیر میں پہلے صرف ایک سیاسی جماعت جموں و کشمیر مسلم کانفرنس تھی جس کے صدر چودھری غلام عباس مرحوم تھے۔ ان کے بعد سے سردار عبدالقیوم مجاہد اول اس کے صدر ہوگئے تھے۔ وہ آزاد کشمیر کے بھی کئی سال صدر رہے بعد میں مسلم کانفرنس کے بعض رہنماؤں نے مسلم کانفرنس سے الگ ہوکر مختلف سیاسی جماعتیں قائم کرلیں۔ پیپلز پارٹی کے آخری دور میں پاکستان کی بعض سیاسی جماعتوں کی شاخیں بھی آزاد کشمیر میں قائم کرلی گئیں۔ اس کے بعد جماعت اسلامی بھی آزاد کشمیر میں قائم ہوگئی جس کے صدر میاں عبدالباری تھے۔ ۱۹۷۹ء کے آخر میں جب پاکستان میں سیاسی جماعتوں پر پابندی لگی تو آزاد کشمیر میں بھی پابندی لگادی گئی۔

مقبوضہ کشمیر میں کانگریس اور شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس بڑی جماعتیں ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جماعت اسلامی بھی ایک فعال تنظیم ہے۔ اس کے صدر مولانا سعید الدین ہیں۔ لیکن کانگریس اور شیخ عبداللہ جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ساتھ مقبوضہ کشمیر کی جماعت اسلامی پر بھی پابندی لگادی گئی تھی۔ جو اٹھارہ ماہ قائم رہی۔ ۱۹۷۹ء کے اوائل میں جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو شیخ عبداللہ کے حامیوں اور ریاست کے کمیونسٹ عناصر نے جماعت اسلامی کے حامیوں کے ساتھ انتہائی

وحشیانہ سلوک کیا اور جماعت اسلامی سے متعلق لوگوں کے سولہ سو مکانات اور دو کانیں جلا دیں۔

مقبوضہ کشمیر میں جماعت اسلامی کا سب سے اہم شعبہ تعلیم کا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ایک سو پچیس ابتدائی اور ثانوی مدرسے چل رہے تھے جن میں طلبہ کی تعداد سترہ ہزار تھی۔ [1] ان طلبہ کو مروجہ تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ جماعت کا ایک شعبہ نشر و اشاعت بھی ہے۔ جو اسلامی موضوعات پر کتابیں شائع کرتا ہے۔ ادارۂ فکر و ادب اور شعبۂ خدمت خلق بھی جماعت کے اہم شعبے ہیں۔ روز نامہ اذان، سرینگر، جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر کا ترجمان ہے جو ۱۹۷۷ء میں جماعت پر سے پابندی اٹھ جانے کے بعد ہفت روزہ کی حیثیت سے شائع کیا جا رہا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں اسلامی افکار اور اقدار کی سب سے بڑی علمبردار یہی جماعت اسلامی ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں سرینگر میں ۱۹۴۸ء سے ایک یونیورسٹی بھی قائم ہے۔

---

(1) روز نامہ جسارت، کراچی ۶۔ مارچ ۱۹۷۹ء۔

(ج) مشرق وسطیٰ

	رقبہ	آبادی
(۱) افغانستان	۲ لاکھ ۵۳ ہزار مربع میل ۶ لاکھ ۵۷ ہزار مربع کلومیٹر	دو کروڑ (۱۹۷۸ء)
(۲) ایران	۶ لاکھ ۲۷ ہزار مربع میل ۱۶ لاکھ ۲۱ ہزار مربع کلومیٹر	تین کروڑ ۴۵ لاکھ (۱۹۷۸ء)
(۳) ترکی	۳ لاکھ مربع میل ۷ لاکھ ۸۰ ہزار مربع کلومیٹر	چار کروڑ بیس لاکھ (۱۹۷۸ء)

باب ۱۲

افغانستان کا دورِ جدید

جنوری ۱۹۲۹ء میں شاہ امان اللہ خاں کے افغانستان سے فرار ہونے کے چند دن بعد بچہ سقہ جس کا نام حبیب اللہ تھا کابل پر قابض ہوگیا۔ لیکن وہ کابل پر صرف چند ماہ حکومت کرسکا۔ ایک افغانستان سپہ سالار نادر خان جو فرانس میں افغانستان کے سفیر تھے فرانس سے ہندوستان کے راستے افغانستان پہنچے اور بچہ سقہ کو شکست دے کر ۸۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو کابل پر قابض ہوگئے۔ اور اگلے ماہ نادر شاہ کے نام سے تخت نشین ہوئے۔

نادر شاہ (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء)

نادر شاہ ایک دوسرے خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس کا امان اللہ خاں کے بارک زئی خاندان سے قریبی تعلق تھا۔ امان اللہ خاں سردار پائندہ خاں کے بیٹے امیر دوست محمد خاں کی اولاد میں تھے جبکہ نادر خاں سردار پائندہ خاں کے دوسرے بیٹے سلطان محمد خاں کی اولاد میں تھے۔ سلطان محمد کے لڑکے سردار یحییٰ کے نام پر یہ خاندان یحییٰ خیل بھی کہلاتا ہے۔ نادر شاہ نے پورے ملک میں امن وامان قائم کیا اور اقتصادی ترقی پر خاص طور پر توجہ دی۔ ان کا دور اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ افغانستان میں ۱۹۳۱ء میں پہلی مرتبہ تحریری آئین اختیار کیا گیا اور حکومت کو ایک آئینی بادشاہت کی شکل دینے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۳۲ء میں کابل یونیورسٹی قائم ہوئی۔ نادر شاہ نے افغانستان کے تعلیمی نظام کو اسلامی بنیاد پر منظم کرنے کی بھی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے انھوں نے برصغیر کے تین ممتاز اہل علم ڈاکٹر اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو مشورے کے لیے افغانستان بلایا۔ یہ حضرات اکتوبر ۱۹۳۳ء میں کابل پہنچے اور تعلیمی نظام کے سلسلے میں ضروری مشورے دیے لیکن ابھی یہ حضرات مشکل سے وطن واپس پہنچے تھے کہ ۸/ نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک نوجوان نے ذاتی رنجش کی وجہ سے نادر شاہ کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔

ظاہر شاہ (۱۹۳۳ء تا ۱۹۷۳ء)

نادر شاہ کے بعد ان کے بیٹے ظاہر شاہ (پیدائش ۱۹۱۴ء) انیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ کم عمری کی وجہ سے حکومت کا انتظام پوری طرح ان کے چچاؤں کے ہاتھ میں آ گیا۔ ظاہر شاہ کے چچا محمد ہاشم ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۳ء تک وزیر اعظم رہے، ان کے بعد محمد ہاشم کے بھائی شاہ محمود ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۳ء تک وزیر اعظم رہے۔ اس کے بعد نادر شاہ کے بھائی محمد عزیز کے بیٹے محمد داؤد خاں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۳ء تک وزیر اعظم رہے۔ اس ساری مدت میں ظاہر شاہ کی اہمیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ شاہ محمود کی وزارت کا زمانہ تھا کہ انگریزوں نے برصغیر کو خالی کر دیا اور افغانستان کی مشرقی اور جنوبی سرحد پر پاکستان کی نئی اسلامی مملکت وجود میں آئی۔ ۱۹۴۶ء تک افغانستان نے ڈیورنڈ لائن کے مشرق میں آباد پٹھان باشندوں سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۶ء میں برطانوی حکومت نے تقسیم ہند کا اور برطانوی ہند کو چھوڑنے کا اعلان کیا تو افغانستان نے ان پٹھانوں کے مستقبل کے بارے میں پہلی مرتبہ تشویش کا اظہار کیا حالانکہ یہ پٹھان اب پاکستان کی آزاد مسلم مملکت کا حصہ ہونے والے تھے۔ اس طرح پاکستان اور افغانستان کے درمیان ''پختونستان'' کا تنازعہ پیدا ہوا جو ابھی تک حل نہیں ہو سکا ہے۔ سردار داؤد خاں کے زمانۂ وزارت میں یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا اور پاکستان اور افغانستان کی کشیدگی اپنے انتہا پر پہنچ گئی۔ سردار داؤد نے اس مسئلہ پر روس کی تائید بھی حاصل کر لی۔ ۱۹۵۹ء میں سردار داؤد اور ان کے بھائی محمد نعیم نے جو وزیر خارجہ تھے الگ الگ روس کے دورے کیے۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں میں سردار داؤد نے پھر ماسکو کا سفر کیا۔ روسی حکومت نے ہر مرتبہ پختونستان کے مسئلہ پر افغانی موقف کی حمایت کی اور ۱۹۶۱ء میں خروشیف نے یہاں تک کہہ دیا کہ پٹھانوں کو آزادانہ استصواب کے ذریعے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں یا آزاد ہونا یا افغانستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اس طرح روس نے ایک ایسا مطالبہ کر دیا جو خود افغانی حکومت نے نہیں کیا تھا۔ ترکی، ایران اور پاکستان نے علاقائی تعاون برائے ترقی (R.C.D) کے نام سے جو ادارہ قائم کیا سردار داؤد نے اس کی بھی مذمت کی۔ افغانستان کی اس حکمت عملی کی وجہ سے پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور دونوں ملکوں کے درمیان

تجارتی اور سفارتی تعلقات ختم ہو گئے۔

ظاہر شاہ نے ۱۹۶۳ء میں سردار داؤد کو برطرف کر دیا اور اس طرح انھوں نے پہلی مرتبہ اپنے چچاؤں کے خاندان کی گرفت سے آزادی حاصل کی۔ داؤد خان کی جگہ ڈاکٹر محمد یوسف (۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۵ء) وزیر اعظم مقرر کیے گئے۔ ان کے زمانے میں پاکستان سے تعلقات بحال ہوئے اور ۱۹۔ ستمبر ۱۹۶۴ء کو نیا آئین[1] منظور ہوا۔ اور افغانستان ایک پارلیمانی جمہوریت بن گیا اور بادشاہ کی حیثیت ایک آئینی حکمران ہو گئی۔ ڈاکٹر یوسف کے بعد ان کی سیاسی اور معاشی پالیسیوں پر عمل جاری رہا۔ لیکن ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۲ء تک ملک طلبہ کے ہنگاموں اور پارلیمانی بحران کا شکار رہا۔ مئی ۱۹۶۹ء میں کابل یونیورسٹی میں بائیں بازو کے طلبہ کی قیادت میں حکومت کی مداخلت کے خلاف ۴۸ دن تک ہڑتال رہی۔ اگست اور ستمبر ۱۹۶۹ء میں نئے آئین کے تحت دونوں ایوانوں کے انتخابات ہوئے اور نور احمد اعتمدی نے جو پہلے بھی وزیر اعظم رہ چکے تھے از سر نو حکومت بنائی۔

بادشاہت کا خاتمہ

نئی آئینی حکومت کو برسرِ اقتدار آئے ہوئے ابھی چار سال ہوئے تھے کہ ظاہر شاہ کی غیر حاضری سے جو ملک سے باہر گئے ہوئے تھے فائدہ اٹھاتے ہوئے سردار محمد داؤد خان نے ۱۷۔ جولائی ۱۹۷۳ء کو ان کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ افغانستان کو ایک جمہوریہ قرار دے دیا۔ اور خود صدر بن گئے۔ ۱۹۶۴ء کا آئین منسوخ کر دیا گیا اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوان توڑ دیے گئے۔ ظاہر شاہ اگست ۱۹۷۳ء میں تخت سے دست بردار ہو گئے اور انھوں نے امان اللہ شاہ اور شاہ فاروق کی طرح اٹلی میں رہائش اختیار کر لی۔

انقلاب کے بعد "قومی انقلابی پارٹی" قائم کی گئی اور اس کو ملک کی واحد سیاسی پارٹی قرار دیا گیا۔ سوشلزم کا نعرہ لگایا گیا اور جون ۱۹۷۵ء میں بنکوں کو قومی ملکیت میں لے کر اس سمت پہلا قدم اٹھایا گیا۔ جاسوسی نظام انتہائی سخت بنا دیا گیا اور ملک کے اسلامی عناصر کے خلاف کاروائی

(۱) اس آئین کے تحت افغانی پارلیمنٹ کے دو ایوان تھے اور شاہی خاندان کے لوگوں کو اعلیٰ عہدوں سے روک دیا گیا۔ پارلیمنٹ کا ایوان زیریں عوام کے منتخب مائندوں پر مشتمل تھا اور ایوان بالا میں بھی۔ منتخب نمائندوں کی اکثریت تھی۔ آئین کے بعد ملک میں سیاسی جماعتیں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔

کر کے ان کو پوری طرح کچل دیا گیا۔ سردار داؤد خان ہمیشہ سے روس نواز تھے اور انھوں نے ۱۹۷۰ء میں روس کے اجتماعی تحفظ کے ایشیائی نظام کی حمایت کی تھی۔ وہ پختونستان کی تحریک کے بھی پر جوش حامی تھے اور انھوں نے لوگوں کا اسلامی جذبہ کچل کر ان کو نسل پرستی کے راستہ پر لگانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں پختونستان کی تحریک کی جس طرح حمایت کی تھی اس کا تذکرہ پیچھے کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ان کے برسر اقتدار آنے کے بعد پاکستان سے افغانستان کے تعلقات ایک بار پھر کشیدہ ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں ان کے خیالات میں تبدیلی آ رہی تھی اور وہ مذاکرات کے ذریعہ پرامن طریقہ پر پاکستان سے تنازعہ کا حل ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ اس مقصد سے مذاکرات وزیر اعظم بھٹو کے دور میں شروع بھی ہو چکے تھے اور اس کا سلسلہ مسٹر بھٹو کے بعد بھی جاری رہا۔ لیکن اس دوران میں خود افغانستان میں انقلاب آ گیا اور ان کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا۔

اشتراکی انقلاب

صدر داؤد نے اپنی وزارت عظمیٰ اور پھر صدارت کے پانچ سالہ دور میں روس سے جو قریبی تعلقات پیدا کیے تھے اور اسلامی تحریکوں کو کچل کر اشتراکی عناصر کی جو حوصلہ افزائی کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں اشتراکی عناصر نے ۲۷۔ اپریل ۱۹۷۸ء کو فوج کے تعاون سے صدر داؤد کا تختہ پلٹ دیا۔ سردار داؤد خان ان کے نائب صدر وزیر دفاع اور فوج کے کمانڈر انچیف مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ کمیونسٹ عناصر جو خفیہ خلق پارٹی اور پرچم پارٹی سے تعلق رکھتے تھے برسر اقتدار آ گئے۔ خلق پارٹی کے رہنما نور محمد ترکئی صدر بن گئے۔ انھوں نے جلد ہی اپنے رقیب جنرل عبد القادر کو جو پرچم پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور انقلاب کے اصل معمار تھے گرفتار کر لیا۔ ۵۔ دسمبر ۱۹۷۸ء کو نور محمد ترکئی نے روس سے دوستی کا بیس سالہ معاہدہ کر لیا۔ افغانستان کا یہ انقلاب واضح طور پر ایک ایسا انقلاب تھا جس میں روس کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اور روس اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ افغانستان میں تبدیلیاں لا رہا تھا۔ اس لیے اس انقلاب کو افغانستان کے عوام نے تسلیم نہیں کیا اور خود افغانی حکومت میں بھی شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ صدر نور محمد ترکئی ستمبر ۱۹۷۹ء میں ہوانا میں غیر جانبدار ملکوں کی چھٹی کانفرنس میں پاکستان کے صدر ضیاء الحق سے ملاقات کرنے کے

بعد جب کابل واپس پہنچے تو ان ہی کی پارٹی کے وزیر اعظم حفیظ اللہ امین نے ۱۶/ ستمبر کو نور محمد ترکئی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور صدر ترکئی کو قتل کر دیا۔ اب حفیظ اللہ امین نے چن چن کر اپنے مخالفوں کو انتقام کا نشانہ بنایا اور بے شمار لوگوں کو قتل کر دیا۔ حفیظ اللہ امین مشکل سے تین ماہ حکومت کر پائے تھے کہ پھر ایک انقلاب آیا اور ان ہی کی خلق پارٹی کے ایک اور کمیونسٹ رہنما ببرک کارمل نے جو نور محمد ترکئی کے گروہ سے تعلق رکھنے کے دعویدار ہیں ۲۷۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کو صدر حفیظ اللہ امین کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ ببرک کارمل صدر ترکئی کی حکومت میں نائب وزیر اعظم تھے۔ حفیظ اللہ امین کو بھی حسب دستور قتل کر دیا گیا۔ کمیونسٹ تحریک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اخلاقی اقدار اور مخالف سے مفاہمت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور اپنے ہر مخالف کو خواہ وہ کمیونسٹ پارٹی ہی کا رکن کیوں نہ ہو ملک دشمن، سامراج کا ایجنٹ اور رجعت پسند قرار دیا جاتا ہے اور اس کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہی روس کے انقلاب میں ہوا۔ یہی چین کے انقلاب میں ہوا۔ یہی ان عرب ملکوں میں ہوا جہاں کیمونسٹ یا کیمونسٹ نواز حکومتیں آئیں۔ افغانستان میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ غیر کیمونسٹوں کو ہی نہیں بلکہ اپنی پارٹی کے جس فرد سے بھی اختلاف ہوتا ہے۔ برسر اقتدار آنیوالا نہ صرف اس کا بلکہ اس کے حامیوں تک کا قلع قمع کر دیتا ہے اس طرح افغانستان میں خود برسر اقتدار پارٹی کے بے شمار لوگ قتل کیے جا چکے ہیں۔ خود ببرک کارمل نے حفیظ اللہ امین پر بارہ ہزار لوگوں کو قتل کرنے کا الزام لگایا ہے۔

افغانستان کے عوام نور محمد ترکئی کے زمانہ میں ہی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ہر حکومت ان حریت پسندوں کو کچلنے میں ناکام رہی بالآخر افغانستان کی پٹھو حکومت نے دسمبر ۱۹۷۹ء کے آخر میں حریت پسندوں کو کچلنے کے لیے ۱۹۷۸ء کے دوستی کے معاہدے کے تحت روس سے فوجی مدد طلب کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس اسی دن کا انتظار کر رہا تھا اور دوستی کا معاہدہ اس نے اس لیے کیا تھا کہ جب اس کے ایجنٹ برسر اقتدار آجائیں گے تو روس سوشلسٹ انقلاب کا تحفظ کرنے کے بہانہ اور اس معاہدہ کا سہارا لے کر ہنگری اور چیکوسلوواکیہ کی طرح افغانستان میں بھی فوجی مداخلت کر سکے۔ چنانچہ چند ہفتوں کے اندر افغانستان روسی فوجوں اور اسلحہ سے بھر گیا۔

دنیا نے افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد کو ایک کھلی جارحانہ کاروائی قرار دیا ہے۔ پاکستان چونکہ اس کاروائی سے براہ راست متاثر ہے اور پانچ لاکھ افغانی مہاجرین ۱۹۸۰ء کے اوائل تک

پاکستان میں پناہ لے چکے تھے اس لیے ۲۷۔جنوری ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد میں اسلامی ملکوں کے وزرائے خارجہ کی ایک سہ روزہ کانفرنس طلب کی گئی جس میں اتفاق رائے سے روس سے اپنی فوجوں کو فوراً واپس بلانے کا مطالبہ کیا گیا کانفرنس نے اسلامی ملکوں سے بھی کہا کہ جب تک روسی فوجیں افغانستان سے واپس نہیں جاتیں افغانستان کی نئی حکومت کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اسلامی کانفرنس میں افغانستان کی رکنیت بھی معطل کر دی گئی۔

افغانستان کے حریت پسند اب تک چھ مختلف تنظیموں کے تحت جنگ کر رہے تھے۔ اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے موقع پر یورپ کی اسلامی کونسل کے جنرل سکریٹری سالم عزام کی کوششوں سے ۲۷۔جنوری ۱۹۸۰ء کو ان حریت پسندوں نے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ جس کا نام ''اسلامی اتحاد برائے آزادی افغانستان'' رکھا گیا ہے۔ اس اتحاد کے سربراہ پروفیسر برہان الدین ربانی ہیں۔ گل بدین حکمت یار اور صبغت اللہ مجددی اس اتحاد کے دوسرے ممتاز رہنما ہیں۔

اسلامی تحریک

افغانستان کے باشندے اسلام سے گہری محبت رکھتے ہیں اور پٹھانوں کی اسلام دوستی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح افغانستان میں بھی حکمران طبقہ زیادہ تر ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے مغربی طرز کی تعلیم حاصل کی ہے اور اسلامی اصولوں کے تحت معاملات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ علماء دینی جذبے کے باوجود قدامت پسند ہیں۔ فی الحال ملک میں کوئی ایسی تحریک موجود نہیں جو افغانوں کی اسلامی خطوط کے مطابق رہنمائی کر سکے۔ ایسی تحریک جب بھی شروع ہوئی اس کو دبا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ زبردست مذہبی رجحان رکھنے والے باشندوں کے اس ملک میں بھی حکمراں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے زیر اثر غیر اسلامی رجحانات پرورش پاتے رہے۔ اس کے برخلاف روس کا بھیجا ہوا اشتراکی لٹریچر عام تھا۔ جس کی وجہ سے ظاہر شاہ کے آخری دور میں اشتراکی رجحان کو بہت فروغ ہوا اور کابل یونیورسٹی پر اشتراکی طلبہ کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس اشتراکی پروپگینڈہ کے ردعمل میں ۱۹۶۸ء میں کابل میں اسلامی تحریک شروع ہوئی جس نے ''شب نامۂ جہاد'' کے عنوان سے اپنا منشور جاری کیا۔ یہ زمانہ اشتراکی تحریک کے عروج کا تھا اس لیے طلبہ نے شروع میں اس

تحریک کا مذاق اڑایا۔ لیکن اسلام پسند طلبہ نے اپنا کام جاری رکھا۔ اور ۶۔ اگست ۱۹۶۸ء کو انھوں نے پہلا جلوس نکالا اس کے بعد جب بھی اشتراکی عناصر کوئی جلوس نکالتے تو اسلام پسند بھی اپنا جلوس نکالتے۔ رفتہ رفتہ اس تحریک نے ایسی مقبولیت حاصل کرلی کہ ۱۹۷۲ء میں کابل یونیورسٹی کی یونین کے انتخابات میں پچاس میں سے چالیس نشستوں پر اسلام پسند طلبہ کامیاب ہوگئے۔ یہ طلبہ مولانا مودودی اور سید قطب شہید کی تحریروں سے متاثر تھے اور اشتراکی عناصر ان کو افغان المسلمون کہتے تھے۔ سردار داؤد کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس اسلامی تحریک کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس کے کارکن قید و بند کا شکار ہوئے اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ جون ۱۹۷۴ء میں صدر داؤد کے روس کے دورے کے بعد اسلام پسندوں کے خلاف کاروائی اور سخت کردی گئی۔ یہاں تک کہ شریعت کالج کے پروفیسر غلام محمد کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔[1]

افغانستان میں نسل پرستی اور قوم پرستی کا خطرناک جذبہ بھی ابھر رہا ہے پہلے افغانوں کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ نسلاً بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب زور اس بات پر دیا جارہا ہے کہ افغان آریہ نسل سے ہیں۔ چنانچہ افغان ہوائی سروس کا نام آریانا ایرلائن رکھا گیا ہے۔ یہ جذبہ غیر اسلامی ہونے کے علاوہ اس وجہ سے بھی خطرناک ہے کہ اس سے پاکستان بھی متاثر ہوسکتا ہے کیونکہ پاکستان کی آبادی کی ایک بڑی تعداد افغانستان کی طرح پٹھانوں پر مشتمل ہے پختونستان کی تحریک اسی بنیاد پر چلائی جارہی ہے۔ پاکستان کی طرح افغانستان میں بھی ترک، تاجیک اور ایرانی مختلف نسل اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہیں اور ایک اندازہ کے مطابق ان باشندوں کی اکثریت ہے۔ افغانستان کی حکومت بھی تسلیم کرتی ہے کہ افغانستان میں پٹھان یعنی پشتو بولنے والے باشندوں کی تعداد ساٹھ فیصد سے زیادہ نہیں۔ افغانستان کا سارا شمالی اور مغربی علاقہ ترکی اور فارسی بولنے والے انہی لوگوں سے آباد ہے۔ خود کابل میں فارسی بولنے والے تاجیک باشندوں کی اکثریت ہے۔ اس لیے اگر افغانستان میں پختون قوم پرستی کی تحریک نے فروغ پایا تو افغانستان کے دوسرے لسانی گروہ پٹھانوں کی بالادستی کو تسلیم نہیں کریں گے اور افغانستان کا اتحاد پارہ پارہ ہوجائے گا اس کے برخلاف اگر افغانستان کو استحکام حاصل ہوگا بلکہ

(۱) ترجمان القرآن، لاہور اپریل ۱۹۷۵ء

پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے سے اور قریب آجائیں گے اور اسلامی تحریک ان دونوں ملکوں سے ساری دنیا میں پھیل سکے گی۔

افغانستان اسلامی تہذیب اور افکار کا تاریخی مرکز رہا ہے۔ بلخ جسے کبھی قبۃ الاسلام کہا جاتا تھا اور ہرات جس کی خاک سے عبداللہ انصاری جیسے محدث اور صوفی باعمل اور امام رازی جیسے متکلم اور مفکر پیدا ہوئے۔ افغانستان ہی میں واقع ہیں۔ غزنی کا عظیم تاریخی شہر جس نے افغانستان اور پاکستان کو پہلی مرتبہ ایک مضبوط سیاسی نظام کے تحت متحد کیا تھا۔ افغانستان ہی کی ایک بستی ہے۔ اتحاد اسلام کے عظیم ترین داعی جمال الدین افغانی اس سرزمین ہی کی خاک میں آسودہ ہیں۔ اقبال اور سنائی ایک ہی پیغام کے دو علمبردار ہیں۔ غزنی اور لاہور کے دل جو کبھی ایک ساتھ دھڑکتے تھے اب بھی ایک ساتھ دھڑک سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ افغانستان اور پاکستان میں اس قدر تاریخی اور ثقافتی اور فکری ہم آہنگی رہی ہے کہ مستقبل میں اگر کابل اور اسلام آباد کے دل پھر ایک ساتھ دھڑکنے لگیں تو یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔ یہ تاریخ کا فطری ارتقا ہوگا اور اگر ایسا ہو گیا تو وسط ایشیا میں افغانستان اور پاکستان کا یہ اتحاد دنیا کے لیے فال نیک ثابت ہوگا۔

معیشت

افغانستان، اسلامی دنیا کے سب سے پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن گزشتہ چند سالوں میں تعلیم، زراعت اور صنعت کے میدانوں میں خاصی ترقی ہوئی ہے۔ کابل یونیورسٹی جدید تعلیم کا ایک اعلیٰ ادارہ بن چکی ہے جس میں طبیعات۔ کیمیا۔ طب قانون۔ ادبیات۔ طبقات الارض جغرافیہ اور تاریخ کے مکمل شعبے ہیں ۱۹۴۹ء سے کلیۃ الشریعہ کا شعبہ بھی قائم کر دیا گیا ہے جس میں جدید تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم، تاریخ اسلام اور عربی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ افغانستان کا سب سے بڑا دینی ادارہ ''دار العلوم'' ہے افغانستان کے ایک سابق وزیر اعظم (۱۹۷۳ء) محمد موسیٰ شفیق وہیں کے فارغ التحصیل ہیں ۱۹۶۳ء میں جلال آباد میں ایک دوسری یونیورسٹی بھی قائم کی گئی تھی جو ننگرہار یونیورسٹی کہلاتی ہے۔ افغانستان میں تمام تعلیم مفت ہے اور ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔ لیکن ابھی تک تعلیم عام نہیں ہوئی ہے اور خواندہ لوگوں کی تعداد دس فیصدی سے زیادہ نہیں۔

افغانستان میں ریل کی پٹری ابھی تک نہیں بچھائی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں معاہدہ تہران کے تحت

پاکستان ریلوے کو تورخم سے جلال آباد تک اور چمن سے قندھار تک توسیع دینے کا منصوبہ بنایا گیا تھا لیکن دونوں ملکوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جانے کی وجہ سے ابھی تک اس پر عمل نہیں ہو سکا ہے۔ پختہ سڑکوں کا جال سارے ملک میں بچھایا جا رہا ہے۔ کابل۔ قندھار۔ سوات اور دوسرے شہروں کے درمیان روس اور امریکہ کی مدد سے جدید ترین طرز کی اعلیٰ درجہ کی سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں کوہ ہندوکش کے درہ سالنگ (salang) میں گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر کئی میل لمبی ایک سرنگ تعمیر کی گئی جس کے بعد کابل اور شمالی صوبوں کے درمیان ہر موسم میں آمد و رفت ممکن ہوگئی ہے۔ دریائے آمو کے کنارے قزل قلعہ (بندر شیر خان) میں ایک دریائی بندرگاہ تعمیر کی گئی ہے جس کے ذریعہ روسی ترکستان سے تجارت ہوتی ہے۔

نہری آبپاشی اور پن بجلی کے کئی منصوبے مکمل ہو چکے ہیں۔ ایران کی سرحد پر سیستان کے صحرائی علاقہ میں دریائے ہلمند کے پانی سے بہت بڑا علاقہ سیراب کیا جا رہا ہے اور اگرچہ یہ منصوبہ ابھی پوری طرح کام نہیں کر رہا۔ لیکن ایک وسیع علاقہ جو پہلے ریگستان تھا اب زیر کاشت آ چکا ہے۔ صنعتوں میں کپڑے سیمنٹ اور شکر کے کارخانے قابل ذکر ہیں۔

افغانستان میں معدنیات کی دریافت کا کام ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ لیکن تازہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ افغانستان معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ لوہے کے دو ارب ٹن کے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں جو دنیا کے عظیم ذخیرے کہلا سکتے ہیں۔ شمالی صوبوں میں قدرتی گیس کے وسیع ذخیرے دریافت ہوئے ہیں جن کی مقدار دو ارب ۹۴ کروڑ مکعب میٹر ہے۔ یہ گیس ۶۳ میل لمبی پائپ لائن کے ذریعہ روس برآمد کی جا رہی ہے۔ حال ہی میں تانبے کے تیس لاکھ ٹن ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ کوئلہ بھی نکالا جا رہا ہے اور ۱۹۷۵ء میں 1½ لاکھ ٹن کوئلہ نکالا گیا۔ پچھلے دنوں پاکستان کے تعاون سے کوئلہ اور لوہے کے ذخیروں سے کام لینے کا منصوبہ زیر غور آیا تھا لیکن اس کو ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ افغانستان اپنے محدود مالی وسائل کی وجہ سے بیرونی امداد کے بغیر اپنی معدنی دولت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور نہ صنعتوں کو بڑے پیمانے پر ترقی دے سکتا ہے۔ پاکستان کا تعاون اس میدان میں افغانستان کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ افغانستان ہر طرف خشکی سے گھرا ہوا ہے اور اس کے لیے سب سے نزدیک اور قریب ترین بندرگاہ کراچی میں ہے۔

افغانستان میں سوائے قندھار کے بڑے حصہ میں فارسی بولی جاتی ہے ۱۹۳۶ء میں سرکاری زبان پشتو کردی گئی لیکن فارسی ابھی تک عام ہے اور دفتروں تک میں فارسی ہی میں کام انجام دیا جاتا ہے۔ کابل اور قندھار کے بازاروں میں اردو بھی سمجھی جاتی ہے۔ صحافت ابتدائی مرحلہ میں ہے اور سب سے کثیر الاشاعت اخبار اصلاح ہے جو ۲۵ ہزار چھپتا ہے۔

بارک زئی خاندان

(۱۸۲۶ء تا ۱۹۲۹ء)

دوست محمد خاں ——— ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۹ء پھر ۱۸۴۲ء تا ۱۸۶۳ء

شیر علی خان ——— ۱۸۶۳ء پھر ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۹ء

یعقوب خان ——— ۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۰ء

عبدالرحمن خان ——— ۱۸۸۰ء تا ۱۹۰۱ء

حبیب اللہ خان ——— ۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۹ء

امان اللہ خان ——— ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۹ء

عنایت اللہ خان ——— ۱۹۲۹ء

یحییٰ خیل

(۱۹۲۹ء تا ۱۹۷۳ء)

نادر شاہ ——— ۱۹۲۹ء ۱۹۳۳ء

ظاہر شاہ ——— ۱۹۳۳ء تا ۱۹۷۳ء

جمہوری دور

صدر داؤد خان ——— ۱۷۔ جولائی ۱۹۷۳ء تا ۲۷۔ اپریل ۱۹۷۸ء

صدر نور محمد ترہ کئی ——— ۲۸۔ اپریل ۱۹۷۸ء تا ۱۶۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

صدر حفیظ اللہ امین ——— ۱۶۔ ستمبر ۱۹۷۹ء تا ۲۷۔ دسمبر ۱۹۷۹ء

ببرک کارمل ——— ۲۷۔ دسمبر ۱۹۷۹ء

باب ۱۳

ایران: رضا شاہ سے اسلامی انقلاب تک

رضا شاہ پہلوی (۱۹۲۵ء تا ۱۹۴۱ء)

رضا شاہ پہلوی سے ایران کے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ترکی میں کمال اتاترک نے جمہوری نظام قائم کیا تھا لیکن رضا شاہ ایران کو جمہوری نظام نہیں دے سکے۔ انھوں نے بادشاہت کا نظام قائم رکھا اگرچہ یہ بادشاہت آئینی تھی اور دستور کے تحت بادشاہ کے اختیارات اب عہد قاچاری کی طرح لامحدود نہیں تھے، لیکن دستور کے باوجود رضا شاہ نے فوج کے بھروسہ پر کمال اتاترک کی طرح آمرانہ حیثیت اختیار کر لی اور ملک میں اپنی مرضی کے مطابق اصلاحات جاری کیں جن کی بدولت ملک کو فائدہ بھی پہنچا اور نقصان بھی بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رضا شاہ جن کو ایرانی رضا شاہ کبیر کہنا پسند کرتے ہیں عہد قاچاری کے حکمرانوں سے بالکل مختلف تھے اور ان کو ذاتی عیش و عشرت کے مقابلے میں ملک کا مفاد زیادہ عزیز تھا۔

رضا شاہ نے سب سے پہلے ملک سے بدامنی دُور کی، باغیوں کی سرکوبی کی اور پورے ایران میں ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کر دی جب ملک میں امن قائم ہوگیا تو رضا شاہ نے ترقیاتی کاموں کی طرف توجہ دی، شمالی صوبہ گیلان میں اسی کے عہد میں پہلی مرتبہ چائے کی کاشت شروع ہوئی اسی طرح اس دور میں ایران میں صنعتی ترقی کی داغ بیل پڑی، کپڑے اور شکر کے کارخانے قائم ہوئے۔ ملک کے دور دراز حصوں کو ملانے کے لیے پختہ سڑکیں بنائی گئیں اور ریل کی پٹری بچھانے کا کام شروع کیا گیا، خلیج فارس سے بحیرۂ خضر تک ۸½ سو میل لمبی ریل کی پٹری بچھائی گئی جس سے ایران کے شمالی اور جنوبی حصے ایک دوسرے سے مل گئے اور ہفتوں کا سفر چند دنوں میں ہونے لگا، اس عہد میں ایک اہم کام یہ کیا گیا کہ غیر ملکیوں کو ایران میں جو مراعات حاصل تھیں ان کو منسوخ کر دیا گیا۔ ان مراعات کی وجہ سے بیرونی ملکوں کو ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا بہانہ مل جاتا تھا۔

تعلیم کی طرف بھی توجہ کی گئی، تہران میں پہلی یونیورسٹی قائم کی گئی اور ایرانی طلبہ کو انجینئرنگ، قانون، زراعت، طب، سائنس اور دوسرے جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ کے ملکوں میں بھیجا گیا۔

رضا شاہ اگرچہ ایک روشن خیال اور بیدار مغز بادشاہ تھا لیکن کمال اتاترک کی طرح وہ بھی مغرب سے بہت مرعوب تھا اور اس نے اصلاحات کرتے وقت بڑی حد تک کمال اتاترک کی تقلید کی، چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ملک میں فرانس کا عدالتی قانون نافذ کیا گیا۔

۱۹۲۸ء میں ایرانی لباس کی جگہ کوٹ پتلون پہننا لازمی قرار دیا گیا ترکوں کی طرح ہیٹ کو تو رواج نہیں دیا گیا ہیٹ سے مشابہ ایک نئی طرز کی ٹوپی جس کو پہلوی ٹوپی کہا جاتا ہے لازمی قرار دی گئی، ۱۹۳۰ء سے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں دینیات کی تعلیم لازمی نہیں رہی، ۱۹۳۵ء میں برقع ممنوع قرار دیا گیا، عورتوں کے لیے مغربی لباس کی حوصلہ افزائی پہلے سے کی جارہی تھی، برقع ختم ہونے کے بعد جب ایرانی عورتیں بے پردہ ہوگئیں، تو ان میں اور یورپ کی عورتوں میں کوئی فرق نہیں رہا، اسی سال ایران میں ایک ادبی مجلس قائم کی گئی تاکہ فارسی زبان کو عربی کے اثرات سے پاک کیا جائے۔

رضا شاہ نے اگرچہ اصلاح و ترقی کے کام میں بڑی حد تک اتاترک کی تقلید کی لیکن پھر بھی وہ کئی غلطیوں سے بچے رہے۔ اس نے اتاترک کی طرح نہ تو مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا، اور نہ فارسی زبان کا رسم الخط بدل کر لاطینی رسم الخط اختیار کیا، حالانکہ ملک میں اس قسم کا مطالبہ کرنے والے موجود تھے، ایران کا رسم الخط آج بھی عربی ہے۔ اور سرکاری مذہب اسلام ہے، ایرانی پارلیمنٹ کو کسی ایسے قانون کو منظور کرنے کا اختیار نہیں جو اسلام کے خلاف ہو۔ چنانچہ قانون کی منظوری کے لیے ماہرین دینیات کا مشورہ ضروری ہے۔

رضا شاہ کے آخری دور میں یورپ میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ اور اگرچہ اس موقع پر ایران نے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر دیا تھا لیکن اتحادی ملکوں نے ایران کی اس غیر جانبداری کا احترام نہیں کیا، جرمنوں کے مقابلے میں روس کو فوجی سامان فراہم کرنے اور امداد روانہ کرنے کے لیے ایران سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، چنانچہ ۲۵۔ اگست ۱۹۴۱ء کو شمال سے روس نے اور جنوب سے برطانوی فوجوں نے بیک وقت ایران پر حملہ کر دیا، ایران اتنی بڑی طاقتوں کا مقابلہ

نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور ۱۶۔ ستمبر کو رضا شاہ کو اپنے بیٹے محمد رضا کے حق میں تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد رضا شاہ جنوبی افریقہ چلے گئے جہاں ۲۶۔ جولائی ۱۹۴۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

محمد رضا پہلوی (۱۹۴۱ء تا ۱۹۷۹ء)

محمد رضا پہلوی بائیس سال کی عمر میں تخت نشین [1] ہوئے۔ نوجوان بادشاہ کی حکومت کا آغاز بڑے نازک حالات میں ہوا۔ ملک پر چار سال تک روس اور برطانوی فوجیں قابض رہیں اور ایرانی حکومت برطانیہ اور روس کی مرضی کے بغیر کوئی اہم قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ لیکن یہ تسلط عارضی نوعیت کا تھا اس لیے جب دوسری عالمی جنگ ختم ہوئی تو ۲۔ مارچ ۱۹۴۶ء کو اس ملکی معاہدے کی مدت ختم ہو گئی جس کے تحت غیر ملکی فوجیں ایران میں داخل ہوئی تھیں۔ مدت ختم ہو جانے کے بعد برطانیہ اور امریکہ کی فوجوں نے ایران خالی کر دیا، لیکن روس کی فوجوں نے ایسا نہیں کیا۔ روس، ایران پر مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا کہ اس کو شمالی ایران پر تیل نکالنے کی مراعات دی جائیں۔ آخر ایران کو روس کا یہ مطالبہ منظور کرنا پڑا، جس کے بعد مئی ۱۹۴۶ء میں روسی فوجوں نے بھی ایران خالی کر دیا۔

روس کے تسلط کے زمانہ میں ایران کے کمیونسٹ عناصر نے آذربائیجان کو ایران سے الگ کرنے کی کوشش بھی کی۔ آذربائیجان کی آبادی کی اکثریت ترکی نسل کے باشندوں پر مشتمل ہے اور ان کی زبان بھی آذری ترکی ہے۔ نسل پرستی اور قوم پرستی کے نئے تصورات کے تحت ان میں آزادی کی خواہش پیدا ہونا قدرتی بات ہے اور روسی آذربائیجان اور ایرانی آذربائیجان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دونوں آذربائیجان پر مشتمل ایک آزاد ترک ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ روس اپنے علاقے کے آذربائیجان کو تو آزاد نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے آذربائیجان کے کمیونسٹ

(۱) محمد رضا پہلوی ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں تہران میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں مصری شہزادی فوزیہ سے جو شاہ فاروق کی بہن تھی شادی ہوئی لیکن ۱۹۴۸ء میں اس نے طلاق لے لی۔ ۱۹۵۱ء میں شاہ نے ایک ایرانی امیر کی لڑکی ثریا اسفند باری سے شادی کی، لیکن اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۵۸ء میں اس کو طلاق دے دی۔ ۲۱۔ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ایک دوسرے ایرانی امیر کی لڑکی فرح دیبا سے شادی کی جس کے بطن سے ۱۹۶۰ء میں ولیعہد شہزادہ رضا پیدا ہوئے اور اس کے بعد اور لڑکے بھی ہوئے۔

عناصر کی مدد سے ایرانی آذربائیجان کو ایران سے الگ کرنے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ ان کمیونسٹوں نے جو آذربائیجان ڈیموکریٹک پارٹی کے تحت کام کر رہے تھے دسمبر ۱۹۴۵ء میں آذربائیجان میں روسی امداد سے اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی۔ جب ایرانی فوجیں اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے روانہ کی گئیں تو روسی فوجوں نے ان کو آذربائیجان کی سرحد پر روک لیا۔ لیکن روسی فوجوں کی ایران سے واپسی کے بعد دسمبر ۱۹۴۶ء میں ایرانی فوجیں آذربائیجان میں داخل ہو گئیں اور انھوں نے کمیونسٹوں کی بغاوت کا خاتمہ کر دیا۔

روس کے طرز عمل سے ایران کو چونکہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس لیے ایران کو امریکہ کی طرف امداد کے لیے جھکنا پڑا اور ۶۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایران اور امریکہ نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیے جس کے تحت امریکہ نے ایران کو فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں ایران معاہدۂ بغداد کا رکن ہو گیا۔

نوجوان بادشاہ محمد رضا پہلوی کا ابتدائی دور داخلی سیاست کے لحاظ سے بھی پرامن رہا۔ اس دور میں شاہی اختیارات میں مزید کمی آئی اور ملک میں جمہوری سرگرمیاں زیادہ آزادانہ ماحول میں شروع ہوئیں۔ رضا شاہ کبیر کے دور میں سیاسی جماعتیں وجود میں آ گئیں، اب یہ پابندی ختم کر دی گئی اور ایران میں کئی سیاسی جماعتیں وجود میں آ گئیں، ان میں ایک کمیونسٹ پارٹی تھی جس کا نام ایران میں تودہ پارٹی یعنی عوامی پارٹی تھا۔ اس جماعت کے ایک شخص نے ۱۹۴۹ء میں بادشاہ پر قاتلانہ حملہ کیا، جس کے بعد تودہ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی۔

تیل قومی ملکیت میں لے لیا گیا

ایران اسلامی دنیا کا پہلا ملک ہے جہاں پہلی مرتبہ تجارتی پیمانہ پر تیل نکلنا شروع ہوا۔ تیل کے یہ ذخیرے سب سے پہلے مسجد سلیمان میں ایک برطانوی کمپنی نے جس کو قاچار دور میں تیل کی تلاش کا ٹھیکہ دیا گیا تھا ۱۹۰۸ء میں دریافت کیے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ایرانی حکومت نے کمپنی کو تیل نکالنے کے لیے مراعات دیں۔ ۱۹۱۲ء تک مسجد سلیمان سے خلیج فارس کے قریب بلغان کی بندرگاہ تک پائپ لائن مکمل ہو گئی اور پٹرول برآمد ہونا شروع ہو گیا۔ پٹرول کی مراعات چونکہ ایران کے لیے مفید نہیں تھیں اس لیے رضا شاہ کبیر نے ان مراعات کو منسوخ کر کے کمپنی سے ۲۹۔ مئی

۱۹۳۳ء کو نیا معاہدہ کیا۔ تیل کی برآمد سے کمپنی اور ایران دونوں کو بہت فائدہ ہوا۔ ایران میں سرمایہ کی کمی دور ہوگئی اور ملک میں خوشحالی آگئی۔ لیکن کمپنی کو چونکہ اب بھی ایران کے مقابلے میں زیادہ فائدہ حاصل ہورہا تھا اس لیے ایرانی باشندے کمپنی سے ایک نیا معاہدہ کرنا چاہتے تھے تاکہ بڑھتے ہوئے منافع میں ایران کو بھی شریک کیا جائے۔ کمپنی اور ایران کی یہ کشمکش اس حد تک بڑھ گئی کہ ایران کے ایک ممتاز قانون دان اور رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر محمد مصدق (۹ ۱۸۷ء تا ۱۹۶۷ء) نے جو قومی محاذ پارٹی کے لیڈر تھے تیل کو قومی ملکیت میں لینے کا مطالبہ کردیا۔ اس مطالبہ کے ساتھ ہی ملک میں ہنگامے شروع ہوگئے، جن کے دوران وزیراعظم جنرل رزم آرا (۱۹۰۱ء تا ۱۹۵۱ء) کو ۷۔ مارچ ۱۹۵۱ء کو قتل کردیا گیا، کیونکہ وہ تیل کو قومی ملکیت میں لینے کے خلاف تھے۔ عین ہنگاموں اور توڑ پھوڑ کے اس دور میں ۲۹۔ اپریل ۱۹۵۱ء کو ڈاکٹر محمد مصدق وزیراعظم ہوگئے۔ اسی دوران قومی پارلیمنٹ نے ایک بل کے ذریعہ اتفاق رائے سے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

ایران میں ہنگاموں اور توڑ پھوڑ کی تحریک میں کمیونسٹ اور فدائیان اسلام جو ایک انتہا پسند مذہبی گروہ تھا آگے آگے تھے۔ ان کی وجہ سے ڈاکٹر مصدق ہنگاموں پر قابو نہ پاسکے۔ علاوہ ازیں اس دوران میں ایران میں ایک اور تحریک زور پکڑ گئی اور وہ یہ کہ بادشاہت ختم کرکے ایران کو ایک جمہوری ملک قرار دے دیا جائے یہ کوئی نئی تحریک نہیں تھی ——— میں جب شاہ قاچار آئینی بادشاہت قائم کرنے پر مجبور ہوگیا تھا یہ تحریک اسی وقت شروع ہوگئی تھی۔ اگر رضا شاہ کبیر قاچاری حکومت کو ختم کرکے خود بادشاہ نہ بن جائے تو ایران بہت پہلے ایک جمہوریہ بن چکا ہوتا۔ ایرانی عوام کو ایک شکایت یہ بھی تھی کہ آئین کے تحت علماء کو فیصلہ کن اختیارات نہیں دیے گئے تھے۔ ڈاکٹر مصدق نے ۱۰۔ اگست ۱۹۵۳ء کو استصواب رائے عامہ کے ذریعہ بادشاہت کو ختم کرنا چاہا۔ شاہ ایران نے اس پر جوابی کارروائی کی اور ڈاکٹر مصدق کو برطرف کرکے جنرل زاہدی کو وزیراعظم مقرر کردیا۔ اس کے باوجود ایران میں حالات بادشاہ کے لیے اتنے ناسازگار ہوچکے تھے کہ رضا شاہ پہلوی کو ملک سے فرار ہونا پڑا۔ لیکن اس دوران میں بادشاہت کے مسئلہ پر فدائیان اسلام اور ڈاکٹر مصدق میں اختلافات ہوگئے جس سے فائدہ اٹھا کر جنرل زاہدی نے ڈاکٹر مصدق کے حامیوں کو کچل دیا اور ۱۹۔ اگست کو ڈاکٹر مصدق کو گرفتار کرلیا۔ ڈاکٹر مصدق پر

غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور سزائے قید سنائی گئی۔ ڈاکٹر مصدق کا ۵۔ مارچ ۱۹۶۷ء کو انتقال ہو گیا۔

جنرل زاہدی کی کامیابی کے بعد شاہ ایران واپس آ گئے۔ اگلے سال برطانوی تیل کمپنی سے ایرانی حکومت کا تصفیہ ہو گیا، جس کے تحت تیل ایران کی قومی ملکیت رہا لیکن اس کی تقسیم کا ٹھیکہ ایک بین الاقوامی کنسورشیم کو دے دیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت تیل کی فروخت سے ہونے والے منافع میں ایران کا حصہ پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ برطانیہ نے تیل کی خریداری کا جو بائیکاٹ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا اور تیل کی پیداوار اور آمدنی بڑھنے سے ایران میں خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

انقلاب سفید

تیل کی ملکیت کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد شہنشاہ ایران نے ملک کو ترقی دینے کے لیے اور عوام کی بے چینی دور کرنے کے لیے کئی اہم اقدامات کیے جن کو انقلاب سفید [1] کا نام دیا گیا۔ ان میں سب سے اہم قدم بے زمین کاشتکاروں میں زمینوں کی تقسیم کا منصوبہ تھا۔ اس کام کا آغاز اگرچہ ۱۹۵۱ء میں شاہی زمینوں کی تقسیم سے کیا جا چکا تھا، لیکن ۱۹۶۲ء میں اس کو مزید وسعت دی گئی اور دوسرے جاگیرداروں اور زمینداروں کی زمینوں کو بھی کسانوں کے ہاتھ آسان قسطوں میں فروخت کرنے کا پروگرام شروع کیا گیا اور ۱۹۶۸ء تک چھ لاکھ سے زیادہ کسان خاندان اس پروگرام کے تحت زمینوں کے مالک بن گئے۔

ایرانی حکومت نے اس دوران میں فلاح و بہبود کے دوسرے منصوبوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ۱۹۶۳ء میں سپاہ دانش کے نام سے تعلیم عام کرنے کے لیے اور ۱۹۶۴ء میں سپاہ بہداشت کے نام سے حفظان صحت کا نظام بہتر بنانے کے لیے سپاہ بہداشت کے نام سے تنظیمیں قائم کی

(1) اس منصوبہ کو شہنشاہ نے ۲۶۔ جنوری ۱۹۶۳ء کو استصواب رائے کے ذریعہ منظور کرایا تھا۔ بعد میں اس میں توسیع ہوتی چلی گئی۔ آخر میں یہ بارہ نکات تک پھیل گیا جو حسب ذیل ہیں۔ اصلاح اراضی۔ جنگلوں کو قومی ملکیت میں لینا۔ سرکاری کارخانوں میں حصوں کو فروخت کر کے رقم اصلاح اراضی میں استعمال کی جائے۔ کارکنوں کو نفع میں شریک کیا جائے۔ عورتوں کو حق رائے دہی دیا جائے۔ خواندگی کے لیے رضا کار تنظیم کا قیام۔ حفظان صحت کے لیے رضا کار تنظیم۔ زرعی توسیع کا پروگرام۔ دیہات میں پنچائتی نظام کا قیام۔ آبی وسائل کو قومی ملکیت میں لینا۔ شہری اور دیہی تعمیر جدید اور انتظامی اور تعلیمی اصلاحات۔

گئیں۔ ان تنظیموں کے تحت تعلیم اور حفظان صحت کے میدان میں جو مفید نتائج نکلے انھوں نے دوسرے اسلامی ملکوں کے لیے ان میدانوں میں کام کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔ ۷۔ جنوری ۱۹۶۳ء میں ایرانی خواتین کو پہلی مرتبہ قومی مجلس کے انتخابات میں رائے دینے کا حق ملا۔ شہنشاہ ایران کے ان کارناموں کی وجہ سے ۱۹۶۵ء میں ایرانی پارلیمنٹ نے ان کی خواہش پر شاہ کو آریہ مہر کا خطاب دیا۔ گویا وہ آریہ نسل کے آفتاب تھے۔ انقلاب سفید کے تحت کی جانے والی یہ اصلاحات مفید ہونے کے باوجود کئی وجوہ سے مطلوبہ مقصد حاصل نہ کرسکیں۔ اول تو یہ کہ زمینوں کی تقسیم کا کام بہت سست رفتاری سے انجام دیا گیا اور ملک کی بہت کم زرعی آبادی اس سے فائدہ اٹھاسکی۔ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں نے بھی حکومت سے پورا تعاون نہیں کیا۔ دوم شہروں میں جو نئی صنعتیں قائم کی گئیں ان میں مزدوروں کے مفاد کا تحفظ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے نہ کسان پوری طرح مطمئن ہوسکے اور نہ مزدور۔ تیل سے جو لامحدود دولت حاصل ہوئی اس سے زیادہ تر دولت مند افراد نے فائدہ اٹھایا یا وہ ایران کی جنگی صلاحیت بڑھانے پر صرف ہوئی جس پر شہنشاہ نے ضرورت سے زیادہ توجہ دی، کیونکہ وہ ایران کو دنیا کی عظیم ترین فوجی قوت بنا دینا چاہتے تھے۔ اسلحہ کی خریداری پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا اور ہتھیاروں کا اتنا ذخیرہ جمع کیا گیا جو کام میں نہیں آسکتا تھا۔ ان غلط کاموں کی وجہ سے ملک میں گرانی میں بے انتہا اضافہ ہوگیا جو عام آدمی اور متوسط طبقے کے لیے ناقابل برداشت ہوگیا۔ پھر سب سے اہم بات یہ کہ اعلیٰ طبقہ کی خوشحالی کے ساتھ ساتھ ایران میں وہ تمام اخلاقی خرابیاں عام ہوگئیں جو دولت کی کثرت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ معاشرے میں اسلامی اقدار کو فروغ دینے کی بجائے مغربی تہذیب اور مادیت کو کھل کر فروغ دیا گیا اور جب علماء نے مخالفت کی تو ان کے خلاف سخت کاروائی کی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں امام خمینی کو جو بعد میں اسلامی انقلاب کے قائد کی حیثیت سے ابھرے ایران سے جلاوطن کر دیا گیا۔

جبر و استبداد

شہنشاہ ایران نے بے چینی کے اسباب معلوم کرنے اور ان کو دور کرنے کی بجائے آمرانہ طریقے اختیار کیے اور مخالف عناصر کو تشدد کے ذریعہ دبانے کی کوشش کی۔ ملک میں سیاسی قیدیوں

کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ جن کو ''ساوک'' نامی خفیہ پولیس کے ادارے کے ذریعہ تشدد اور ایذا رسانی کا نشانہ بنایا جاتا تھا یا قتل کرا دیا جاتا تھا۔ اس تشدد کی وجہ سے نوجوان ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد امریکہ اور یورپ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں شاہ ایران نے ایران میں قیام شہنشاہیت کی ڈھائی ہزار سالہ سالگرہ منائی۔ ایک ایسے دور میں جو سلطانی جمہور کا دور ہے یہ جشن بے وقت کی راگنی تھی اور اس کی جرأت ایک ایسا حکمران ہی کرسکتا تھا جس کو عوام کی خواہشات اور زمانہ کے دھارے کی پرواہ نہ ہو۔ شہنشاہ نے اپنے آمرانہ اختیارات کو مضبوط بنانے کے لیے مارچ ۱۹۷۵ء میں ملک میں تمام سیاسی جماعتیں ختم کردیں اور صرف ایک سیاسی جماعت ''رستاخیز'' قائم کی گئی جس کے صدر سابق وزیراعظم امیر عباس ہویدا[۱] تھے۔ اس اقدام کی وجہ سے مخالفین زیر زمین سرگرمیوں پر مجبور کردیے گئے۔ مخالف جتنی بڑھتی تھی حکومت اتنا ہی زیادہ جبر وتشدد کے طریقے اختیار کرتی تھی۔ وکلاء کے بین الاقوامی ادارے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سکرٹری جنرل کے ایک بیان کے مطابق جو ۱۹۷۵ء میں جاری کیا گیا تھا۔ دنیا کے کسی ملک کا انسانی حقوق کا ریکارڈ اتنا خراب نہیں تھا جتنا ایران کا تھا۔[۲]

یہودیوں کی بین الاقوامی خفیہ تنظیم ''فری میسن'' کو اس دور میں ایران میں خوب عروج ملا۔ شاہ ایران سمیت تمام اہم شخصیتیں فری میسن تحریک سے تعلق رکھتی تھیں۔ امیر عباس ہویدا جو ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۵ء تک وزیراعظم رہے تھے گرینڈ ماسٹر کے منصب پر فائز تھے۔ ایک سابق وزیر خارجہ خلعت بری بھی فری میسن تھے۔ ان کو بھی سزائے موت دی جاچکی ہے۔ تحریک انقلاب کے دوران وزارت عظمیٰ کی کرسی سنبھالنے والے جعفر شریف امامی کے گھر سے جو خفیہ دستاویزات برآمد ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ ایران میں فری میسن کی تنظیم ایشیا کی سب سے بڑی

---

(۱) امیر عباس ہویدا (۱۹۱۹ء تا ۱۹۷۹ء) نے بیروت، پیرس اور برسلز (بلجیم) میں تعلیم پائی تھی۔ عربی بھی خوب بولتے تھے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۸ء تک وزارت خارجہ سے وابستہ رہے اور فرانس، جرمنی، اقوام متحدہ، سوئٹزرلینڈ اور ترکی میں ایران کی نمائندگی کی۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک ایران کی قومی تیل کمپنی کے سربراہ رہے۔ اس کے بعد وزیر خزانہ مقرر ہوئے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۵ء تک وہ وزیراعظم رہے اور مارچ ۱۹۷۵ء سے اوائل ۱۹۷۹ء تک ''رستاخیز'' کے صدر رہے۔ اسلامی انقلاب کے بعد قتل وغارت گری کے الزام میں ۷ اپریل ۱۹۷۹ء کو گولی ماردی گئی۔ تحقیقات کے دوران پتہ چلا کہ وہ نہ صرف فری میسن تھے بلکہ میسن لاج کے گرانڈ ماسٹر بھی تھے۔

(۲) کرنٹ بایوگرافی (انگریزی) ستمبر ۱۹۷۰ء۔

اور سب سے فعا تنظیم تھی۔ شاہ ایران خود اس کے رکن تھے اور ان کے اتباع میں ممتاز سیاسی اور انتظامی شخصیتیں ہی نہیں بلکہ نام نہاد علماء بھی فری میسن بن چکے تھے۔ چنانچہ تہران کے امام جمعہ حسن امام فری میسن تھے۔ اور گرینڈ ماسٹر تھے۔ اصفہان کے لاج سے جو فہرست دستیاب ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ اصفہان کا ہر قابل ذکر فرد فری میسن تھا۔ (1)

مختصر یہ کہ سیاسی گھٹن، آزادی کے فقدان، جاسوسی نظام کی ہیبت، معاشی انصاف کے فقدان، مغربی افکار اور تہذیب کے سیلاب، فری میسنوں اور اقلیتی گروہوں (بہائی مسیحی اور یہودی) کی اجارہ داریوں اور مذہبی عناصر پر جبر و تشدد کی وجہ سے اندر ہی اندر جو لاوا پک رہا تھا وہ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں اچانک پھوٹ نکلا اور پہلوی خاندان کے فلک بوس محلوں کے باسیوں نے ایرانیوں کی زبان بندی کر کے دنیا کو ایران کی خوشحالی اور ترقی کی جو تصویر دکھائی تھی وہ جھوٹی ثابت ہوئی۔

بادشاہت کا خاتمہ

ایران میں صفوی دور سے علماء کا گہرا اثر رہا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ناصر الدین شاہ قاچار کے دور میں اپنی قوت کا مظاہرہ کیا تھا جب مرزا محمد شیرازی نے تمباکو نوشی فتوی دیا تھا، جس کے بعد بادشاہ نے روسی کمپنی کا ٹھیکہ منسوخ کر دیا۔ علماء کی قوت کا دوسرا مظاہرہ مظفر الدین شاہ قاچار کے زمانے میں ہوا جب علماء نے بادشاہ کی مطلق العنانی کے خلاف دستور پسندوں کی تائید کی اور اس کے نتیجے میں ۱۹۰۶ء میں ایران کا پہلا آئین بنا اور اسمبلی وجود میں آئی۔ پانچ علماء کو اسمبلی کا مستقل رکن مقرر کیا گیا اور ان کو یہ حق دیا گیا کہ وہ خلاف شریعت قوانین کو منظور نہ ہونے دیں۔ رضا شاہ پہلوی کے زمانہ میں بھی ۱۹۳۶ء میں پردہ ممنوع قرار دینے اور نکاح و طلاق کے اسلامی قوانین میں تبدیلی کرنے کے خلاف علماء نے مظاہرے کیے لیکن ان کو کچل دیا گیا، اس طرح مصدق کے زمانے میں تیل کو قومی ملکیت بنانے کے سلسلے میں علماء نے قوم پرستوں کی پر زور حمایت کی۔ علماء کی اس روایت کے پیش نظر جب ایران کے آخری بادشاہ محمد رضا شاہ نے مغرب کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تو انھوں نے علماء کا وہ حق استرداد بھی ختم کر دیا جو ان کو

---

(1) روزنامہ جسارت، کراچی مورخہ ۷/ مئی ۱۹۷۹ء مضمون "ایک ہفتہ ایران میں" از عرفان غازی۔

۱۹۰۶ء کے دستور میں ملا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد علماء کی طرف سے ۱۹۶۳ء میں پھر احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا جو وقفہ وقفہ سے جاری رہا اور ایک زبردست تحریک کی شکل اختیار کر گیا اور ایران میں یہ مطالبے عام ہو گئے کہ علماء کا حق استرداد بحال کیا جائے، خلاف شریعت قوانین منسوخ کیے جائیں۔ سنہ ہجری کی تقویم بحال کی جائے، مخلوط تعلیم کا خاتمہ کیا جائے نقاب کے خلاف قانون منسوخ کیا جائے اور تحریر و تقریر کی آزادی دی جائے اور آخر میں تحریک شاہ ایران کی معزولی اور بادشاہت کے خاتمہ کی تحریک بن گئی۔

۱۹۷۸ء کے آغاز سے ایران میں بادشاہ کے خلاف جو زبردست تحریک شروع ہوئی اس میں موجودہ دور کے ہر اسلامی ملک کی طرح ایران میں بھی دو قوتیں سرگرم تھیں۔ ایک دینی عناصر اور دوسرے اشتراکیت کے علمبردار۔ خوش قسمتی سے ایران میں شیعی نظام کی مخصوص ساخت کی وجہ سے جس میں علماء اور مجتہدین کو خصوصی مقام حاصل ہے اور ان کا عوام پر غیر معمولی اثر ہے، موجودہ انقلاب کی قیادت اشتراکی عناصر کی بجائے دینی عناصر کے ہاتھ میں آ گئی۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ایران میں جو ہنگامے ہوئے ان کا مرکز ماسکو نہیں تھا بلکہ قم تھا جو ایران کا سب سے بڑا دینی مرکز ہے۔ یہ ہنگامے دبی ہوئی بے چینی کا اظہار تھے۔ اس کے بعد جو ہنگامے شروع ہوئے وہ دبے نہیں بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ ان کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور اگست ۱۹۷۸ء تک پورا ملک ان ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہنگامے اور مظاہرے اتنے شدید تھے کہ ۲۶/ اگست کو وزیر اعظم جمشید آموز گار کو مستعفی ہونا پڑا جو اس ماہ وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے۔ ان کی جگہ شریف امامی وزیر اعظم مقرر کیے گئے لیکن وہ بھی بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو نہیں پا سکے۔ شاہ پور بختیار ایران کے آخری وزیر اعظم تھے جن کو شاہ ایران نے مقرر کیا تھا۔ جب وہ بھی ان ہنگاموں پر جن کی شدت بڑھتی چلی جا رہی تھی قابو نہ پا سکے اور فوج بھی بے بس ہو گئی تو شاہ ایران کو ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا اور وہ ۱۶۔ جنوری ۱۹۷۹ء کو ایران چھوڑ کر مصر چلے گئے اور وہاں سے میکسیکو چلے گئے اور پھر پاناما۔ یکم جنوری کو آیت اللہ خمینی جو اسلامی انقلاب کے حقیقی رہنما تھے پیرس سے تہران پہنچ گئے اور انھوں نے ۵۔ فروری کو مہدی بازرگان کو عبوری حکومت کا وزیر اعظم مقرر کیا۔ ۱۱۔ فروری کو ڈاکٹر شاہ پور بختیار نے استعفیٰ دے دیا اور فرار ہو کر فرانس چلے گئے۔ دوسرے دن پاکستان نے نئی انقلابی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ۳۰۔ مارچ کو ایرانیوں نے

استصواب رائے عامہ میں ۹۷ فیصدی کی اکثریت سے ایران سے شہنشاہیت کو ختم کر کے اس کو ایک اسلامی جمہوریہ بنانے کے حق میں رائے دی اور اس طرح نہ صرف پہلوی خاندان کے پچاس سالہ دور کا خاتمہ ہو گیا بلکہ ایران کی ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ امام خمینی نے اعلان کیا کہ اس تاریخی استصواب کے بعد ایران میں شہنشاہیت دفن ہو گئی۔ یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو باضابطہ طور پر ایران کو اسلامی جمہوریہ بنانے کا اعلان کر دیا گیا۔

پہلوی دور پر ایک نظر

پہلوی خاندان کا دور حکومت ۱۹۲۵ء میں شروع ہوا اور ۱۹۷۹ء میں ختم ہو گیا۔ گویا یہ خاندان ایران پر کل ۵۴ سال حکمران رہا۔ اس خاندان کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ ایران میں بادشاہی نظام بھی ختم ہو گیا۔ اسلامی دنیا کے غیر عرب ملکوں میں ایران آخری ملک تھا جہاں بادشاہت ختم ہوئی۔ اب چند عرب ملکوں کے علاوہ اسلامی دنیا میں کہیں بادشاہی نظام موجود نہیں۔ تاریخ میں پہلوی دور حکومت کی یہ اہمیت ہے کہ اس میں ایران قرون وسطیٰ کے دور سے نکل کر جدید دور میں داخل ہوا۔ اس سلسلے میں پہلوی حکمرانوں رضا شاہ کبیر اور محمد رضا پہلوی نے جو اقدامات کیے ان کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ آگے اب ہم ذیل میں ترقی کے ان کاموں کا جائزہ لیں گے جو محمد رضا کے دور میں معاشی، تعلیمی اور دوسرے میدانوں میں انجام دیے گئے۔

معدنی وسائل کے لحاظ سے ایران ایک خوش قسمت ملک ہے۔ لوہے، کوئلے تانبے، کرومیم اور جست کے وسیع ذخیروں کا پتہ چلا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے یہ معدنیات اگرچہ نکالی جا رہی ہیں لیکن ابھی ان کی مقدار محدود ہے۔ ایران کی معدنیات میں سب سے قیمتی چیز پٹرول ہے اور ایران کی خوشحالی میں اس کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۷۵ء میں ایران میں ۲۷ کروڑ ٹن پٹرول نکالا گیا اور ایران دنیا میں چوتھا اور اسلامی ملکوں میں دوسرا سب سے بڑا پٹرول پیدا کرنے والا ملک بن گیا۔ تیل کے علاوہ ایران میں قدرتی گیس کے بھی وسیع ذخیرے پائے جاتے ہیں، جن کی مقدار نو ارب مکعب میٹر سے زیادہ ہے۔

سیاسی استحکام، تیل کی برآمد اور اس کی قیمت میں مسلسل اضافوں کی وجہ سے ایران میں اقتصادی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی اور گزشتہ پندرہ بیس سالوں میں غیر معمولی خوشحالی آ گئی۔ تیسرے،

چوتھے اور پانچویں پنج سالہ پروگرام (۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۷ء) کامیابی سے مکمل کر لیے گئے۔

ایران ایک وسیع و عریض ملک ہے اور رقبہ کی مناسبت سے آبادی کم ہے۔ زرعی پیداوار کافی ہے اور وہاں آبادی کا وہ مسئلہ ابھی پیدا نہیں ہوا جو گنجان آبادی والے ملکوں میں نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ گیہوں، روئی، چائے، تمباکو اور چقندر بڑی زرعی پیداوار ہیں۔ بحیرۂ خزر کے کنارے مازندران اور گیلان کے صوبوں میں گھنے جنگل ہیں جن سے عمارتی لکڑی بڑی مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔ ایران اون اور ریشم کی پیداوار کے لحاظ سے بھی اہمیت کا مالک ہے۔ انگور، سیب، خوبانی اور خشک میوے بھی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایران کی زعفران ساری دنیا میں مشہور ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ زرعی پیداوار میں خود کفیل ہونے کے باوجود ایران گوشت کی پیداوار میں دوسرے ملکوں کا محتاج ہے۔ ۱۹۷۷ء میں ہونے والے ایک معاہدے کے تحت آسٹریلیا ہر سال دس لاکھ بھیڑیں اور پچاس ہزار ٹن گوشت ایران کو فراہم کرے گا۔

زرعی نقطۂ نظر سے ایران کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ ملک کا دو تہائی حصہ ریگستان بنجر اور بے آب و گیاہ ہے۔ باقی ایک تہائی حصے میں بھی آبی وسائل کی کمی ہے۔ نہ بڑے دریا ہیں اور نہ ہی شمال کے دو تین صوبوں کو چھوڑ کر باقی حصے میں بارش کافی ہوتی ہے۔ اس لیے پہلوی دور میں ایران کے محدود آبی وسائل کو ترقی دینے کی کافی کوشش کی گئی۔ اس مقصد کے لیے اب تک کئی بند تعمیر کیے جا چکے ہیں۔ ان میں صوبہ گیلان میں سدِ سفید رود اور صوبہ خوزستان میں دیز بند جس کو سد محمد رضا شاہ پہلوی بھی کہا جاتا تھا بڑے بند ہیں۔ لیکن پاکستان کے منگلا بند اور تربیلا بند کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہیں۔ یہ تمام بند کثیر المقاصد ہیں۔ یعنی پانی بھی فراہم کرتے ہیں اور بجلی بھی۔

صنعتی میدان میں پہلوی دور میں پارچہ بافی اور شکر سازی کی صنعت کو کافی ترقی دی گئی۔ دوسری صنعتیں تقریباً وہی ہیں جو پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر اسلامی ملکوں میں فروغ پا رہی ہیں اور زیادہ تر اشیائے صرف سے متعلق ہیں۔ کئی سال سے مختلف پرزوں کو جوڑ کر موٹر کاریں بھی تیار کی جا رہی ہیں جو ''پیکان'' کہلاتی ہیں۔ اسلحہ سازی کی صنعت چھوٹے اسلحہ تک محدود ہے۔ آخری چند سالوں میں شاہ ایران بھاری صنعتوں کی طرف خصوصی توجہ دے رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ایران جلد از جلد مشرق وسطی کا سب سے بڑا صنعتی ملک بن جائے۔ اصفہان میں ۱۹۷۱ء میں روس کی مدد سے فولاد سازی کا پہلا کارخانہ قائم کیا گیا جس کی صلاحیت چھ لاکھ ٹن

سالانہ تھی۔ اس کارخانہ کو مزید توسیع دے کر اس کی صلاحیت انیس لاکھ ٹن تک کی جارہی تھی۔ اس کے علاوہ ملک میں فولاد سازی کے کئی اور نئے اور بہت بڑے کارخانوں کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا گیا تھا تاکہ ۱۹۸۳ء تک فولاد سازی کے ایرانی کارخانوں کی پیداوار ڈیڑھ کروڑ ٹن تک بڑھائی جاسکے۔ زیر تعمیر کارخانوں میں سے ایک اہواز میں ہے اور ایک بندرعباس میں۔ اس آخر الذکر کارخانہ کے لیے جس کی صلاحیت تیس لاکھ ٹن ہوتی ہندوستان سے خام لوہا حاصل کرنے کے لیے معاہدہ کیا گیا تھا۔ لیکن اب نئے حقائق کی روشنی میں فولاد سازی کے ہدف کو کم کر دیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی نئے ہدف کے مطابق ۱۹۸۵ء تک فولاد کی پیداوار ستر لاکھ ٹن تک پہنچانے کی تجویز ہے۔ اگر ایران اس ہدف کو پورا کرنے کے قابل ہوگیا تو وہ فولاد تیار کرنے والا اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملک بن جائے گا۔

شاہ ایران کے زمانہ میں جن بھاری صنعتوں کو ترقی دی جارہی تھی ان میں ایک پیٹروکیمیکل صنعت بھی ہے۔ ۱۹۷۹ء کے اوائل میں جب انقلاب آیا ہے اس وقت بندرشاہ پور میں جاپان کی مدد سے قائم کیا جانے والا پیٹروکیمیکل کا ایک بہت بڑا کارخانہ ۸۵ فیصد مکمل ہو چکا تھا۔

شاہ ایران کے زمانہ میں ایٹمی توانائی کو ترقی دینے کی بھی سرتوڑ کوششیں کی جارہی تھیں اور جس وقت انقلاب آیا ہے اس وقت اہواز، اصفہان اور بوشہر میں فرانس کی مدد سے ایٹمی بجلی گھروں پر کام شروع کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح جنوب مغربی ایران سے روسی سرحد پر آستارا کے مقام تک قدرتی گیس کی سات سو میل لمبی پائپ لائن بھی زیر تکمیل ہے تاکہ روس کو گیس فراہم کی جاسکے۔

مختصر یہ کہ انقلاب سے قبل ایران میں دولت کی کثرت ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ ایران نے کم ترقی یافتہ ملکوں کو اربوں ڈالر کی امداد دینی شروع کر دی تھی امریکہ کے بڑے بڑے بنکوں میں سرمایہ لگایا جارہا تھا۔ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں کو بھی قرضے دیے جارہے تھے اور پاکستان اور ہندوستان کے کئی بڑے صنعتی منصوبوں میں ایران نے کثیر سرمایہ لگایا۔ امریکہ اور دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیوں کو امداد فراہم کی گئی اور نیویارک میں پہلوی فاؤنڈیشن کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی۔

تعلیم و علم و ادب

تعلیمی اور علمی میدان میں بھی اس دور میں ایران نے خاصی ترقی کی۔ مشہد، تہران،

اصفہان، شیراز، تبریز اور اہواز میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ دارالحکومت تہران میں یونیورسٹی کے علاوہ آریامہر یونیورسٹی آف ٹکنالوجی بھی قائم کی گئی جو انقرہ کی مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی کے نمونہ پر ہے۔اس وقت ایران میں خواندگی کا تناسب چالیس فیصد تک پہنچ گیا ہے۔

تہران جو آبادی کے لحاظ سے کراچی اور قاہرہ سمیت مشرق وسطیٰ کے تین سب سے بڑے شہروں میں سے ہے، ملک میں علم وادب اور صحافت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ انقلاب سے ذرا قبل تک یہاں سے بیس روزنامے اور اکیس ہفت روزہ اخبار شائع ہوتے تھے جو سب نجی ملکیت میں تھے۔ روزنامہ اطلاعات اور کیہان کی اشاعت ایک ایک لاکھ تھی۔ مشہد سے روزنامہ ''خراسان'' شائع ہوتا تھا جس کی اشاعت تیس ہزار تھی۔ تمام اخبارات فارسی زبان کے ہیں۔ اخبار کیہان کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا جس کی اشاعت پندرہ ہزار تھی۔ اخبارات اگرچہ آزاد تھے لیکن ۱۹۶۳ء کے قانون کے تحت کسی بھی اخبار کو مذہب یا بادشاہت پر تنقید کرنے، فوجی معلومات کا انکشاف کرنے اور عوام کو فوج کے خلاف ورغلانے پر عدالت کے فیصلے کے بغیر بند کیا جاسکتا تھا۔ قانون کے تحت اخباروں کے لیے کم ازکم تین ہزار اور رسالوں کے لیے پانچ ہزار اشاعت ضروری تھی۔ جو اخبار اور رسالے اس مقررہ حد کو پوری نہیں کرسکتے تھے وہ نہیں نکالے جاسکتے تھے۔ علمی اخبار اور رسالے اس پابندی سے آزاد تھے۔

ایران میں پہلوی دور میں جو فارسی ادب پیدا ہوا اس میں ناول، افسانے، ڈرامے اور شاعری پر اشتراکی اثرات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ لیکن علمی اور تحقیقی میدان میں جن لوگوں نے کام کیا وہ یا تو آزاد خیال ہیں یا اسلامی رجحان رکھتے ہیں۔ ایران کے علمی وادبی تحقیق میں محمد علی فروغی، سعید نفیسی، محمد قزوینی اور فروزانفر کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاعروں میں محمد تقی بہار متوفی ۱۹۵۱ء جو ملک الشعراء کہلاتے تھے، صادق سرمد، پروین اعتصامی متوفی ۱۹۴۰ء اور لاہوتی متوفی ۱۹۵۷ء کے نام اہم ہیں۔ لاہوتی کمیونسٹ تھے اور فرار ہو کر تاجیکستان چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ افسانہ نگاروں میں محمد حجازی، محمد علی جمال زادہ، عارف قزوینی متوفی ۱۹۳۴ء اور صادق ہدایت متوفی ۱۹۵۱ء کے نام قابل ذکر ہیں۔ جمال زادہ ڈرامہ نویس بھی تھے۔

اسلامی رجحانات

ایران میں گزشتہ چند سالوں سے تعلیم کے فروغ اور خوشحالی کی وجہ سے علمی وادبی تحقیق کی رفتار میں جو تیزی پیدا ہو رہی ہے اور جو اسلامی رجحان پیدا ہو رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کے ممتاز عالم اور مصنف مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''ایران کے سفر میں دوسری چیز جس سے ہمیں مسرت ہوئی وہ اسلامی آثار سے دلچسپی، عربی زبان سے تعلق، اسلامی کتابوں کی اشاعت علماء کے کارناموں کا احیاء اور قرآن کی بہترین کتابت وطباعت سے دلچسپی اور شیفتگی ہے۔ ہمیں ایران میں نادر قرآنی مخطوطات کی حفاظت واہتمام اور قرآن کی اعلیٰ نفیس طباعت کو دیکھ کر ایرانیوں کے قرآن کی عظمت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے''۔(۱)

ایران میں علماء کے دو طبقے ہیں۔ علمی اور دینی حیثیت سے بلند عہدوں پر فائز علماء کو آیت اللہ العظمیٰ کہا جاتا ہے اور دوسرے درجہ کے علماء کو صرف آیت اللہ کہا جاتا ہے۔ دار التبلیغ الاسلامی کے نام سے قم میں ایک علمی اور دینی مرکز قائم ہے۔ تہران یونیورسٹی میں دینی تعلیم کا ایک کالج قائم ہے جس کو کلیۃ الالٰہیات کہا جاتا ہے۔ یہاں اثنا عشری فقہ کے علاوہ شافعی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تہران میں ''مرکز التقریب بین المذاہب الاسلامیہ'' کے نام سے ایک مرکز قائم ہے جس کا مقصد مختلف اسلامی مسلک اور فرقوں کے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔

جون ۱۹۷۳ء میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے رابطۂ عالم اسلامی کے ایک وفد کے ساتھ ایران کا دورہ کیا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے جن تاثرات کا اظہار کیا وہ بڑے فکر انگیز ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''ایران کے سفر میں ہم نے جس چیز کا مشاہدہ کیا وہ ایرانیوں کا جذبۂ اخوت اور عالمگیر اسلامی اتحاد وتعاون کا جذبہ ہے جو وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر متفق ہو کر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم صفائی سے اعتراف کرتے ہیں کہ یہاں آنے سے پہلے اتحاد وتعاون کے اس جذبہ اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ دوستی، تعاون اور بھائی چارے اور اپنائیت کے اس احساس کا تصور نہیں کرتے تھے''

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی: دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔

''ایران میں بہائیوں اور قادیانیوں کو خارج از اسلام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کی بہائیوں کے اثرات ایران میں بڑھتے جارہے ہیں۔ بعض کلیدی عہدے ان کے ہاتھ میں ہیں اور بعض اہم سرکاری شخصیتوں پر بہائی ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔''

''ایران کے دوران قیام میں ہم نے مسجدوں کی بہ نسبت زیارت گاہوں کو زیادہ معمور، پر رونق اور زائرین سے آباد دیکھا۔ ایران میں مسجدیں عظیم الشان اور فن تعمیر کے اعتبار سے تو بعض مسجدیں نادر نمونہ ہیں اور ان کی نظیر دوسرے اسلامی ممالک میں بھی مشکل سے ملے گی، لیکن مقابر اور مزارات کے مقابلے میں ان کی حالت عبرت ناک ہے۔ بیشتر مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے..........''

''اہل بیت کی عقیدت ومحبت میں غلو کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ اور ائمہ اہل بیت کی تصویریں کثرت سے گھروں میں اور مسجدوں میں نظر آتی ہیں۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بھی جابجا آویزاں نظر آئیں''

''ہمارا احساس یہ ہے کہ شیعہ حضرات کا ائمہ اہل بیت سے غیر معمولی جذباتی تعلق اور اہل بیت کی محبت میں حد سے بڑھا ہوا انہماک، عقل، وجذبات اور ضمیر پر غالب آ گیا ہے اور ہمارا تاثر یہ ہے کہ اس شیفتگی اور شغف نے اس تعلق اور محبت کو کسی حد تک مجروح اور کمزور کر دیا ہے جو محمدؐ اور ذات محمدی کے ساتھ ہر مسلمان کا ہونا چاہیے..........''

''مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور شیعہ سنیوں کے درمیان وسیع اور گہری خلیج کو پر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جذبات وتعلق کے اس کرنٹ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی طرف موڑ دیا جائے۔ اگر اثنا عشری حضرات خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے سے قریب آئیں اور وہ صاف دل سے متحد ہو کر ایک مرکز پر جمع ہوں تو انہیں صحابہ کرام اور امہات المومنین کے بارے میں اپنے طرز فکر میں تبدیلی کرنی ہوگی اس لیے کہ افراد جماعتوں کی محبوب و محترم شخصیتوں کا جب تک احترام نہ کیا جائے گا اس وقت تک یک جہتی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی..........''

''چند برسوں سے ایرانیوں میں حج کے سفر کا شوق اور ایرانی حجاج کی تعداد برابر بڑھ رہی

ہے۔حکومت ایران اور وہاں کے محکمۂ اوقاف نے اپنے حجاج اور زائرین کی سہولت اور راحت کے لیے جو انتظامات کیے ہیں وہ بھی قابل تعریف اور قابل تقلید ہیں''

آخر میں مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

''ایرانی بھائیوں سے رخصت ہونے سے پہلے ہم ان کے سامنے ایک ایسا سوال رکھنا چاہتے ہیں جو بہت سے دماغوں میں ابھرتا ہے۔وہ سوال یہ ہے کہ آخر ایران جیسا زرخیز و مردم خیز ملک جس نے گزشتہ دور میں ہر علم وفن اور زندگی کے ہر میدان میں ایسے عبقری انسانوں کو پیدا کیا جو اپنی غیر معمولی ذہانت وصلاحیت میں عام سطح سے بلند نظر آتے ہیں یہاں تک کہ طبقات اور تراجم سیرت وتاریخ کے مطالعہ کرنے والے کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ایران میں بجز عبقری انسانوں کے اور کوئی پیدا نہیں ہوتا اور لنکا میں ہر ایک باون گز ہی کا ہوتا ہے۔لیکن ایران کے دور آخر پر نظر رکھنے والا حیرت وتعجب سے سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس مردم خیز ملک میں باکمال انسان پیدا ہونے کیوں بند ہو گئے۔ہم نے ایرانی علماء اور دانشوروں کے سامنے بھی یہ سوال پیش کیا اور ان سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال بھی کیا مگر کوئی تشفی بخش جواب ہمیں نہ مل سکا............اس انحطاط وجمود کی وجہ یہ تو نہیں کہ علم ومسلک کے بارے میں ایران میں عرصہ سے ایک مخصوص ومحدود شکل پر انحصار کر لیا گیا ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مسلک اور ہر نظام کو ملک سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔اس طرح ایران صفویوں کے دور کے بعد سے ایک خول میں زندگی گزار رہا ہے اور اس کو باہر کی علمی دنیا کے جھونکے جو اس کے علمی وفکری قویٰ میں حرکت پیدا کریں اور اس کے علمی وادبی ذخیرے میں اضافہ کریں نہیں پہنچنے پائے۔؟''(۱)

اسلامی اتحاد

جدید ایران کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ایران نے عہد صفوی اور قاچار کی علیحدگی پسندی کو چھوڑ کر اسلامی دنیا سے قریب آنے کی کوشش کی ہے اور اسلامی اتحاد کی تحریکوں میں دلچسپی لی۔

(۱) مولانا ابوالحسن علی ندوی: دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ص ۷۷۔۱۲۶، ۱۹۷۱ء مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی۔

اس سلسلے میں پہلا قدم رضا شاہ کبیر کے زمانہ میں ۱۹۳۷ء میں معاہدۂ سعد آباد کے ذریعہ اٹھایا گیا۔ اس کے بعد ایران نے معاہدۂ بغداد میں شرکت کی۔ اگرچہ یہ معاہدہ اینگلو امریکی خارجہ پالیسی کا ایک حصہ تھا، لیکن بہر حال اس کے ذریعہ ایران کو ترکی، عراق اور پاکستان سے قریب تر ہونے کا موقع ملا۔ ۱۹۶۴ء میں معاہدہ استنبول کے ذریعہ علاقائی تعاون کی تنظیم (آر۔سی۔ڈی) میں ایران کی شرکت اسی سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جو جنگ ہوئی اس میں ایران نے پاکستان کی پرجوش حمایت کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ ایران میں قوم پرستی کے فروغ کے باوجود اسلامی اخوت کا جذبہ قوی ہے۔ اگرچہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں یہ جذبہ کسی قدر سرد مہری کا شکار ہو گیا۔ اسی زمانے میں شاہ فیصل نے اتحاد اسلامی کی جو تحریک شروع کی شاہ ایران نے ایسے اقدامات بھی کیے جو خالص ایرانی قوم پرستی کے زیادہ مظہر تھے اور ان میں اسلامی مفاد سے زیادہ ایرانی مفاد کام کرتا نظر آتا تھا۔ اسرائیل کی صیہونی ریاست کو تسلیم کرنا، اس کو مراعات دینا اور آخر میں پاکستان سے سرد مہری اور پاکستان کے رقیب ہندوستان سے گرمجوشی کا اظہار اس کی دو مثالیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد اسلامی سے ظاہری دلچسپی کے باوجود شاہ ایران کے زمانے میں ایران میں اسلامی رجحانات بہت کمزور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی آئین میں اس دفعہ کے باوجود کہ کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بن سکتا، اسلام ایک زندہ قوت نہ بن سکا اور ایرانی اسلام سے دور ہوتے چلے گئے۔ ایرانی عورت نے اس دور میں صرف نقاب ہی نہیں اتارا بلکہ پوری طرح یورپی زندگی اختیار کر لی۔ وہی عریاں اور نیم عریاں لباس، مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول اور شرم و حیا سے دوری جو یورپی عورت کی خصوصیت تھی ایرانی عورت کی خصوصیت بن گئی۔ شراب کا استعمال عام ہو گیا اور فنون لطیفہ کی ترقی کے بہانے قمار، رقص و سرود، عیاشی اور بدکاری کو خوب فروغ ہوا۔ غذا کے معاملے میں حلال و حرام کا امتیاز اٹھ گیا۔ نسلی قوم پرستی کے جذبہ کو بھی اس زمانے میں بہت ہوا دی گئی۔ عربوں کے دور کو جو ایران میں عہد زریں کے آغاز کا باعث بنا حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور قبل از اسلام کے مجوسی حکمرانوں کو جن کو جدید دور سے پہلے کے ایرانی مورخوں اور ادیبوں نے (فردوسی کو چھوڑ کر) کوئی اہمیت نہ دی اب ان کو ایران کے غیر ایرانی حکمرانوں پر ترجیح دی جانے لگی اور کورش، دارا، شاہ پور اور اردشیر ایک

مرتبہ پھر ایران کے ہیرو بن گئے۔ گویا ایران نے ایک مرتبہ پھر عہد جاہلیت کی طرف لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ حالات تھے کہ ایران کی حقیقی روح نے جس کو کچلنے کی نصف صدی تک کوشش کی گئی ایک تڑپ لی ایران میں غیر متوقع طور پر اسلامی انقلاب آ گیا۔ کورش اور دارا کی نام لیوا ایرانی شہنشاہیت ہمیشہ کے لیے دفن کر دی گئی اور ایرانیوں نے اس دور کی بازیافت کا فیصلہ کر لیا جس کا آغاز جنگ قادسیہ سے ہوا تھا۔

اسلامی انقلاب اور امام خمینی

ایران میں اسلامی انقلاب کا آنا ساری دنیا کے لیے اچنبھے کا باعث ہوا۔ ایرانی ذرائع ابلاغ اور جدید ایرانی ادب، کسی کے مطالعہ سے یہ محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ایران اسلامی انقلاب کی دہلیز پر آ گیا ہے۔ ایرانی عوام وخواص اور حکمران طبقہ پر مغربی افکار اور تہذیب کی گرفت بہت سخت اور واضح تھی۔ ایران میں اسلامی بنیاد پر کام کرنے والی کوئی مضبوط تحریک موجود نہیں تھی۔ تیل کو قومی ملکیت بنانے کے زمانہ میں آیت اللہ کاشانی کی زیر قیادت ''فدائیان اسلام'' کی تحریک نے زور پکڑا تھا لیکن یہ تحریک اسلامی انقلاب لانے کے طریقوں سے ناواقف تھی اور اس نے جذباتی رنگ اختیار کر لیا تھا جس کی وجہ سے اسے کچل دیا گیا۔ اس زمانہ میں ایرانی سینٹ کے ممبر ظہیر الاسلام نے پاکستان کی قرارداد مقاصد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ''یہ قرارداد تاریخ اسلامی میں ایک سنہری باب ہے اور ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے ذہن اور فکر کو مسلمان بنا لیں''

ظہیر الاسلام کے اس تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں صحیح اسلامی خطوط پر سوچنے والے موجود تھے لیکن شاہ ایران کی جمہوریت کش اور استبدادی حکومت نے ایسے لوگوں کے لیے کام کرنے کے تمام جائز راستے بند کر دیے تھے جس کی وجہ سے یہ تحریک زیر زمین چلی گئی۔ اس کے بعد جب شاہ ایران کی استبدادی حکومت کے خلاف عوام کے جذبات بھڑک اٹھے اور وہ بادشاہی نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو علمائے ایران نے قیادت کے خلاء کو کامیابی سے پر کر دیا اور عوام کی بروقت رہنمائی کر کے ان کو غلط راستے پر نہیں جانے دیا اور اس طرح اسلامی انقلاب کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔

ایران میں اسلامی انقلاب کی تاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ابھی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انقلاب کے ہیرو آیت اللہ خمینی ہیں۔ آقائے خمینی قم کے چار مرجع علماء میں سے ہیں۔ مرجع کا رتبہ آیت اللہ سے بلند ہوتا ہے۔ باقی تین مرجع آیت اللہ کاظم شریعت مداری، آیت اللہ مرعشی اور آیت اللہ گل پائیگانی ہیں۔ اگرچہ ان میں خمینی مرجع اعلیٰ کبھی نہیں رہے لیکن اسلامی انقلاب کی قیادت کر کے انھوں نے عوام کی ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔

آیت اللہ خمینی ۲۰۔ جمادی الثانی ۱۳۲۰ھ ۲۴۔ ستمبر ۱۹۰۲ء کو ایران کے شہر خمین میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا سید احمد موسوی لکھنؤ (بھارت) کے رہنے والے تھے اور نجف اشرف (عراق) میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد خمین میں آباد ہو گئے تھے۔ خمینی کے والد مصطفیٰ موسوی وہیں ایک ایرانی لڑکی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ خمینی ابھی پانچ ماہ کے تھے کہ ان کے والد کو شرپسندوں نے قتل کر دیا۔ خمینی نے اصفہان، ارک اور مشہد میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۲۷ء میں قم کے حوزۂ علمیہ سے اجتہاد کی سند حاصل کی جس کے بعد انھوں نے درس دینا شروع کر دیا۔ وہ دارالعلوم قم میں ہفتہ میں ایک دن خطبہ دیتے تھے۔ ان کے یہ خطبے بڑے مقبول ہوئے۔ رضا شاہ اول نے خمینی کی عوام میں مقبولیت دیکھ کر خطرہ محسوس کیا اور ان کو خطبہ دینے سے منع کر دیا۔ رضا شاہ اول کے بعد جب ان کے بیٹے تخت نشین ہوئے تو امام خمینی نے درس اور خطبوں کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ وہ ان خطبوں میں جو جمال الدین افغانی کے خطبوں کی یاد دلاتے ہیں استبدادی طرز حکومت اور حکومت ایران کے غیر اسلامی اقدامات پر سخت تنقید کرتے تھے۔ شاہ ایران نے تنگ آ کر ان کو ۵۔ جون ۱۹۶۳ء کو گرفتار کر کے عراق جلاوطن کر دیا جہاں وہ اکتوبر ۱۹۷۸ء تک مقیم رہے اور شاہ ایران کے خلاف زیر زمین تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔ گرفتاری سے قبل ۱۹۶۳ء کے موسم حج (اپریل، مئی) میں ان کی مکہ معظّمہ میں مولانا مودودی سے ملاقات ہوئی۔ غالباً اس ملاقات میں انھوں نے مولانا مودودی کو شاہ ایران کے ان مظالم سے مطلع کیا جو ایرانی علماء پر کیے جا رہے تھے، کیونکہ اکتوبر ۱۹۶۳ء کے ترجمان القرآن میں ان مظالم کا حال شائع ہوا تھا جس پر ایرانی سفیر نے احتجاج کیا تھا اور کراچی میں ایرانی سفارت خانہ کے پریس اتاشی محمد علی زرنگار کا ایک جوابی مضمون دسمبر کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا۔ خمینی کی گرفتاری اور جلاوطنی کے خلاف جب ایران میں مظاہرے ہوئے تو حکومت ایران نے گولی چلا کر بے شمار مظاہرین کو شہید کر دیا۔

اس کے بعد ایران میں ہر سال علماء اس قتل عام کی یاد مناتے رہے اور گولیاں کھاتے رہے۔

عراق میں خمینی پندرہ سال مقیم رہے۔ اس مدت میں انھوں نے اسلامی حکومت کے موضوع پر قرآن وحدیث کے دروس کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کے افکار ان کے شاگردوں کے ذریعہ ایران میں پھیلتے رہے۔ انھوں نے مغربی قوانین کے نفاذ کی مخالفت کی اور زور دیا کہ اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ کے لیے قوانین عطا کیے ہیں اور اسلام میں دین اور سیاست علیحدہ نہیں ہیں۔

۱۹۷۱ء میں جب ایران میں شہنشاہیت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا جارہا تھا تو ان کا ایک بیان لندن کے جریدہ امپیکٹ (Impact) میں شائع ہوا جس میں انھوں نے کہا کہ:

''اسلام کی تاریخ درحقیقت بادشاہت کے خلاف جدوجہد کی تاریخ ہے، بادشاہی نظام عوام کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی نشوونما میں حائل ہوتا ہے اور اسلامی جمہوریہ کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سیاسی استبدادی نظام کی تمام صورتوں کو ختم کردیا جائے''

اس بیان میں خمینی نے یہ بھی کہا کہ:

''ایران میں ڈھائی ہزار سال سے آزادی کا گلا گھونٹا جارہا ہے۔ ہر حکمران عوام کا استحصال کرتا رہا ہے۔ اب شاہ بھی اسی بادشاہت کا جشن منا رہا ہے حالانکہ سوگ منانا زیادہ مناسب تھا''[1]

ایران میں آیت اللہ خمینی کے یہ افکار ان کے شاگردوں کے ذریعے پھیلتے رہے جب ان افکار کے تحت اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ایران میں انقلابی تحریک شروع ہوئی تو ایرانی حکومت نے عراق پر دباؤ ڈالا کہ وہ آیت اللہ خمینی کو عراق سے نکال دے۔ چنانچہ وہ ۶۔ اکتوبر کو فرانس چلے گئے اور پیرس کے نواح میں رہائش اختیار کرلی۔ ان کی یہ قیام گاہ انقلابیوں کا مرکز بن گئی۔ ڈاکٹر ابراہیم یزدی جو انقلاب کے بعد ایران کے نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ نامزد ہوئے اس زمانہ میں امام خمینی کے قریب ترین مشیر تھے اور انقلابی تحریک اور خمینی کے درمیان ایک رابطہ تھے۔ اس کے بعد ایران میں انقلابی تحریک روز بروز زور پکڑتی گئی اور بالآخر جیسا کہ پیچھے بیان کیا جاچکا ہے ۱۶۔ جنوری ۱۹۷۹ء کو شاہ ایران ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ یکم فروری کو خمینی ایران پہنچ گئے

---

(۱) روزنامہ جسارت کراچی۔ ۱۴۔ فروری ۱۹۷۹ء مضمون از الطاف گوہر۔

اور یکم اپریل کو استصواب عام کے بعد ایران ایک اسلامی جمہوریہ بنا دیا گیا۔

آیت اللہ خمینی تقریباً پچیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں "کشف الاسرار" سب سے اہم ہے۔ یہ کتاب ایران میں شائع ہونے والی ایک خلاف اسلام کتاب "اسرار ہزار سالہ" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں خمینی نے ان اصلاحات کی شدید مخالفت کی ہے جو مصطفیٰ کمال نے ترکی میں اور رضا شاہ اول نے ایران میں مغرب کے زیر اثر کیں۔ "ولایت فقیہ" جو اسلامی ممالک اور یورپ میں الحکومت الاسلامیہ کے نام سے شائع ہوئی ان کی دوسری اہم کتاب ہے۔ باقی کتابیں مذہبی نوعیت کی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں ایران میں ممنوع تھیں۔

ڈاکٹر علی شریعتی

ایران جدید کی فکری تاریخ میں ڈاکٹر علی شریعتی (۱۹۳۳ء تا ۱۹۷۷ء) کا نام بھی بہت اہم ہے خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے بہت متاثر ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی ماہر عمرانیات تھے اور انھوں نے فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی جو کتابیں آج کل شائع ہو رہی ہیں وہ ان کے مختلف لیکچروں کا مجموعہ ہیں۔ ان کی ایک کتاب جس کا نام "تشیع علوی و تشیع صفوی" ہے، اس میں ڈاکٹر علی شریعتی نے بنیادی شیعی عقائد کی جو تعبیر کی ہے وہ روایتی تعبیر سے مختلف ہے۔ انھوں نے شیعی علماء اور مجتہدین کے مذہبی نظام پر شدید تنقید کی ہے اور بنیادی شیعی عقائد کی جو تعبیر کی ہے وہ روایتی تعبیر سے مختلف ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ایران میں روحانیوں یعنی علماء کا جو نظام، صفوی دور سے چلا آ رہا ہے وہ ملت اسلامیہ میں فرقہ ورانہ تعصب کا باعث بنا ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی کہتے ہیں کہ تشیع علوی کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا نہیں تھا جبکہ شاہان صفوی اور ان کے زیر اثر علماء نے تشیع تفرقہ کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے خاندان یزدگرد سے اہل بیت نبوی کا رشتہ جوڑنے والی روایات کو بھی مسترد کیا ہے اور لکھا ہے کہ سوگواری اور عزاداری کے جو مراسم آج کل ایران میں رائج ہیں وہ مسیحیوں سے اخذ کیے گئے ہیں اور اس مقصد کے لیے دربار صفوی کے وزیر امور روضہ خواں کو مشرقی یورپ بھیجا گیا تھا۔

اسی طرح ڈاکٹر علی شریعتی نے دوسری شیعی اصطلاحات کے مروجہ مفہوم پر نکتہ چینی کی ہے۔ مثلاً اہل بیت کی قدر و منزلت صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ پیغمبر اسلام کے اہل بیت ہیں بلکہ اس

لیے ہے کہ اہل بیت نبوی قرآن وسنت کی اتباع کا کامل نمونہ پیش کرتے ہیں۔ڈاکٹر علی شریعتی کے خیال میں عصمت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں کو معاشرہ کی قیادت اور رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا ہے ان کے کردار میں کوئی کمزوری نہیں ہونی چاہیے۔ڈاکٹر علی شریعتی نے ایرانی نوجوانوں میں اس حقیقت کا شعور بیدار کیا کہ وہ عالمی امت مسلمہ سے علیحدہ کوئی تشخص نہیں رکھتے بلکہ اس کا ایک جزو ہیں۔اس کے علاوہ علی شریعتی نے نئی نسل کو احساس دلایا کہ اسلام ایک متحرک اور جامع ضابطۂ حیات ہے اور اس کو کلیسائی نظام کے حصار میں بند نہیں کیا جاسکتا۔وہ قانون سازی میں فیصلہ کن اختیار آئین سے بالاتر کسی فرد یا کمیٹی کو سونپنے کے بجائے آئین ہی کے تحت کسی ادارے کو سونپنا اسلام اور جمہوریت کی روح سے قریب تر سمجھتے ہیں۔ڈاکٹر علی شریعتی سے متاثر نوجوان علماء اور مجتہدین کو خصوصی اختیارات اور حق استرداد دینے کے خلاف ہیں۔

پہلوی دور میں ڈاکٹر علی شریعتی کی کتابوں پر اتنی سخت پابندیاں تھیں کہ کسی شخص کے قبضے سے ان کی کوئی کتاب برآمد ہو جاتی تو اسے تین سال قید کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔چنانچہ ڈاکٹر علی شریعتی کے لیکچر کاغذ پر منتقل ہی نہیں کیے جاتے تھے اور ان کے کیسٹ تیار کر کے ملک میں پھیلا دیے جاتے تھے۔حکومت نے تنگ آکر ڈاکٹر علی شریعتی کو جلاوطن کر دیا۔انھوں نے زندگی کے آخری ایام برطانیہ میں گزارے اور ۱۹۷۷ء میں لندن میں ان کا انتقال ہوا۔ایک خیال یہ ہے کہ ان کو ایرانی حکومت نے زہر دلوادیا تھا۔اب انقلاب کے بعد ان کے لیکچر ایران میں کتابوں کی شکل میں فروخت ہو رہے ہیں اور بعض کے انگریزی ترجمے بھی ہو گئے ہیں۔[1]

جدید ایران کی ایک اور اہم علمی شخصیت ڈاکٹر سید حسین نصر کی ہے۔وہ ڈاکٹر علی شریعتی کی طرح نظریہ ساز تو نہیں ہیں، لیکن اسلامی رجحان رکھنے والے ایک محقق ہیں۔وہ ۷۔اپریل ۱۹۳۳ء کو تہران میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے ۱۹۵٦ء میں انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) سے ایم۔اے اور پھر ۱۹۵۸ء میں تاریخ سائنس میں پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل

---

(۱) روزنامہ جسارت کراچی' دیکھیے عرفان غازی کا مضمون" ایک ہفتہ ایران میں" ۱۷ مئی ۱۹۷۹ء نیز ماہنامہ "دی یونیورسل میسیج" (The Universal Message) کراچی ستمبر ۱۹۷۹ء اور ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب (On the sociology of islam) ترجمہ از (hamid algar) شائع کردہ میزان پریس (برکلے)۔

کی۔ وہ تہران یونیورسٹی میں کئی سال سائنس اور فلسفہ کے پروفیسر رہے اور یونیورسٹی کے شعبہ دینیات میں بھی درس دیتے تھے۔ انھوں نے کئی بین الاقوامی علمی کانفرنسوں میں ایران کی نمائندگی کی۔ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کراچی یونیورسٹی اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان میں ہونے والی فلسفہ کانگریس میں ایران کی نمائندگی کی۔ ان کو عربی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں پر عبور ہے۔ ان کی کئی انگریزی کتابیں امریکہ سے اور فارسی کتابیں ایران سے شائع ہو چکی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ Three Muslim sages

۲۔ Introduction to islamic cosmological doctrines

۳۔ Science and civilization in islam

۴۔ six chapters in History of muslim philosophy

۵۔ رسالہ مع اصل صدرالدین شیرازی۔

۶۔ نظر متفکران اسلام در بارۂ طبیعت۔

۷۔ ہرمس ونوشتہ ہائے ہرمسی در جہان اسلامی۔ (۱)

نئی حکومت کی مشکلات

ان سطور کے لکھے جانے تک ایران میں اسلامی انقلاب کو آئے ہوئے تقریباً گیارہ ماہ ہو گئے ہیں، لیکن ابھی تک ایران کی صورت حال معمول پر نہیں آئی ہے۔ اور ہمارے لیے انقلاب کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر کوئی قطعی بات کہنا ممکن نہیں۔ ابتدائی چند ماہ انقلاب دشمن عناصر کی بیخ کنی میں گزر گئے۔ پچھلی حکومت سے تعلق رکھنے والے بیشمار لوگوں کو انقلابی کمیٹیوں نے سرسری سماعت کے بعد گولیوں سے اڑا دیا اور بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اسلامی انقلاب نہیں بلکہ انقلاب فرانس ہے جس میں ہزاروں لاکھوں انسان گلوٹین کی نذر ہو گئے تھے اور یہ اسلامی کمیٹیاں نہیں بلکہ کمیونسٹوں کی عوامی کمیٹیاں اور عوامی عدالتیں ہیں جو اپنے مخالفوں کے خلاف بیدردی سے انتقامی کاروائیاں کر رہی ہیں۔ جو ازہر کاروائی کا ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ انقلاب

(۱) نقوش، لاہور ''آپ بیتی'' نمبر حصہ دوم جون ۱۹۶۴ء

فرانس اور انقلاب روس کے علمبردار بھی اپنے مظالم اور خونریزی کی پردہ پوشی کے لیے دلائل کا سہارا لیتے تھے۔ ایران کی اسلامی کمیٹیوں کے پاس بھی دلائل موجود ہیں کہ کسی کو بے قصور قتل نہیں کیا گیا ہے اور صرف ان لوگوں کو سزا دی گئی ہے جو شاہی دور میں قتل و غارت گری کے مرتکب ثابت ہوئے۔ اور یہ دلیل بھی خاصی وزنی ہے کہ اگر شاہ پرست عناصر کا سختی سے قلع قمع نہ کیا جاتا تو اسلامی انقلاب خطرہ میں پڑسکتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انقلاب پرامن طریقہ سے نہیں آیا بلکہ عوام نے سینوں پر گولیاں کھا کر اپنے وقت کے بدترین جابروں اور ظالموں سے اقتدار بزورِ شمشیر چھینا ہے لہٰذا ایسی صورت میں یہ توقع رکھنا کہ انقلابی اپنے بدترین دشمنوں سے نرمی کا سلوک کرتے ایک انہونی بات ہے۔ بہرحال ایران میں اسلامی انقلاب کی شان جلالی کا اظہار تو ہو چکا اب دیکھنا یہ ہے کہ شان جمالی کا اظہار کب اور کیسے ہوتا ہے۔

ایران ابھی تک اندرونی اور بیرونی مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ اگرچہ اس دوران کئی اہم تعمیری قدم بھی اٹھائے جا چکے ہیں۔ ملک کو یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو اسلامی جمہوریہ قرار دے کر ایک تاریخی اہمیت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایران میں اسرائیلی سفارت خانہ بند کر دیا گیا ہے اور سفارت خانہ کی عمارت میں تنظیم آزادی فلسطین کا دفتر کھول دیا گیا ہے۔ یہ دونوں فیصلے ایسے ہیں جن کا پوری اسلامی دنیا میں خیر مقدم کیا گیا۔ ۸/ جون کو ایرانی بنکوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور شاہی خاندان کی زمینیں کسانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ اخلاقی اصلاحات بھی کی گئی ہیں شراب اور قمار پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ زنانِ بازاری کا پیشہ ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ زنا ہر شکل میں جرم ہے۔ رقص و سرود پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے اور عریانیت جس کو پہلوی دور میں خوب فروغ ملا۔ اب کہیں نظر نہیں آتی۔ ریڈیو۔ ٹیلیویژن کے پروگراموں اور نصاب تعلیم میں اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ اسلامی آئین کے مسودہ کی دسمبر ۱۹۷۹ء کے شروع میں ایک استصواب عام کے ذریعہ ایرانی عوام کی اکثریت نے توثیق کر دی ہے۔ آئین کے تحت قانون سازی فقہ جعفری کے مطابق کی جائے گی لیکن شخصی معاملات میں سنی فقہ کا خیال رکھا جائے گا۔ آئین کی اس دفعہ پر کردستان اور بلوچستان کی سنی آبادی نے اعتراض کیا ہے اس کے علاوہ آئین کے تحت امام خمینی کو جو غیر معمولی اختیارات دیے گئے ہیں اُن پر بھی بعض حلقوں میں اعتراض کیا گیا ہے۔

ایران کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ نسلی اور لسانی اعتبار سے غیر ایرانی باشندوں پر مشتمل

ہے۔ آذربائیجان کی اکثریت ترکی بولنے والے باشندوں پر مشتمل ہے۔ آذربائیجان سے ملحق کردستان کا صوبہ ہے جہاں کردوں کی اکثریت ہے۔ ایرانی بلوچستان میں بلوچی بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ اس کے علاوہ خوزستان کے ایک حصہ میں عربوں کی اور خراسان کے ایک حصے میں ترکمانوں کی اکثریت ہے۔ ان تمام غیر ایرانی باشندوں میں ایسے عناصر موجود ہیں جو علیحدگی پسند ہیں اور ان کو بیرونی ملکوں خصوصاً اشتراکی نظریات کے حامل ملکوں کی ہمدردیاں اور مدد حاصل ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ نئی ایرانی حکومت اس مسئلہ کو کس طرح حل کرتی ہے۔ سوویٹ یونین نے اشتراکی نظریہ کی بالادستی کے تحت خود مختاری کے حق کو تسلیم کر کے اپنی لسانی اقلیتوں کے مسئلہ کو کامیابی سے حل کیا ہے۔ اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسلامی جمہوریہ ایران بھی اسلام کی بالادستی کی بنیاد پر اپنی لسانی اقلیتوں کے مسئلہ کو حل نہ کر سکے۔

ایران کی خارجی الجھنیں بھی داخلی الجھنوں سے کم نہیں۔ دریائے شط العرب بحرین اور خلیج فارس پر حقوق کے مسئلہ پر ایران کے اپنے پڑوسی عرب ملکوں سے اختلافات چلے آرہے ہیں۔ یہ اختلافات کبھی کم ہو جاتے ہیں اور کبھی بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن حل ابھی تک نہیں ہوئے۔ اب جب کہ ایران میں اسلامی انقلاب آچکا ہے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ایران ان مسائل پر بھی قومی بنیاد کی بجائے اسلامی بنیاد پر اپنے پڑوسیوں سے کوئی مفاہمت کر سکے گا۔ لیکن اس مفاہمت کے لیے پڑوسی ملکوں کے طرز فکر کا بھی اسلامی ہونا ضروری ہے۔

انقلاب کے بعد ایران میں حالات مستحکم ہوتے چلے جا رہے تھے کہ ۴۔ نومبر ۱۹۷۹ء کو بعض پرجوش نوجوانوں نے تہران میں امریکی سفارت خانہ پر قبضہ کر کے اور امریکی عملہ کو یرغمالی بنا کر ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک شاہ ایران کو جو علاج کے لیے امریکہ آئے ہوئے ہیں۔ ایران کے حوالہ نہیں کیا جاتا۔ یرغمالیوں کو آزاد نہیں کیا جائے گا۔ طلبہ کو امام خمینی کی حمایت حاصل ہے۔ وزیر اعظم مہدی بازرگان جو حکومت کے معاملات میں انقلابی کمیٹیوں کی مداخلت سے پہلے ہی تنگ آچکے تھے اب جب انھوں نے اس موقع پر خود کو بے بس پایا تو ان کی کابینہ نے استعفیٰ دے دیا ان کے بعد ایران کا نظم و نسق انقلابی کونسل کے ہاتھ میں چلا گیا۔

۱۹۸۰ء میں جب ابوالحسن بنی صدر ۷۵ فیصد ووٹوں کی اکثریت سے ایران کے صدر منتخب ہوئے تو ان کو بھی اسی ردعملی کا سامنا کرنا پڑا۔

ایران میں کمیونزم کے اثر ورسوخ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔شاہ ایران کے خلاف جدو جہد میں کمیونسٹ عناصر اسلامی عناصر کے دوش بدوش شریک رہے ہیں اس لیے ان کی بنیاد بھی مضبوط ہے تودہ پارٹی ایران کی پہلی منظم سیاسی پارٹی تھی۔ اسلامی جمہوری پارٹی بھی جس کے ہاتھ میں اس وقت اقتدار ہے منظم طریقے پر انقلاب کے بعد قائم ہوئی۔ اگرچہ تودہ پارٹی پر پابندی عائد ہے لیکن شہروں میں اس کے اثرات ہیں اور اس کو روس کی تائید بھی حاصل ہے۔شاہ کے حامی عناصر بھی موجود ہیں جن کو امریکہ اور مغربی ممالک کی ہمدردی حاصل ہے۔ ایران کے اندرونی خلفشار سے یہ تمام بیرونی طاقتیں جو اسلامی انقلاب سے خوش نہیں ہیں فائدہ اٹھاسکتی ہیں اور کسی نہ کسی بہانے ایران میں مداخلت کرسکتی ہیں۔اب جب کہ جذباتی دور گزر چکا ہے۔ایران کو ان بیرونی خطروں سے بچانے اور اسلامی انقلاب کو مستحکم کرنے کے لیے سنجیدہ غیر جذباتی اور دور اندیش قیادت کی ضرورت ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ قیادت اس چیلنج کو کس طرح قبول کرتی ہے۔

باب ۱۴

ترکی: قیامِ جمہوریت کے بعد

تاریخی پس منظر

پہلی عالمی جنگ میں ترکوں کی شکست عالم اسلامی کا ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس شکست نے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا۔ خلافت کے عرب مقبوضات ایک طویل مدت کے لیے برطانیہ اور فرانس کی غلامی میں چلے گئے۔ ترکوں میں عرب دشمنی اور اس کے نتیجے میں اسلام دشمنی کے جراثیم سرایت کر گئے۔ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی تحریک کامیاب ہوگئی اور دنیائے عرب کے قلب میں اسرائیل کی شکل میں ایک ناسور پیدا ہوگیا۔ خود اناطولیہ کی سرزمین جسے عثمانی دور میں سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی۔ شکست کے اثرات سے نہ بچ سکی استنبول پر پہلی مرتبہ غیر مسلم فوجیں قابض ہوگئیں۔ خلیفہ بے بس ہوگیا اور حکومت عثمانیہ معاہدہ سیورے (seures) پر دستخط کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس معاہدہ کے تحت عثمانی حکومت کو نہ صرف اپنے عرب علاقوں سے دست بردار ہونا پڑا بلکہ ترکی کی سرزمین کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ تراقیا یعنی تھریس (ترکی کا یورپی حصہ) اور مغربی ترکی یونان کو دے دیا گیا۔ ترکی کے جنوبی حصے اٹلی اور فرانس کے سپرد کر دیے گئے۔ اور مشرقی ترکی میں ارمنی اور کرد باشندوں کی آزاد حکومتیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ باسفورس اور دانیال کے دونوں کنارے جن میں دارالخلافہ استنبول بھی شامل تھا بین الاقوامی نگرانی میں دیدیے گئے اور ترکوں کو اپنی آزاد مملکت قائم کرنے کا حق صرف ترکی کی نیم بنجر وسطی سطح مرتفع اور اس سے ملے ہوئے شمالی ساحل تک محدود کر دیا گیا۔

جس وقت جنگ بندی ہوئی تو چار سال کی جنگ میں تین لاکھ ۲۵ ہزار ترک فوجی شہید اور چار لاکھ زخمی ہو چکے تھے۔ شام اور عراق میں لڑنے والی فوجیں منتشر اور نڈھال ہو کر ترکی کی حدود میں ادانہ تک پسپا ہو چکی تھیں۔ پوری ترکی میں صرف قفقاز کا محاذ ایسا تھا جہاں ترک فوجیں ابھی تک کمزور نہیں پڑی تھیں۔ انور پاشا کے بھائی نوری پاشا کی قیادت میں ایک فوج روسی

آذربائیجان میں داخل ہو کر باکو اور داغستان پر اور دوسری فوج جنرل کاظم قرہ بکر پاشا (۱۸۸۲ء تا ۱۹۴۸ء) کی قیادت میں ایرانی آذربائیجان کے صدر مقام تبریز پر قابض ہو چکی تھی۔ لیکن جنگ بندی کے بعد فوجیں واپس بلالی گئیں۔ انگریزوں نے موصل پر قبضہ کرلیا۔ پھر یونانیوں نے ادرنہ اور مغربی ترکی میں فوجیں داخل کر دیں۔ اٹلی نے جنوبی ساحل پر فوجیں اتار دیں۔ فرانسیسی فوج شام کی طرف سے رعش اور غازی عنتب تک بڑھ آئیں۔ اسی دوران آرمینیہ کی نوآزاد حکومت نے شمالی مشرقی ترکی میں داخل ہو کر قرص، اردھان اور آرتوین پر قبضہ کرلیا۔ اتحادیوں کا بحری بیڑہ دردانیال سے گزر کر پہلے ہی دارالخلافہ استنبول کے سامنے لنگر انداز ہو چکا تھا۔ ۱۶۔ مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادی فوجیں بھی شہر میں داخل ہو گئیں۔ مختصر یہ کہ معاہدہ سیورے پر دستخط سے پہلے ہی اتحادی اپنے مقاصد کو بڑی حد تک حاصل کر چکے تھے۔

ترک اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہے تھے۔ ان کی سلطنت ہی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ قومی وجود بھی خطرہ میں پڑ چکا تھا۔ لیکن حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ گو عثمانی فوجیں شکست کھا چکی تھیں۔ ترک قوم نے شکست تسلیم نہیں کی تھیں۔ معاہدہ سیورے کی شرائط کی پوری قوم نے شدت سے مخالفت کی۔ خود عثمانی پارلیمنٹ نے ۱۲۔ جنوری ۱۹۲۰ء کو اپنے آخری اجلاس میں اس کی مخالفت کی۔ اور ترکی کی قومی حدود کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ استنبول پر چونکہ دشمن قابض ہو چکا تھا اس لیے حریت پسندوں نے مصطفیٰ کمال کی قیادت میں انقرہ میں قومی حکومت قائم کر لی جہاں عثمانی پارلیمنٹ کے آخری اجلاس کے صرف تین ماہ بعد مجلس کبیر ملی نے عثمانی پارلیمنٹ کی جگہ لے لی۔ ترکی کی آزادی کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس جنگ کے ہیرو مصطفیٰ کمال تھے۔

مصطفیٰ کمال اور جنگ آزادی

مصطفیٰ کمال عثمانی فوج کے ایک ممتاز سپہ سالار تھے۔ وہ یونان کے شہر مالوے نیکا میں جو اس وقت عثمانی سلطنت میں شامل تھا۔ ۱۸۸۱ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ فوجی مدرسے میں داخل ہو گئے جہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد فوج میں منصب سنبھال لیا۔ مصطفیٰ کمال اس زمانے کے نوجوان ترکوں کی طرح سلطان عبدالحمید کی استبدادی حکومت کے خلاف تھے۔ ان کی خفیہ سرگرمیوں کی وجہ سے سلطان نے ان کو جنوری ۱۹۰۵ء میں

دارالخلافہ سے دور شام میں بھیج دیا۔ یہاں مصطفیٰ کمال نے ۱۹۰۶ء میں ''وطن وحریت'' کے نام سے ایک خفیہ تنظیم قائم کی جو بعد میں اتحاد وترقی میں ضم کر دی گئی۔ ۱۹۰۷ء میں مصطفیٰ کمال کو سالونیکا بلا لیا گیا اور وہ محمود شوکت پاشا کی اس ''حرکت اردو'' یعنی لشکر عمل میں شامل تھے جس نے استنبول میں اس ہنگامہ کو فرو کیا جو ۳۱۔ مارچ کے واقعہ یا حادثہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کے بعد سلطان عبدالحمید معزول کر دیے گئے تھے۔

۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس اور ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان میں بھی مصطفیٰ کمال نے شرکت کی۔ جنگ عظیم چھڑنے کے بعد وہ گیلی پولی، شام اور قفقاز کے محاذوں پر تعینات کیے گئے۔ لیکن جس معرکہ نے مصطفیٰ کمال کو بین الاقوامی شہرت دی وہ گیلی پولی یا دردانیال کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں انھوں نے برطانیہ اور فرانس کی متحدہ قوت کو پسپا کر کے حیرت انگیز جنگی کارنامہ انجام دیا۔

جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ۱۹۔ مئی ۱۹۱۹ء کو مصطفیٰ کمال بحری راستے سے سمنون پہنچے۔ ان کو حکومت نے اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اناطولیہ میں حریت پسندوں کی سرگرمیوں پر قابو پا سکیں۔ لیکن انھوں نے اناطولیہ پہنچ کر حکومت سے قطع تعلق کر لیا اور تحریک آزادی کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ ارض روم اور سیورس میں حریت پسندوں کے اجتماعات ہوئے اور انقرہ میں قومی حکومت قائم کر دی گئی۔ جدوجہد آزادی کو ——— منظم کرنے میں جنرل کاظم قرہ بکر پاشا کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔ مشرقی محاذ کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی اور ان کی کمان میں ایک منظم اور مضبوط فوج تھی۔ جب سلطان نے مصطفیٰ کمال کو گرفتار کرنے کا حکم دیا تو کاظم قرہ بکر پاشا نے انکار کر دیا اور خود کو اور اپنی فوج کو مصطفیٰ کمال کے ہاتھ میں دے دیا۔ مصطفیٰ کمال اس پر خوشی سے اچھل پڑے اور کاظم قرہ بکر پاشا سے لپٹ گئے۔[1] کاظم قرہ بکر پاشا کے اس اقدام سے حریت پسندوں کو بڑی مدد ملی اور وہ اس قابل ہو گئے کہ حملہ آوروں کے خلاف کارروائی کر سکیں۔

حملہ آوروں کے خلاف پہلی فوجی کارروائی جنرل کاظم قرہ بکر پاشا نے کی اور انھوں نے شمال مشرقی ترکی سے ارمنی حملہ آوروں کو نکال کر قرص، اردھان اور توین پر قبضہ کر لیا۔ اپنی اس کارروائی کی وجہ سے ترک ان کو ''فاتح شرق'' کہتے ہیں۔ حریت پسندوں کی قوت کو دیکھ کر جلد ہی فرانس اور

(۱) کاظم قرہ بکر پاشا: استقلال حرب امیرص ۹۹۔ استنبول ۱۹۶۰ء۔ اس سلسلے میں وہ خط بھی بڑا اہم ہے جو رؤف بے نے ۴۔ جولائی ۱۹۴۱ء کو کاظم بکر پاشا کو لکھا تھا اور جو مذکورہ بالا کتاب کے آخر میں ضمیمہ میں موجود ہے۔

اٹلی نے ترکی کی سرزمین سے اپنی فوجیں واپس بلالیں اور اب صرف یونانی میدان میں رہ گئے۔ مصطفیٰ کمال نے اب یونانیوں کی طرف رخ کیا۔ انھوں نے ستمبر ۱۹۲۱ء میں سفاریہ کی جنگ میں اور اس کے بعد ۳۰۔ اگست ۱۹۲۲ء کو ڈملوپنار (dumin pinar) کی عظیم جنگ میں یونانیوں کو شکست فاش دے کر ۹۔ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ازمیر سے بھی ان کو نکال دیا۔ قوم پرستوں کی ان کامیابیوں کے پیش نظر اتحادیوں نے استنبول بھی خالی کردیا۔ ۲۴۔ جولائی ۱۹۲۳ء کو لوازان میں ترکی اور اتحادیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا جس میں ترکی کی قومی حدود اور آزادی کو بڑی حد تک ترکوں کی خواہش کے مطابق تسلیم کرلیا گیا۔ اس طرح آزادی کی پنج سالہ جنگ کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور سلطنت عثمانیہ کی جگہ آزاد ترکی جمہوریہ وجود میں آ گئی۔ کامیابی کا سہرا یقیناً مصطفیٰ کمال کے سر تھا۔ ترک قوم نے ان کے اس کارنامے پر ان کو اتاترک یعنی ترکوں کے باپ کا خطاب دیا۔ ترکی جمہوریہ کے بانی کی حیثیت سے ترکی میں ان کا وہی مقام ہے جو پاکستان میں قائداعظم کا ہے۔

تبادلہ آبادی

آزادی کے بعد ترکی کو جن نازک مسائل کا سامنا کرنا پڑا، ان میں ایک مسئلہ یونان اور ترکی کے درمیان تبادلہ آبادی کا تھا، عثمانی خلافت کے زمانے میں ترکی کے مغربی حصوں میں یونانی باشندے کثیر تعداد میں آباد تھے، ان یونانیوں نے یونانی فوجوں کے ترکی میں داخلے کے وقت ترک باشندوں پر بڑے مظالم کیے تھے، جس کی وجہ سے یونانی اور ترک باشندوں کے درمیان ایک دوسرے سے سخت نفرت اور دشمنی پیدا ہوگئی تھی، دونوں قوموں کی اس کشیدگی کی وجہ سے یونان میں ترک مسلمان بھی خطرے میں پڑ گئے تھے۔ چنانچہ معاہدہ لوازان کے بعد یونان اور ترکی کی حکومتوں نے ترکوں اور یونانیوں کے درمیان آبادی کے تبادلے کا فیصلہ کیا، اس فیصلے کے تحت ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان تقریباً بارہ لاکھ یونانی باشندے ترکی سے نقل وطن کرکے یونان چلے گئے، اور تقریباً چار لاکھ ترک باشندے یونان سے نقل وطن کرکے ترکی میں آکر آباد ہوگئے اس تبادلہ آبادی کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ترکی یونانیوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہوگیا۔

اتاترک کے زمانے کے اہم واقعات میں ایک باسفورس، اور دردانیال کی قلعہ بندی بھی ہے، آبنائے باسفورس اور دردانیال بحیرہ اسود کو بحیرہ رُوم سے ملاتی ہے، اور اس لحاظ سے یہ آبنائے

بین الاقوامی شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن یہ آبنائے ترکی کے اندر سے گزرتی ہے اور سرزمین ترکی کا ایک حصہ ہے، ترکی کے دفاع میں آبنائے باسفورس اور دردانیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور اسی لیے عثمانی دور میں اس آبنائے کے دونوں طرف ترکوں نے قلعہ بندیاں کر رکھی تھیں، یہ قلعہ بندیاں جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے بعد توڑ دی گئی تھیں اور ان کو دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ترکوں کا یہ دفاعی حق تسلیم کر لیا گیا، اور ترکوں نے باسفورس اور دردانیال کے کنارے دوبارہ دفاعی مورچے بنا لیے۔

اتاترک کے عہد میں ترکی میں صنعتی دور کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں پانچ پانچ سال کے ترقیاتی منصوبے بنائے گئے اور ان کے تحت ملک کو صنعتی وزرعی، تعلیمی اور سماجی لحاظ سے ترقی دی گئی، ترقی کا بیشتر کام سرکاری سرمایہ اور سرکاری نگرانی میں انجام دیا گیا۔ ترکی پہلا اسلامی ملک ہے جس میں ترقیاتی کام پنج سالہ منصوبوں کے تحت انجام دیا گیا، ان منصوبوں کی بدولت ترکی میں صنعتی ترقی کی داغ بیل پڑ گئی، صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے مسائل بھی پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں ملک میں پہلا مزدور قانون نافذ ہوا۔

سیکولر جمہوریت

مذکورہ بالا واقعات اگرچہ جدید ترک کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن مصطفیٰ کمال کے دور کی اصل اہمیت ان انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے ہے۔ جو اتاترک کی اصلاحات کہلاتی ہیں اور جن کی بنیاد اسلام کی بجائے مغربی تصورات اور نظریات پر رکھی گئی ہے۔ صدر سوکارنو کے پنج شیلا کی طرح اتاترک کی اصلاحات کی بنیاد چھ اصولوں پر تھی جو ترکی زبان میں چھ تیر یا چھ ہدف (Altiok) کہلاتے ہیں۔ یہ اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ جمہوریت۔	۲۔ قوم پرستی۔	۳۔ عوام پسندی۔
۴۔ قومی ملکیت۔	۵۔ سیکولرازم یا لادینیت۔	۶۔ انقلابیت۔

اتاترک نے اصلاحات کا آغاز بادشاہت کو ختم کر کے اور ترکی کو ایک جمہوریہ قرار دے کر کیا۔ اسی ضمن میں انھوں نے خلافت کا نظام بھی ختم کر دیا جو مسلمانوں کے لیے نظریاتی اور جذباتی اہمیت تو رکھتا تھا لیکن اپنی روح سے خلافت راشدہ کے بعد ہی محروم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد

اتاترک نے ۱۹۲۸ء تک مسلسل مختلف اصلاحات نافذ کیں۔ خانقاہوں کو بند کر دیا گیا اور تصوف کے سلسلے ختم کر دیے گئے۔ تعدد ازدواج پر پابندی لگادی گئی اور مغرب کے دیوانی اور فوجداری قوانین پر مشتمل ضابطے بنائے گئے، ہجری کیلنڈر کی جگہ مغربی شمسی کیلنڈر اختیار کیا گیا۔ پردہ کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ ترکی ٹوپی کو ممنوع قرار دے کر ہیٹ پہننا لازمی قرار دیا گیا۔ شادی اور طلاق وغیرہ سے متعلق اسلامی عائلی قوانین میں تبدیلی کر کے مغربی قوانین نافذ کیے گئے۔ عربی میں اذان اور تکبیر خلاف قانون قرار دی گئی۔ دینی تعلیم کے مدرسے بتدریج بند کر دیے گئے اور آخر میں ترکی جمہوریہ کے آئین سے اسلامی ریاست کی دفعہ نکال کر ملک کو ایک سیکولر یا لادینی جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ مغرب کی دوستی میں مصطفیٰ کمال اس حد تک بڑھ گئے کہ انھوں نے جامع ایاصوفیہ کو جو مسلمانوں کے دور فتوحات کی ایک عظیم یادگار تھی مسجد سے عجائب گھر میں تبدیل کر دیا۔ ترکی زبان اور رسم الخط میں بھی تبدیلی کی گئی اور ترکی کے عربی رسم الخط کو بدل کر لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا اور اس طرح ترک اپنے پانچ سو سالہ ادب سے جو اسلامی فکر کی ترجمانی کرتا تھا قلم کی ایک جنبش سے بے تعلق کر دیے گئے۔ اتاترک کے دور میں اس کی پوری کوشش کی گئی کہ ترکی کو مشرق سے کاٹ دیا جائے اور اس کو ایک مغربی ملک سمجھا جائے۔ رنگ، نسل اور وطن پر مبنی قوم پرستی کے مغربی نظریے کو جو انسانی دوستی کے اسلامی نظریہ کی ضد ہے پوری قوت اور شدت سے اپنایا گیا۔ ترکوں کی تاریخ کے اسلامی دور کی جو ترکوں کی تاریخ کا سب سے شاندار اور قابل فخر دور ہے، اہمیت گھٹانے اور قبل از اسلام کے ترکی دور کی اہمیت بڑھانے اور اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ سیکولرازم دوسرے ملکوں میں بھی اختیار کیا گیا لیکن ترکی کا سیکولرازم ان سے بہت مختلف تھا۔ ترکی میں ایک طویل عرصہ تک سیکولرازم کی اس طرح تعبیر کی گئی کہ گویا یہ اصول اور مذہب دشمنی، ہم معنی ہیں۔ اس طرز عمل کے نتیجے میں ترکی میں مخالف اسلام عناصر کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا اور اسلامی فکر رکھنے والوں کی کمر ٹوٹ گئی۔[1] ترکی شاید اسلامی دنیا کا پہلا ملک ہے جس میں شراب سازی سرکاری سرپرستی میں شروع کی گئی اور اس مشروب کو جسے ام الخبائث کہا گیا ہے ملک میں سرکاری سرپرستی کے تحت عام کیا گیا۔

(۱) اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے کمال۔ ایچ۔ کرپٹ کی کتاب (Turkey's politiocs) اور میری کتاب بدیع الزمان سعید نورسی کا باب ''ترکی کی سیکولر جمہوریت''

ان تبدیلیوں پر جن کو ''اصلاحات'' کا نام دیا جاتا ہے، نظر ڈالنے سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اتاترک کے کام کرنے کا طریقہ اسلامی دنیا کے لیے بالکل نیا تھا۔ اسلامی تاریخ میں اب تک کسی نے اس قسم کی اصلاحات نہیں کی تھیں، تاریخ اسلام میں عمر بن عبدالعزیز سے لے کر ٹیپو سلطان اور محمود ثانی تک جتنے اچھے بادشاہ ہوئے ہیں انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ اصلاح کا کام اسلامی تعلیم اور اصولوں کے مطابق کریں اور نئے قوانین کتاب وسنت کے مطابق بنائیں لیکن اتاترک نے ایسا نہیں کیا۔

اس میں شک نہیں کہ اتاترک کا ترکوں پر بڑا احسان ہے۔ انھوں نے ان کو غیر مسلم اقتدار سے آزادی دلائی اور بادشاہت کا غیر اسلامی نظام ختم کر کے جمہوری حکومت قائم کی جو اسلامی تعلیم کے مطابق ہے اور جو خلفائے راشدین کا طرز حکومت تھا، انھوں نے اپنے ملک کو ترقی دینے کی اور اس پستی سے نکالنے کی جس میں سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد ترکی گر گیا تھا، جان توڑ کوشش کی لیکن انھوں نے غلطی یہ کی کہ اصلاح کا کام مغربی انداز میں کیا، اسلامی انداز میں نہیں کیا، یہ اصلاحات ایک مغربی ملک کے لیے تو ٹھیک ہو سکتی تھیں، لیکن ایک ایسے ملک کے لیے جہاں مسلمان آباد ہوں اور جن کی تہذیب اسلامی بنیادوں پر قائم ہو درست نہیں ہیں۔ ایک مسلم ملک میں سچی ترقی اسلامی بنیادوں پر کام کرنے سے ہی ہو سکتی ہے اور اسی طرح اسلامی انفرادیت اور اسلامی اتحاد کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

مصطفیٰ کمال نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ اسلام کو سیاسی اور ملکی معاملات سے الگ کر دیا۔ اور اس طرح انھوں نے ترکوں کو جو مسلمان ہیں قرآن اور سنت کی رہنمائی سے عرصہ تک محروم رکھا۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں جو نظام تعلیم رائج کیا گیا اور جو کتابیں لکھیں گئیں ان کی وجہ سے ترکوں کی نئی نسل صحیح اسلامی شعور سے محروم ہوگئی اور اسلام کا سیاسی نظام ''معاشی نظام'' اور معاشرتی نظام جیسی اصلاحات اس کے لیے اجنبی بن گئیں۔ نامق کمال سعید حلیم پاشا اور محمد عاکف کے افکار اس کے لیے فرسودہ ہوگئے۔ ہم اتاترک کو دوسرا اکبر قرار دے سکتے ہیں۔ دونوں ذہین اور بیدار مغز حکمران تھے۔ دونوں نے سیاسی میدان میں عظیم کارنامے انجام دیے لیکن دونوں نے اسلام کی رہنمائی سے انکار کر دیا۔ جس طرح اکبر کے سب سے بڑے مداح ہندو اور مغربی اہل قلم ہیں اسی طرح کمال اتاترک کے بھی سب سے بڑے مداح اہل یورپ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کمالی

اصلاحات ترکی میں اہل یورپ کی فتح اور اسلامی تہذیب کی شکست ہیں جو ان قوموں کا محبوب مقصد ہے۔

اسلامی عناصر کی ناکامی کے اسباب

اتاترک کی ان اصلاحات دیکھ کر ذہن میں فطری طور پر یہ خیال ابھرتا ہے کہ ایک ایسی قوم میں جو صدیوں تک اسلام کا بازوئے شمشیرزن رہی ہو جو خلافت کی علمبردار ہو اور جس کا حکمران خود کو خادم حرمین شریفین کہلاتا ہو اور جس ملک میں نامق کمال سعید حلیم پاشا اور محمد عاکف جیسے اسلامی فکر رکھنے والے اہل قلم پیدا ہوئے ہوں اس ملک میں انتہا پسندانہ نوعیت کی یہ غیر اسلامی اصلاحات کس طرح کامیاب ہوگئیں اس کا جواب تفصیل طلب ہے اور اس تاریخ کے مختصر صفحات میں اس پر بحث کرنا ممکن نہیں۔ ہمارے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ترکوں اور عربوں کے درمیان وہ عناصر کافی طاقت ور ہوگئے تھے جو قوم پرستی کے مغربی نظریہ پر ایمان رکھتے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران عربوں کی بغاوت نے ان عناصر کے لیے سازگار فضا پیدا کردی۔ اور وہ یہ کہنے کے قابل ہوگئے کہ جب مذہب کا رشتہ اتنا کمزور ہے کہ ترک اور عرب مسلمان ہوتے ہوئے متحد نہیں رہ سکے تو قومی زندگی میں مذہب کو داخل کرنے کی کیا ضرورت۔ اس طرح سیکولرازم کے حامی قوم پرستوں نے عربوں کی نفرت کے سہارے اسلام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے بعد انور پاشا اور ان کے ساتھیوں کو جو اسلامی اقدار کے کسی نہ کسی حد تک حامی تھے ملک چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کرنی پڑی یا ان کو انگریزوں نے گرفتار کرلیا اور اس طرح ترکی کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو انور پاشا کے مخالف تھے اور اسلام سے زیادہ گہرا تعلق نہیں رکھتے تھے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ مصطفیٰ کمال کی غیر معمولی فوجی اصلاحات اور جنگ آزادی میں ان کی کامیابی نے مصطفیٰ کمال کی مقبولیت میں بے حد اضافہ کردیا اور مصطفیٰ کمال نے اس مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے نظریات ترک قوم پر ٹھونس دیے۔

آخری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کمال اتاترک نے ترکی جمہوریہ کے ابتدائی سالوں میں ملک کے استحکام کے نام پر سلطان عبدالحمید سے زیادہ سخت استبدادی نظام قائم کردیا تھا۔

ملک میں صرف ایک ہی سیاسی پارٹی تھی۔ یعنی جمہور خلق پارٹی (پیپلز ریپبلکن پارٹی) ۱۷۔نومبر ۱۹۲۴ء کو کاظم قرہ بکر[1] پاشا، علی[2] فواد پاشا، رؤف[3] بے، عدنان آدیوار[4] ور رفعت پاشا نے خلق پارٹی سے استعفیٰ دے کر ''ترقی پرور جمہوریت پارٹی کے نام سے ایک حزب اختلاف قائم کی تھی۔ اس پارٹی کا مقصد مذہب کو حکومت کی مداخلت سے بچانا اور آمرانہ رجحانات کی روک تھام کرنا تھا۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے اگلے سال اس جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اور ۱۹۲۶ء میں اپنے قتل کی سازش کے الزام میں حزب اختلاف کے اکیس رہنماؤں کو قتل کر دیا۔ اور ڈیڑھ سو رہنماؤں کو جلاوطن کر دیا۔ ان میں مذکورہ بالا رہنما بھی شامل تھے۔ رفعت پاشا کو پھانسی دے دی گئی۔ کاظم قرہ بکر پاشا کو بھی گرفتار کیا گیا لیکن عوام کے زبردست مظاہروں کے بعد ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد خلق پارٹی نے بلاشرکت غیرے ۱۹۵۰ء تک حکومت کی اور اس طرح حکومت اس قابل ہوگئی کہ اپنے فیصلوں کو بغیر کسی رکاوٹ کے نافذ کر سکے۔

۱۰۔نومبر ۱۹۳۸ء کو استنبول کے تاریخی محل دولمہ باغیچہ میں مصطفیٰ کمال کا انتقال ہوا۔ جنازہ ۱۹۔نومبر تک استنبول میں رکھا گیا۔ جب جنازہ اٹھایا گیا تو اس کے جلوس میں شرکت کرنے والوں میں افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ خان کا نام قابل ذکر ہے جو اتاترک کے بہت بڑے مداح تھے۔ اس کے بعد جنازہ بحری جنگی جہاز یاووز (yavuz) میں بندرگاہ ازمت تک لایا گیا اور وہاں سے ریل گاڑی کے ذریعہ انقرہ پہنچایا گیا۔ جہاں ان کی قبر پر مغربی طرز کا ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

---

(۱) کاظم قرہ بکر پاشا (۱۸۸۲ء تا ۱۹۴۸ء) نے تحریک آزادی سے متعلق اپنے تاثرات گیارہ سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب میں قلم بند کیے ہیں۔ جسے ۱۹۶۰ء میں خلاف قانون قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اب یہ پابندی اٹھ گئی ہے۔

(۲) علی فواد (CEBESOY) قفقاز کے محاذ بیسویں فوج کے کمانڈر تھے۔ انھوں نے بھی اپنے تاثرات ایک کتاب میں قلمبند کیے ہیں۔

(۳) حسین رؤف بے (۱۸۸۱ء تا ۱۹۶۰ء) عثمانی دور میں وزیر بحر اور امیر البحر تھے۔

(۴) عدنان آدیوار (۱۸۸۲ء تا ۱۹۰۰ء) بلند پایہ محقق تھے۔ ترکی زبان کی ''اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین میں سے ہیں۔ خالدہ خانم کے شوہر تھے۔

عصمت انونو

کمال اتاترک کے انتقال کے بعد عصمت انونو ترکی کا صدر منتخب کیا گیا۔ عصمت انونو ۲۴۔ ستمبر ۱۸۸۴ء کو ازمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام مصطفیٰ عصمت تھا۔ فوجی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۶ء میں یوزباشی (کپتان) کی حیثیت سے فوج میں شامل ہوئے۔ بلقان کی جنگ میں حصہ لیا اور پہلی عالمی جنگ میں قفقاز، فلسطین اور شام کے محاذوں پر خدمات انجام دیں۔ جنگ بندی کے بعد استنبول آگئے اور وزارت جنگ میں مستشار (کونسلر) ہوگئے۔ استنبول پر اتحادی قبضہ تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد اناطولیہ پہنچ کر جنگ آزادی میں شرکت کی۔ ان کو مغربی محاذ کی کمان سپرد ہوئی۔ انھوں نے اسکی شہر کے شمال مغرب میں انونو کے مقام پر ۱۰۔ جنوری ۱۹۲۱ء اور یکم اپریل ۱۹۲۱ء کو یونانیوں کو دومرتبہ شکست دی۔ ترکی میں خاندانی نام اختیار کرنے کے قانون کے بعد انھوں نے اسی مقام کی نسبت سے انونو کا نام اختیار کیا۔ جنگ بندی کے بعد وہ وزیر خارجہ ہوگئے۔ اور لوزان کانفرنس میں ترکی وفد کی قیادت کی۔ لوزان سے واپسی کے بعد ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو وہ ترکی کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور یکم نومبر ۱۹۳۷ء تک پورے چودہ سال اس عہدہ پر قائز رہے۔ اتاترک کے انتقال کے دوسرے دن ۱۱ نومبر ۱۹۳۷ء کو وہ ترکی کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۴ مئی ۱۹۵۰ء تک صدر رہے۔ اس کے بعد دس سال تک انھوں نے ترکی پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کے قائد کی حیثیت سے فرائض انجام دیے، فوجی انقلاب کے بعد جب مخلوط حکومت قائم ہوئی تو عصمت انونو ۲۰۔ نومبر ۱۹۶۱ء سے ۱۳۔ فروری ۱۹۶۵ء تک دوبارہ وزیر اعظم رہے۔ اس کے بعد پھر حزب اختلاف میں چلے گئے۔ ان کا ۲۵۔ دسمبر ۱۹۷۳ء کو انقرہ میں انتقال ہوا۔

عصمت انونو کے ساڑھے بارہ سالہ دور صدارت میں کئی اہم واقعات پیش آئے۔ جنگ عظیم کے بعد شام کے علاقے پر فرانسیسی حکومت قائم ہوگئی تھی اسکندرونہ اور انطاکیہ کے ساحلی اضلاع اس وقت شام میں شامل تھے لیکن ترکوں کا دعویٰ تھا کہ یہ ترکی کے علاقے ہیں۔ یہاں کی آبادی ترکوں، عربوں اور ارمنی باشندوں پر مشتمل تھی۔ لیکن ترکوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ شام بھی ان اضلاع کا دعویدار تھا۔ اس اختلاف کی وجہ سے انطاکیہ اور اسکندرونہ کے علاقے میں

مئی ۱۹۳۷ء میں ایک نیم خودمختار حکومت قائم کر دی گئی تھی۔ اس حکومت کی منتخب مجلس کے چالیس ارکان میں سے بائیس ترک تھے۔ اس مجلس نے اتفاق رائے سے ترکی سے الحاق کا فیصلہ کیا اور ۲۳۔ جولائی ۱۹۳۹ء کو یہ دونوں اضلاع ترکی میں شامل ہو گئے۔ انطاکیہ کا نام بدل کر حطائے (hatay) کر دیا گیا۔

عصمت انونو کے دور کا دوسرا اہم واقعہ ان جلاوطن رہنماؤں کی واپسی ہے۔ جن کو کمال اتاترک نے ملک بدر کر دیا تھا۔ پابندی اٹھنے کے بعد یہ رہنما جن میں ڈاکٹر عدنان آدیوار، خالدہ خانم اور رؤف بے شامل تھے اپنے وطن واپس آ گئے۔

دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) بھی عصمت انونو کے زمانہ صدارت میں ہوئی۔ اس جنگ میں ترکی مصطفیٰ کمال کی ''اندر امن اور باہر امن'' کی خارجہ پالیسی پر چلتے ہوئے انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود غیر جانبدار رہا جس کی وجہ سے وہ جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا۔ ترکی نے اس معاملہ میں دونوں فریقوں کے دباؤ کا مقابلہ کیا۔ اور جرمنی کے خلاف ۲۳۔ فروری ۱۹۴۵ء کو صرف اس وقت جنگ کرنے کا اعلان کیا جب اتحادیوں نے یہ اعلان کیا کہ اقوام متحدہ میں صرف ان ملکوں کو مدعو کیا جائے گا جو جرمنی سے برسر جنگ ہوں گی۔ اس وقت تک جرمنی بھی جنگ ہار چکا تھا۔ جنگ کے بعد روس نے ترکی کے شمال مشرقی اضلاع قرص اور اردھان پر دعویٰ کر دیا۔ حالانکہ ۱۶۔ مارچ ۱۹۲۱ء کو ترکی سے ایک معاہدے کے تحت وہ ان علاقوں سے دست بردار ہو چکا تھا۔ اور ترکی روسی جارجیا کے شہر باطوم سے جس پر کاظم قرہ بکر پاشا کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ دست بردار ہو گیا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد وہ اپنے عہد نامہ سے پھر گیا۔ اس نے صرف قرص اور اردھان کی واپسی ہی کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ باسفورس اور دردانیال کے دفاع میں بھی روس کو شریک کرنے کا مطالبہ کیا۔ روس کے اس طرز عمل کی وجہ سے ترکی کی سلامتی کو خطرہ پیدا ہو گیا اور روس کے مقابلے میں اپنا دفاع کرنے کے لیے ترکی کو امریکہ سے فوجی امداد حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

عصمت انونو کے دور کی خارجہ پالیسی کا ایک افسوس ناک واقعہ ۲۸۔ مارچ ۱۹۴۹ء کو اسرائیل کی یہودی مملکت کو ترکی کی طرف سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ روس کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے ترکی اپنے دفاع کے لیے مغربی ملکوں کا زیادہ سے زیادہ

محتاج ہوتا جارہا تھا۔ ترکی نے اسرائیل کو ازروئے قانون نہیں بلکہ حقیقت امر کے طور پر تسلیم کیا۔ ترکوں کے اس فیصلے سے عربوں اور ترکوں کے تعلقات میں جو معمول پر آتے جارہے تھے۔ ایک بار پھر کشیدگی پیدا ہوگئی۔

عصمت انونو کے عہد کا ایک اہم کارنامہ زرعی اصلاحات کا نفاذ ہے۔ جس پر ۱۹۴۵ء سے عمل درآمد شروع ہوا۔ ان اصلاحات کے تحت بڑی بڑی زمینداریاں معاوضہ دے کر ختم کی گئیں اور فاضل زمین چھوٹے کاشت کاروں میں تقسیم کی گئی۔ ان اصلاحات کی وجہ سے دیہی علاقوں میں خوشحالی پیدا ہوئی۔

ڈیموکریٹ پارٹی

عصمت انونو کے دور صدارت کا سب سے اہم واقعہ حقیقی جمہوریت کی بحالی ہے، کمال اتاترک کے زمانے میں جیسا کہ بتایا جاچکا ہے اگرچہ ترکی کا سیاسی ڈھانچہ بنیادی طور پر جمہوری تھا لیکن کمال اتاترک نے حکومت آمرانہ انداز سے کی ملک میں اسی تمام عرصہ میں صرف ایک ہی سیاسی پارٹی کام کرسکتی تھی اور وہ تھی سرکاری خلق، فرقہ سی یعنی خلق پارٹی جسے انگریزی میں پیپلز پارٹی کہا جاتا ہے، شروع میں اتاترک نے ترقی پرور[1] جمہوریت (progressive republican party) کے نام سے ایک اور پارٹی قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی، لیکن ۱۹۲۵ء میں اس کو توڑ دیا گیا، اس طرح ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۶ء تک ترکی پر صرف ایک خلق پارٹی حکومت کرتی رہی۔ عصمت انونو کو اپنے آخری دور میں عوامی دباؤ کے تحت کئی مفید اصلاحات کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان میں ایک یہ تھی کہ ملک میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ ترکی میں کئی سیاسی جماعتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں ڈیموکریٹک پارٹی سب سے اہم تھی۔ یہ

---

(۱) یہ جماعت ۱۷۔ نومبر ۱۹۲۴ء کو مشرقی ترکی کے فوجی کمانڈر کاظم قرہ بکر پاشا نے قائم کی تھی، کاظم قرہ بکر پہلے شخص تھے جنھوں نے مشرقی ترکی میں آزادی کی تحریک کی تنظیم کی تھی انھوں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، وہ اتاترک کے خیالات کے مخالف تھے اور اس وجہ سے انھوں نے اور کئی ممتاز رہنماؤں نے ریپبلکن پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دے کر مذکورہ بالا جماعت قائم کی تاکہ استبدادی رجحانات کا مقابلہ کیا جاسکے اور اسلام کا تحفظ کیا جاسکے لیکن اتاترک نے کردستان کی بغاوت کا بہانہ لے کر ۵۔ جون ۱۹۲۵ء کو یہ جماعت توڑ دی۔ ۱۹۲۶ء میں اتاترک کے قتل کی سازش کے غلط الزام میں کاظم قرہ بکر کو گرفتار کیا گیا لیکن بعد میں عوام کے زبردست مظاہروں کی وجہ سے رہا کرنا پڑا۔

جماعت جنوری ۱۹۴۶ء میں جلال بایار نے عدنان مندریس، رفیق کورالتن اور فواد کو پیرولو کے تعاون سے قائم کی تھی۔ ان دونوں رہنماؤں نے ترکی کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ اور عصمت انونو کے زمانے میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے تھے، اسی زمانہ میں ترکی کے کمانڈر انچیف مارشل فوزی چقماق[1] نے بھی ملت پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں مارشل چقماق کے انتقال کی وجہ سے یہ جماعت نمایاں نہیں ہو سکی۔

سیاسی آزادی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اب حکومت پر کھل کر تنقیدیں ہونے لگیں ڈیموکریٹک پارٹی اور ملت پارٹی کو حکومت کی مذہبی پالیسی پر خاص اعتراض تھا۔ گذشتہ ۲۴ سال کے عرصہ میں حکومت نے مذہب کو جو نقصان پہنچایا اور اسلامی رجحانات کو جس طرح دبایا اس پر اب ہر طرف سے اعتراض ہونے لگے۔ چنانچہ عوام کے دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو ۱۹۴۸ء میں ابتدائی مدرسوں میں اسلامی تعلیم کی اجازت دینی پڑی ڈیموکریٹک پارٹی نے جولائی ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں پہلی مرتبہ حصہ لیا لیکن جماعت کو قائم ہوئے چونکہ ابھی چھ ماہ ہی گذرے تھے۔ اس لیے اس انتخاب میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن چار سال بعد ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کو زبردست کامیابی ہوئی۔

ڈیموکریٹک پارٹی کی اس کامیابی کی دو سب سے بڑی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس پارٹی کے رہنماؤں نے مکمل مذہبی آزادی[2] دلانے کا وعدہ کیا اور دوسرے یہ کہ انھوں نے صنعتی

---

(۱) فیلڈ مارشل (فوزی چقماق (۱۸۷۶ء تا ۱۹۵۰ء) جدید ترکی کے معماروں میں شمار ہوتے ہیں کمال اتاترک اور عصمت انونو کے بعد وہ تحریک آزادی کے تیسرے بڑے رہنما تھے۔ قیام جمہوریت کے بعد سے ۱۹۴۴ء تک وہ ترک فوج کے کمانڈر انچیف رہے۔ اس کے بعد وہ فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ فوزی چقماق سچے اور مخلص مسلمان تھے ان کو خلق پارٹی یعنی پیپلز پارٹی سے اختلافات تھے۔ چنانچہ جب ترکی میں سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت ملی تو ایک گروہ نے ۱۹۴۸ء میں ملت پارٹی (نیشن پارٹی) قائم کی اور فوزی چقماق کو اس کا اعزازی صدر مقرر کیا۔ فوزی چقماق اس جماعت کی طرف سے استنبول سے پارلیمنٹ کے امیدوار نامزد کیے گئے تھے۔ لیکن ۱۰۔ اپریل ۱۹۵۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ہردلعزیزی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے جنازے میں پانچ لاکھ افراد نے شرکت کی، ان کو وصیت کے مطابق حضرت ابوایوب انصاری کی قبر کے قریب دفن کیا گیا۔

(۲) مشہور امریکی رسالے ''مسلم ورلڈ'' نے اکتوبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ ترکی میں اسلام کے اثرات اتنے شدید ہیں کہ ہر سطح کے سیاسی رہنما دیہات سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اسلام سے ہم آہنگ اور وفادار ثابت کر دکھائیں۔

اداروں اور کارخانوں کو قومی ملکیت کی بجائے نجی ملکیت میں چلانے کی حمایت کی۔ کیونکہ گذشتہ ۲۴۔ سال کے تجربے سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ سرکاری ملکیت میں جو کارخانے ہیں وہ کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔

عصمت انونونظریاتی طور پر اتاترک کے اصولوں کے بہت بڑے علمبردار تھے لیکن ان کے مخالفین کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنے دورصدارت میں استبدادی انداز کا مظاہرہ کیا۔ سوشلسٹ عناصر کی حوصلہ افزائی کی اور ترکی میں اسلامی رجحانات کو ابھرنے سے روکا۔ وہ اتاترک کے دور کی خامیوں اور غلطیوں کا ذمہ دار بھی عصمت انونو کو قرار دیتے ہیں جو اتاترک کے پورے دور میں وزیراعظم کے منصب پر فائز رہے۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت بھی ان ہی کے دورصدارت میں ملی اور صدارت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی ترکی میں جمہوریت کو زندہ رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔

جلال بایار کا دورصدارت

۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کی کامیابی کے بعد جلال بایار صدر اور عدنان مندریس وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اتاترک اور عصمت انونو بنیادی طور پر فوجی تھے۔ اس کے برخلاف جلال بایار اور عدنان مندریس غیر فوجی رہنما تھے۔ جلال بایار کا پورا نام محمود جلال بایار ہے۔ وہ ولایت بروصہ کے ایک گاؤں عمر میں ۱۵۔ مئی ۱۸۸۳ء کو پیدا ہوئے۔ قیام جمہوریہ سے قبل وہ زراعتی بینک اور جرمن بینک سے وابستہ تھے ۱۹۱۹ء میں وہ عثمانی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۲۔ جنوری ۱۹۲۰ء کو عثمانی پارلیمنٹ کے آخری اجلاس میں شریک ہوئے۔ وہ اتحاد و ترقی کی ازمیر کی شاخ کے سکریٹری بھی تھے۔ اس کے بعد وہ اناطولیہ چلے گئے۔ اور قومی تحریک میں شریک ہوگئے۔ لوزان کانفرنس میں جلال بایار ترکی وفد کے مشیر تھے۔ ۱۹۲۱ء میں وزیر اقتصادیات ہوگئے۔ اس زمانے میں انھوں نے ترکی میں بنکاری کو ترقی دینے کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۳ء میں جلال بایار ازمیر سے مجلس کبیر ملی کے رکن منتخب ہوئے۔ مصطفیٰ کمال کے آخری دنوں میں ۱۹۳۷ء میں ترکی کے وزیراعظم ہوئے لیکن کمال اتاترک کے انتقال کے بعد جب عصمت انونو صدر ہوئے تو ان سے اختلاف کی وجہ سے ۲۵۔ جنوری ۱۹۳۹ء کو وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہوگئے بعد میں انھوں نے سرکاری جمہور خلق پارٹی سے بھی علیحدگی

اختیار کرلی اور عدنان مندریس اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ۱۹۴۶ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کی کامیابی کے بعد ۲۲۔مئی ۱۹۵۰ء کو وہ ترکی کے صدر منتخب ہو گئے۔ اس منصب پر وہ ۲۷۔مئی ۱۹۶۱ء کے فوجی انقلاب تک فائز رہے۔ فوجی حکومت نے جب مقدمہ چلا کر عدنان مندریس کو پھانسی دی تو جلال بایار کو بھی سزائے موت سنائی گئی جو ان کی ضعیف العمری کی وجہ سے سزائے قید میں تبدیل کر دی گئی۔ پارلیمانی زندگی کی بحالی کے بعد ان کی سزا ختم کر دی گئی اور اب وہ بڑی حد تک گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھوں نے اس زمانہ میں اپنی زندگی کی سرگزشت لکھی۔ یہ سرگزشت ۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۲ء کے درمیان آٹھ جلدوں پر مشتمل ضخیم کتاب کی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ کتاب کا نام (Ben de Yazdim) (میں نے بھی لکھا) ہے اور دو ہزار آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جلال بایار محنتی، مستعد، حلیم الطبع اور نیک دل انسان ہیں۔

عدنان مندریس

ڈیموکریٹک پارٹی کے دس سالہ دور حکومت میں اگرچہ صدارت کے عہدے پر جلال بایار فائز رہے لیکن اس دور حکومت کے اصل روح رواں وزیر اعظم عدنان مندریس تھے۔ عدنان بے مشرقی ترکی کی ولایت آیدن (aydin) میں ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق چودھویں صدی عیسوی کے مشہور ترک طبیب حاجی علی پاشا کے خاندان سے تھا۔ عدنان بے نے ازمیر کے امریکی کالج میں تعلیم پائی۔ اور پھر انقرہ یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۵۔مئی ۱۹۱۹ء کو جب یونانی ازمیر میں داخل ہوئے تو عدنان مندریس نے ان کے خلاف دفاعی جدوجہد میں پر جوش حصہ لیا۔ جلال بایار سے ان کا پہلا تعارف اسی موقع پر ہوا۔ قیام جمہوریہ کے بعد وہ آیدن کی لبرل پارٹی کی شاخ کے صدر ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال نے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ کیا اور اتاترک کی ہدایت پر وہ ۱۹۳۰ء میں آیدن سے مجلس کبیر ملی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس کے بعد وہ ۱۹۰۹ء تک برابر رکن منتخب ہوتے رہے۔

عدنان مندریس کا تعلق ایک زراعت پیشہ خاندان سے تھا۔ اس لیے ان کو زراعت سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے کمال اتاترک اور عصمت انونو کے دور میں ولایت آیدن اور اس سے ملحقہ علاقے کو سیلابوں سے بچانے اور زراعت کو ترقی دینے کے لیے ناقابل فراموش خدمات

انجام دیں۔ ان کی کوششوں سے اس علاقے میں ساٹھ ہزار ایکڑ پر مشتمل دلدلوں کو خشک کیا گیا اور اس وسیع علاقے کو زراعت کے قابل بنایا گیا۔ انھوں نے یہاں نہریں کھدوائیں، پل بنوائے اور جدید طرز کی کاشت کو رواج دیا۔ انھوں نے اپنے ذاتی مزرعہ میں جو تجربے کیے وہ ترکی میں زراعت کے لیے نمونہ بن گئے۔ عدنان مندریس نے اعلانیہ اور کوتاہیہ کی ولایتوں میں بھی تعمیر و ترقی کے کام انجام دیے۔[1] جب ترکی میں خاندانی نام اختیار کرنے کا قانون بنا تو عدنان بے نے اپنے لیے مندریس کا نام اختیار کیا جو مشرقی ترکی کا ایک اہم دریا ہے۔ اور اس علاقہ میں زرعی خوشحالی کا باعث ہے۔ عصمت انونو کے صدر ہونے کے بعد عدنان مندریس کے ان سے اختلافات ہوگئے۔ وہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک خلق پارٹی سے وابستہ رہنے کے بعد اس جماعت سے علیحدہ ہوگئے اور جب ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کی اجازت ہوگئی تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ۷۔ جنوری ۱۹۴۶ء کو ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی۔ ایک سے زیادہ پارٹی قائم کرنے کے قانون اور ۱۹۴۸ء میں انتخابی قوانین میں جو جمہوری نوعیت کی ترمیمیں کی گئیں ان سب میں عدنان مندریس کا نمایاں ہاتھ تھا۔ کمال اتاترک کے انتقال کے بعد سے جلال بایار اور مندریس ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھی رہے اور ان دونوں کا ایک دوسرے سے ویسا ہی تعلق تھا جو مصطفیٰ کمال سے عصمت انونو کا تعلق تھا اور جب ۱۹۵۰ء میں ڈیموکریٹک پارٹی نے خلق پارٹی کی ۶۹ نشستوں کے مقابلے میں ۴۰۸ نشستیں حاصل کرکے شاندار کامیابی حاصل کی تو جلال بایار صدر اور عدنان مندریس وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت سے ترکی جمہوریت کے جس دور کا آغاز ہوا اس کو ترکی کی تاریخ میں انقلاب سفید کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا انقلابی دور جس میں جمہوریت بحال ہوئی عوام کو خوشحالی حاصل ہوئی اور ترک عوام کے لیے اسلام پر چلنے کی راہ میں عائدشدہ پابندیاں ختم ہوئیں۔ عدنان مندریس کو ترکی میں جمہوریت کا اصل معمار سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کے دور کو مصطفیٰ کمال کے دور کا تسلسل سمجھا جاتا ہے۔ ایک ایسا تسلسل جس میں عصمت انونو کے دور نے خلیج حائل کردی تھی۔

---

(۱) اجر تجر (Acar Tuneer) عدنان مندریس مطبوعہ ازمیر ۱۹۵۸ء۔

ڈیموکریٹک پارٹی کے دور میں صنعت اور زراعت کو تیزی سے ترقی دی گئی بہت سی صنعتوں اور کارخانوں کو جو پہلے سرکاری ملکیت میں تھیں۔ نجی ملکیت میں دے دیا گیا جس کی وجہ سے نجی کاروبار کو فروغ ہوا۔ اس دور میں زراعت پر بھی خاص توجہ دی گئی۔ بند اور نہریں تعمیر کی گئیں۔ کسانوں کی حالت بہتر ہوئی، ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا اور بندرگاہوں کو توسیع دی گئیں۔

اس دور میں دفاعی معاملات میں ترکی مغربی ملکوں کا اور زیادہ محتاج ہو گیا جنگ کے بعد سے برطانیہ اور امریکہ وسیع پیمانے پر ترکی کو اسلحہ فراہم کر رہے تھے ۲۴۔ اگست ۱۹۴۹ء کو جب بلجیم، کناڈا، ڈنمارک، فرانس، آئس لینڈ، اٹلی، لکسمبرگ، ہالینڈ، ناروے، پرتگال، برطانیہ اور امریکہ نے روس کے مقابلہ میں میثاق شمالی اوقیانوس (NATO) کے نام سے ایک دفاعی تنظیم قائم کی تو ۱۹۵۲ء میں ترکی بھی اس تنظیم میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد ۲۴۔ فروری ۱۹۵۵ء کو ترکی نے مشرق وسطیٰ کی ایک اور دفاعی تنظیم معاہدہ بغداد میں شمولیت کر لی جسے ۲۱۔ اگست ۱۹۵۹ء کے بعد ادارہ میثاق مرکزی (CENTO) کا نام دیا گیا۔ ان معاہدوں کی وجہ سے ترکی پوری طرح مغربی بلاک سے وابستہ ہو گیا۔ مغربی ملکوں سے اس وابستگی کو اسلامی ملکوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ خصوصاً عرب ملکوں میں جو فلسطین کی وجہ سے مغربی ملکوں کے خلاف صف آرا تھے اس کے خلاف ردعمل اور شدید ہو گیا۔ لیکن ترکی کی بھی اپنی مجبوریاں تھیں۔ اشتراکی روس کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ صرف اس صورت سے کیا جا سکتا تھا کہ ترکی پوری طرح مغرب کے دفاعی نظام سے وابستہ ہو جائے۔

مذہبی آزادی

ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت کے زمانے میں ترکی کی مذہبی پالیسی میں بھی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ نئی حکومت نے عوام سے کیے ہوئے وعدے پورے کیے۔ ترکی میں ۱۹۳۲ء سے یہ پابندی تھی کہ اذان اور تکبیر عربی میں نہیں کہی جا سکتی تھیں اور ۱۹۴۱ء کے بعد سے اس حکم کی خلاف ورزی جرم قرار دے دی گئی تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ ۱۶۔ جون ۱۹۵۰ء کو مجلس کبیر ملی کی قرارداد کے ذریعہ اس قانون کو منسوخ کر دیا اور اس دن وزیراعظم عدنان مندریس نے تار کے ذریعے تمام صوبوں میں اطلاع بھیج دی کہ دوسرے

دن سے ترکی میں اذان اور تکبیر اقامت عربی میں کہی جاسکتی ہے۔ ۱۷۔ جون ۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء ترکی کی تاریخ کا ایک یادگار دن ہے جب اٹھارہ سال کے بعد پہلی مرتبہ ترکی کے طول و عرض میں عربی میں اذان دی گئی۔

عدنان مندریس کے دور وزارت میں سڑکوں کے علاوہ مسجدیں بھی اس کثرت سے تعمیر کی گئیں کہ لوگ ان کو "مسجدوں اور سڑکوں" کا وزیر اعظم کہنے لگے۔ مندریس نے کمال اتاترک کے مقبرے کے سامنے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی اور اس کے لیے اپنی جیب سے ایک لاکھ لیرا دیے۔

جمہور خلق پارٹی کے دور میں حج پر بھی پابندیاں تھیں۔ ۱۹۵۰ء میں یہ پابندیاں بھی اٹھالی گئیں اور اس سال پچیس سال کے بعد چار سو تیس ترکوں نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ اس کے بعد حاجیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۶۴ء میں اکیس ہزار چھ سو ترکوں نے حج کیا اور اب کئی سال سے سب سے زیادہ عازمین حج ترکی سے آتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں ایک لاکھ ۳ ہزار ترکوں نے حج کیا اور ۱۹۷۷ء میں اکیانوے ہزار چار سو نے حج کیا۔ حج پر اب کسی قسم کی پابندی نہیں بلکہ اس معاملے میں حکومت سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ ہر جہاز میں سرکاری خرچ پر مفتی فراہم کیے جاتے ہیں۔ حاجیوں کو لے جانے والے طیاروں میں ایر ہوسٹس خواتین کے لیے پورا لباس پہننا لازمی ہوتا ہے اور آب زمزم کے ڈبے بغیر کرائے کے بھیجے جاسکتے ہیں۔ (۱)

عدنان مندریس کا ایک اور کارنامہ محکمہ امور مذہبی کا قیام ہے۔ یہ محکمہ ویسے تو اتاترک کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ لیکن اس زمانہ میں اس کا دائرہ کار محدود تھا اور اس کا کام اسلامی پیغام کی توسیع و اشاعت سے زیادہ اسلامی سرگرمیوں (۲) کی نگرانی کرنا تھا۔ لیکن ڈیموکریٹک پارٹی کے عہد حکومت میں اس محکمہ نے اسلامی علوم کی توسیع و اشاعت اور عوام میں اسلامی روح پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ محکمہ امام اور خطیب تیار کرتا ہے اس کے تحت ملک میں اعلیٰ اسلامی تعلیم کے

---

(۱) ہفت روزہ ایشیا لاہور مورخہ ۹۔ فروری ۱۹۶۹ء مضمون خلیل احمد حامدی۔

(۲) اتاترک کے زمانے میں ۱۹۲۵ء میں دینی مدارس یہ کہہ کر بند کردیے گئے تھے کہ یہ "برائی کے اڈے" ہیں۔ اس وقت دینی مدارس کی تعداد ۲۴۲ تھی لیکن پابندی کے دس سال بعد یہ تعداد صرف بیس رہ گئی۔ ۱۹۵۰ء سے یہ مدرسے پھر قائم ہونا شروع ہوگئے۔ علاوہ ازیں سرکاری مدارس میں جہاں صرف دنیوی تعلیم ہوتی ہے۔ مذہبی تعلیم کا نصاب بھی داخل درس کردیا گیا۔ پانچویں اور چھٹی جماعت میں مذہبی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور کالجوں اور یونیورسٹی میں مذہبی تعلیم کے شعبے جاری کیے گئے۔

مراکز قائم کیے جاتے ہیں، محکمہ کے تحت پرانی اور نئی اسلامی کتابوں کے ترکی میں ترجمے کرائے جاتے ہیں۔ اس محکمہ کے تحت جن مشہور مصنفوں کی کتابیں ترجمہ کی گئیں ہیں ان میں پاکستان کے مولانا مودودی اور مصر کے سید قطب اور محمد قطب شامل ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈیموکریٹ پارٹی کے عہد میں وہ بیڑیاں بڑی حد تک کاٹ دی گئیں جو ترکی میں جمہوریت کے قیام کے وقت اسلام کے پاؤں میں ڈال دی گئی تھیں۔ عدنان مندریس خاص طور پر اتاترک کے نظریات کے اس قدر مخالف تھے کہ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اگر ان کا بس چلے تو ملک سے اتاترک کی ایک ایک یادگار مٹا دیں۔

فوجی انقلاب

۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹ پارٹی نے خلق پارٹی کی ۶۹ نشستوں کے مقابلے میں ۴۰۸ نشستیں حاصل کی تھیں۔ ۱۹۵۴ء میں بھی ڈیموکریٹ پارٹی کو زبردست کامیابی ہوئی اور اس نے خلق پارٹی کی ۳۱ نشستوں کے مقابلے میں پانچ سو نشستیں حاصل کیں۔ ڈیموکریٹ پارٹی کے دور میں ترقیاتی منصوبوں میں وسیع سرمایہ کاری کی وجہ سے ملک میں گرانی پیدا ہوگئی۔ جس سے ملک میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ پھر بھی ۱۹۵۷ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹ پارٹی کو خلق پارٹی کی ۱۷۸ نشستوں کے مقابلے میں چار سو بیس نشستیں حاصل ہوئیں۔ ڈیموکریٹ پارٹی کی یہ مسلسل کامیابیاں اس کی مقبولیت کا واضح ثبوت تھیں۔ مشہور ترک قانون دان اور استنبول اور انقرہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر، ڈاکٹر علی فواد باشگل (Bashgil) نے اپنی کتاب ۲۷۔ مئی کا انقلاب اور اس کے اسباب میں لکھا ہے کہ "اتاترک کے بعد عدنان مندریس ترکی کے سب سے مقبول رہنما تھے۔[1] عدنان مندریس نے اپنی اس مقبولیت کے سہارے ترکی کے ان عناصر کی ہمنوائی شروع کردی جو ترکی کے آئین سے سیکولرزم[2] کی دفعہ نکالنا چاہتے تھے۔ اتاترک کی

(۱) باشگل علی فواد: ۲۷۔ مئی کا انقلاب اور اس کے اسباب (ترکی زبان) استنبول ۱۹۶۶ء۔

(۲) ترک دانشور اور مورخ عثمان توران مرحوم نے لکھا ہے کہ "عدنان مندریس کا سب سے بڑا کارنامہ سیکولرزام کی نئی تعبیر ہے۔ مندریس نے اس بات پر زور دیا کہ سیکولرازم کا مطلب مذہب دشمنی نہیں بلکہ مذہبی معاملات میں حکومت کی عدم مداخلت ہے اور چونکہ ترک ایک مسلمان قوم ہیں اس لیے یہ ان کا قومی فریضہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کی توسیع و ترقی کے لیے کام کریں اور حکومت مسلمانوں کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس کام میں مدد کرے" ماہنامہ سونمیز (Son Mez) استنبول مارچ اپریل ۱۹۷۱ء)

اصلاحات کے حامیوں کو ڈیموکریٹ پارٹی کی بہت سی اصلاحات پہلے ہی گراں گزر رہی تھیں۔ اب آئین میں تبدیلیاں کرنے کے رجحانات نے ان کو چوکنا کر دیا اور ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کو فوج نے جس پر ان عناصر کا غلبہ تھا حکومت کا پختہ پلٹ دیا اور جنرل جمال گرسل کی زیر صدارت فوجی حکومت قائم کر دی۔

فوجی حکومت نے جلال بایار، عدنان مندریس اور ڈیموکریٹ پارٹی کے دوسرے رہنماؤں پر آئین کی خلاف ورزی کے الزام میں نمائشی مقدمہ چلایا اور اس جرم میں پارٹی کے دو رہنماؤں کو ۱۷ستمبر ۱۹۶۱ء کو پھانسی دے دی۔ یہ دو رہنما عدنان مندریس اور وزیر خارجہ زرلو تھے۔ جلال بایار کو بھی موت کی سزا سنائی گئی تھی لیکن عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ سزا عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ ڈیموکریٹ پارٹی بھی توڑ دی گئی اور اس کے ممتاز ارکان پر سیاست میں حصہ لینا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

باب ۱۵

ترکی: فوجی انقلاب کے بعد

حزب عدالت

ترکی میں فوجی انقلاب تو آ گیا لیکن اس کو قائم رکھنا آسان نہ تھا۔ عوام نے فوجی انقلاب کے فوراً بعد بحالی جمہوریت کے لیے کام کرنا شروع کر دیا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بحالی جمہوریت کی اس مہم میں پیپلز پارٹی کے رہنما عصمت انونو نے نمایاں حصہ لیا، عوام کی ان کوششوں کے نتیجے میں ۲۰۔ جولائی ۱۹۶۱ء کو نیا آئین [1] نافذ ہو گیا اور فوج عوام کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے بیرکوں میں واپس چلی گئی۔

ڈیموکریٹک پارٹی توڑ دی گئی تھی اور وہ نئے آئین کے بعد بھی خلاف قانون ہی رہی، لیکن ڈیموکریٹک پارٹی کے اثرات ملک میں بہت گہرے تھے، اس کے رہنماؤں کے ساتھ فوجی حکومت کے ظالمانہ سلوک نے ترک عوام کو بے حد متاثر کیا تھا، چنانچہ جب نیا آئین نافذ ہوا، تو ڈیموکریٹک پارٹی کے حامیوں نے جن میں ترکی فوج کے سابق کمانڈر انچیف راغب گش پالا نمایاں ہیں، حزب عدالت یعنی جسٹس پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی مسٹر پالا ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب کے وقت تیسری فوج کے کمانڈر تھے جو روس کے محاذ پر دفاع کے لیے تیار کی گئی تھی، انقلاب کے بعد مسٹر پالا کو کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ لیکن بعد میں ان کو فوج سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ چنانچہ انھوں نے فوج سے علیحدہ ہونے کے بعد حزب عدالت کی بنیاد ڈالی۔

حزب عدالت نے اکتوبر ۱۹۶۱ء کے انتخابات میں حصہ لیا اور پارلیمنٹ میں تقریباً نصف نشستیں حاصل کر لیں، حزب عدالت کی یہ ایک بڑی کامیابی تھی، کیونکہ ملک میں ابھی تک دہشت پھیلی ہوئی تھی اور ترکی کا صدر وہی شخص تھا جو فوجی انقلاب لایا تھا۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں جب دوسرا

---

(۱) یہ آئین فوجی حکومت کی قائم کردہ دستور ساز اسمبلی نے تیار کیا تھا اور ۹ ۔ جولائی ۱۹۶۱ء کو استصواب کے ذریعہ اس کی توثیق کی گئی جس میں ۶۳ لاکھ ووٹ حق میں اور ۳۹ لاکھ ووٹ مخالفت میں ڈالے گئے۔

انتخاب ہوا تو حزب عدالت واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ ۱۹۶۱ء کے انتخابات ہوئے تو حزب عدالت واضح اکثریت سے کامیاب نہ ہوئی۔ ۱۹۶۱ء کے انتخابات میں عدالت پارٹی نے جمہور خلق پارٹی کی ۱۷۳ نشستوں کے مقابلے میں ۱۵۸ نشستیں حاصل کی تھیں ملی حرکت پارٹی نے ۵۴ نشستیں اور نئی ترکی پارٹی نے ۶۵ نشستیں حاصل کی تھیں۔ اس کے برخلاف ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں خلق پارٹی نے صرف ۱۳۴ نشستیں حاصل کیں جبکہ عدالت پارٹی نے دوسو چالیس نشستیں حاصل کیں۔

بدیع الزمان سعید نورسی

جمہور خلق پارٹی کے مقابلے میں ڈیموکریٹک پارٹی اور پھر عدالت پارٹی کی کامیابی دراصل ان عناصر کی کامیابی تھی جو مذہب سے متعلق خلق پارٹی کی پالیسی کو ناپسند کرتے تھے اور اسلام کو ترکوں کی زندگی میں ایک موثر عامل کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ترکوں کی قبل از اسلام کی تاریخ سے زیادہ ان کی اسلامی دور کی تاریخ کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اسلامی دور کو ترکوں کی تاریخ کا سب سے شاندار دور سمجھتے تھے۔ یہ لوگ دراصل ترکوں کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کرتے تھے لیکن خلق پارٹی کی مذہب دشمن پالیسی اور جابرانہ انداز حکومت کی وجہ سے ۲۷ سال تک بے بس رہے۔ ان عناصر کو کھل کر بولنے کا موقع اس وقت ملا جب ملک میں ایک پارٹی کی حکومت کا نظام ختم ہوگیا اور ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت ملی۔ لیکن ایک پارٹی کے اس طویل دور میں ترکی میں ایک ایسی شخصیت بھی موجود تھی جس نے خلق پارٹی کی مذہب دشمن پالیسی کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ اور بڑے ہی ناسازگار حالات میں اسلام کی ترجمانی کی۔ مخالفوں کے اعتراضات کے جواب دیے اور اسلام کی اہمیت کو واضح کیا۔ یہ بدیع الزمان سعید نورسی کی ذات تھی جنھوں نے عربی سے ترکوں کی محبت کو قائم رکھا۔ اور ترکوں کو نسلی قوم پرستی کی بجائے مسلم قومیت کی طرف آنے کی دعوت دی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ سعید نورسی نے تیس سال تک قید و بند کی زندگی گزاری اور ہر قسم کی ملامتوں اور سازشوں کا جراءت اور ہمت سے مقابلہ کیا لیکن اپنی جدوجہد ترک نہیں کی تو ان کی عظمت اور بڑھ جاتی ہے۔

سعید نورسی مشرقی ترکی کے صوبے تبلیس کے ایک گاؤں نورس میں ۱۸۷۳ء میں پیدا

ہوئے اور اسی نسبت سے ان کو نورسی کہا جاتا ہے۔ بدیع الزمان ان کا خطاب ہے جو ان کی وسعت علمی اور ذہانت کی وجہ سے ان کے مداحوں نے دیا ۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں آئینی انقلاب آیا تو انھوں نے اس کی تائید کی اور اس انقلاب کو اسلامی شکل دینے کی کوشش کی۔ جنگ عظیم کے زمانے میں انھوں نے مشرقی محاذ جنگ پر ایک سپاہی کی حیثیت سے رضا کارانہ خدمات انجام دیں۔ ۱۹۔ فروری ۱۹۱۶ء کو زخمی ہو جانے کے بعد روسیوں نے ان کو گرفتار کرلیا۔ اور روس بھیج دیا جہاں وہ دو سال سے زیادہ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں رہے۔ اس کے بعد سعید نورسی فرار ہو کر ۲۵۔ جون ۱۹۱۸ء کو استنبول پہنچتے ہیں جہاں شیخ الاسلام مصطفیٰ صابری (۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء تا ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء) نے ان کو ایک علمی سرکاری ادارے دارالحکمت اسلامیہ کا رکن مقرر کرلیا۔ استنبول پر اتحادی قبضہ ہو جانے کے بعد جب نئے شیخ الاسلام دری زادہ (۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء تا ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء) نے قومی تحریک اور مصطفیٰ کمال کے خلاف فتویٰ دیا تو سعید نورسی نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد وہ کمال اتاترک کی دعوت پر انقرہ جاتے ہیں اور ۹/ نومبر ۱۹۲۲ء کو مجلس کبیر ملی میں ارکان مجلس کی درخواست پر ترکوں کی کامیابی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ سعید نورسی انقرہ کے غیر اسلامی ماحول سے بددل ہو کر مشرقی ترکی آ کر گوشہ نشین ہو جاتے ہیں اور سیاست سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور دینی درس و تدریس میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں لیکن حکومت اس کے باوجود ان سے خطرہ محسوس کرتی ہے اور ۱۹۲۵ء میں ان کو وسطی ترکی کے صوبے اسپارتا میں جلاوطن کر دیتی ہے۔ جلاوطنی کی یہ مدت ۱۹۶۰ء میں ان کی وفات تک جاری رہی۔ اس دوران میں وہ تقریباً ساڑھے تین سال مختلف اوقات میں تین مرتبہ اسکی شہر، ونیزل اور افیون کی جیلوں میں قید بھی رہے۔ جب وہ جیل سے باہر ہوتے تھے تب بھی ان کی نقل و حرکت پر پابندی ہوتی تھی۔ تیس سال کے دوران میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر ۴۴ مقدمے چلائے گئے اور ان پر خفیہ تحریک چلانے، حکومت کا تختہ پلٹنے، اتاترک کی اصلاحات کی مخالفت کرنے اور تصوف کے سلسلے کو ترکی میں بحال کرنے کے الزامات لگائے گئے لیکن عدالتوں نے دو تین مرتبہ کے علاوہ ہر مرتبہ سعید نورسی کو ان الزامات سے بری قرار دیا۔

سعید نورسی نے جلاوطنی کے زمانے میں اور قید خانوں میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے علاوہ قرآن کی متفرق آیات کی تفسیریں لکھیں۔ یہ تفسیریں ''رسائل نور'' کے نام سے

مشہور ہیں۔ طویل عرصہ تک یہ رسائل نور جن کی تعداد ایک سو تیس ہے اور تقریباً چھ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں خلاف قانون رہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے بعد جب محکمہ امور مذہبی نے یہ فیصلہ دے دیا کہ سعید نورسی کے تمام رسائل کتاب وسنت کے مطابق ہیں اور ان کا مقصد قوم و وطن اور آنے والی نسل کو بے دینی، اخلاقی خرابیوں اور کمیونزم سے بچانا ہے تو جون ۱۹۵۶ء سے رسائل پر سے پابندیاں اٹھالی گئیں۔

۲۵۔ رمضان المبارک مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء/ ۱۳۷۹ھ کو سعید نورسی کا اُرفا کے شہر میں انتقال ہوگیا۔ دو ماہ بعد جب ترکی میں فوجی انقلاب آیا تو فوجی حکومت نے تدفین کے تین ماہ اکیس دن کے بعد یعنی ۱۲۔ جولائی کو سعید نورسی کی لاش ارفا کی قبر سے نکال کر صوبہ اسپارتا میں کسی نامعلوم جگہ منتقل کر دی۔[1] نور طلبہ اور نور رسائل کے خلاف مہم ایک مرتبہ پھر تیز کر دی گئی جو ۱۹۶۵ء میں حزب عدالت کی حکومت قائم ہونے تک جاری رہی۔

اس جگہ یہ کہنا کہ ترکی میں ۱۹۵۰ء کے بعد جو دینی بیداری پیدا ہوئی وہ سب سعید نورسی مرحوم کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ درست نہ ہوگا۔ سعید نورسی بنیادی طور پر قدیم طرز کے علماء میں سے تھے اور انھوں نے اسلام کا کوئی اجتماعی نظام یا فلسفہ پیش نہیں کیا۔ ہاں انھوں نے اسلام کی حقانیت ثابت کی اور ترکوں کے لیے مذہب کی ضرورت اور اہمیت واضح کی۔ ایک ایسے دور میں جب مذہب کے نام پر کام کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ اور جب بڑے بڑے علماء نے ڈر کی وجہ سے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ وہ باطل قوتوں کے سامنے صف آرا رہے۔ انھوں نے درس و تدریس اور تحریروں کے ذریعے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں نوجوانوں کی اخلاقی تربیت کی اور اپنے پیچھے ایک ایسا گروہ چھوڑ گئے جو اسلام کی محبت میں سرشار ہے۔ سعید نورسی کے یہ شاگرد اور عقیدت مند طلبہ نور کہلاتے ہیں۔ ان کی تعداد سعید نورسی کی وفات تک دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ خلق پارٹی کی شکست اور ڈیموکریٹک پارٹی اور پھر عدالت پارٹی کی کامیابی میں ان طلبہ کا بہت بڑا حصہ تھا۔ عصمت انونو کے ذہن پر سعید نورسی اور طلبہ نور کا ہوا بری طرح سوار رہتا تھا اور ان کو سعید نورسی سے اتنی نفرت تھی کہ ایک ترک ادیب احمد کبکلی کے قول کے مطابق وہ سعید نورسی بیزاری

---

(۱) سعید نورسی کے مفصل حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے میری کتاب بدیع الزمان سعید نورسی شائع کردہ ادارہ معارف اسلامی نمبر ۱۶۳ سی بلاک دس فیڈرل بی ایریا کراچی۔

(Said Nursi Phobia) کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس جگہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سیکولرازم کی یہ تعبیر کہ اس کا مطلب مذہب دشمنی نہیں بلکہ مذہبی معاملات میں حکومت کی عدم مداخلت ہے۔ سعید نورسی کا پیش کیا ہوا ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں دے نیزلی کی عدالت میں یہ بات کہی تھی جب کہ عدنان مندریس جو اس خیال کے حامی تھے۔ ۱۹۵۰ء میں برسرِ اقتدار آئے۔

طلبہ نور کی اپنی کوئی تنظیم نہیں ہے۔ وہ انفرادی طور پر اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور نوجوانوں کی اخلاقی تربیت پر توجہ دیتے ہیں۔ سیاسی میدان میں وہ عام طور پر عدالت پارٹی کی حمایت کرتے ہیں۔ روزنامہ ینی آسیا استنبول ان کا سب سے بڑا ترجمان ہے۔ جس کا اپنا دارالاشاعت بھی ہے جہاں سے اب تک مختلف موضوعات پر تقریباً سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

طلبہ نور اشتراکیت اور فری میسن تحریک کے شدت سے مخالف ہیں۔

سلیمان دیمیریل کی وزارت

اکتوبر ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں عدالت پارٹی کی کامیابی کے بعد سلیمان دیمیریل (Demirel) نے حکومت بنائی۔ سلیمان دیمیریل ۱۹۲۴ء میں جنوب مشرق کے صوبے اسپارتا کے گاؤں اسلام کوئے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے استنبول ٹکنکل یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور حکومت کی طرف سے ایک سال کے لیے امریکہ کے محکمہ بحالی اراضی میں مزید مطالعہ کے لیے امریکہ بھیجے گئے۔ وہاں سے واپسی پر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک ترکی میں بجلی کی تحقیقات سے متعلق نظامت سے وابستہ ہو گئے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء تک وہ سیہان بند کے دفتر کے چیف رہے۔ اور ۱۹۵۴ء میں بندوں کی تعمیر کے محکمہ کے سربراہ مقرر کیے گئے۔ جولائی ۱۹۵۴ء میں وہ آئزن ہاور ایکسچینج کے تحت پھر امریکہ گئے اور وہاں بجلی اور آبپاشی سے متعلق سرکاری اور نجی اداروں میں تحقیقی کام کیا۔ وہ پہلے ترک تھے جو آئزن ہاور وظیفہ کے تحت امریکہ گئے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک سلیمان دیمیریل نے ترکی میں آبی وسائل کی نظامت میں ناظم عام یعنی ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک انھوں نے انقرہ میں مشرق وسطیٰ کی ٹکنکل یونیورسٹی میں انجینئرنگ کا درس دیا۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء میں مختصر مدت کے لیے منصوبہ بندی کی

تنظیم میں بھی کام کیا۔ ۱۹۶۲ء سے وہ ایک آزاد انجینئر کے طور پر کام کرنے لگے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے دور حکومت میں ان کی نگرانی میں اس کثرت سے بند تعمیر کیے گئے کہ سلیمان دیمیریل بندوں کے بادشاہ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ ٹیکنکل یونیورسٹی میں ملازمت ہی کے زمانے میں سلیمان دیمیریل نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور ۱۹۶۲ء میں وہ عدالت پارٹی کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اور نومبر ۱۹۶۴ء میں عدالت پارٹی کے صدر منتخب ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء کا انتخاب سلیمان دیمیریل کی صدارت کے زمانہ ہی میں جیتا۔ فروری ۱۹۶۵ء میں مجلس کبیر ملی عدم اعتماد کی تحریک منظور ہو جانے کے بعد جب عصمت انونو مستعفی ہو گئے اور ایک آزاد رکن سینٹ سعاد خیری اُرگپلو نے مخلوط حکومت بنائی تو سلیمان دیمیریل اس میں نائب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں وہ اسپارتا سے ترکی مجلس کبیر ملی کے رکن منتخب ہوئے اور عدالت پارٹی کی کامیابی کے بعد ترکی کے وزیر اعظم ہو گئے۔ سلیمان دیمیریل اس منصب پر ۱۲۔ مارچ ۱۹۷۱ء تک فائز رہے۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں انھوں نے دو مرتبہ اور مخلوط حکومتیں بنائیں لیکن عدالت پارٹی کی واحد حکومت بنانے میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکے ہیں اس کے باوجود وہ اس وقت بھی ترکی کی سب سے ممتاز سیاسی شخصیت ہیں اور اپنی پارٹی کی صدارت کے منصب پر فائز ہیں۔ سلیمان دیمیریل ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک اچھے مسلمان ہیں۔ وہ اپنے محلے کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

سلیمان دیمیریل نے وزیر اعظم بننے کے بعد ایک تقریر میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی حکومت معیشت کے میدان میں نجی کاروبار کو فروغ دے گی۔ سماجی بھلائی کے لیے مناسب اقدامات کرے گی۔ مذہب سے کھل کر تعاون کرے گی، مذہبی اداروں کو مضبوط بنائے گی۔

اتحاد اسلامی

عدالت پارٹی کی حکومت ایک طرح سے فوج کی نگرانی میں تھی۔ جمال گرسل کے بعد ۲۸۔ مارچ ۱۹۶۶ء کو جودت صونائی صدر منتخب کیے گئے۔ لیکن وہ بھی فوج کے نمائندے تھے۔ بہرحال ملک میں کئی سال سیاسی استحکام قائم رہا اور معاشی ترقی کی رفتار تیز رہی۔ اس دور میں خارجہ پالیسی میں بھی تبدیلی ہوئی۔ قبرص سے متعلق امریکہ کی یونان نواز پالیسی کی وجہ سے ترکی

نے امریکہ پر انحصار کرنے کی پالیسی پر نظر ثانی کی اور روس سے قریبی تعلقات قائم کیے۔ چنانچہ فولاد سازی کی صنعت میں روس نے وسیع پیمانہ پر امداد دی۔ علاقائی تعاون برائے ترقی (R.C.D) میں ترکی معاہدہ استنبول کے تحت ۱۹۶۴ء میں رباط کی اسلامی سربراہوں کی کانفرنس میں شرکت کر کے اتحاد اسلامی کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا۔ ترکی کی حکومت اس وقت تک اسلامی بنیاد پر قائم کسی تنظیم میں شرکت کو سیکولرازم کے اصولوں کے خلاف سمجھتی تھی۔ معاہدہ سعدآباد اور علاقائی تعاون برائے ترقی (آر۔سی۔ڈی) کی تنظیم میں ترکی کی شرکت اسلامی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ علاقائی بنیاد پر تھی۔ لیکن رباط کی کانفرنس اسلامی بنیاد پر طلب کی گئی تھی اس لیے ترکی کے سیکولر عناصر اور جمہور خلق پارٹی کے حلقوں میں اس پر سخت تنقیدیں کی گئیں لیکن سلیمان ڈیمیریل نے اس میں نمائندہ بھیج کر جراءت مندانہ قدم اٹھایا اور امور خارجہ میں سیکولرازم کی ایک نئی تعبیر پیش کی کہ سیکولرازم مسلمان ممالک سے دینی بنیاد پر تعاون کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات کے فروغ کے سلسلے میں عدالت پارٹی کی حکومت نے ڈیموکریٹک پارٹی کی پالیسی قائم رکھی۔ ملک میں دینی مدرسوں کا جال بچھا دیا گیا اور امام اور خطیبوں کے لیے تربیتی ادارے قائم کیے گئے۔ عدنان مندریس کے زمانے میں نومبر ۱۹۵۹ء میں استنبول میں دینی مدارس کے لیے مدرس فراہم کرنے کے لیے نومبر ۱۹۵۹ء میں اعلیٰ اسلامی تعلیم کا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں ان انسٹی ٹیوٹوں کی تعداد چار ہو گئی تھی۔ یہ استنبول، قونیہ، ازمیر اور قیصری میں قائم کیے گئے ہیں۔ امام خطیب مدرسوں سے فارغ ہونے والے طلبہ ان انسٹی ٹیوٹوں میں داخل ہوتے ہیں۔ دنیوی تعلیم کے سرکاری مدرسوں کے لیے دینیات اور عربی کے اساتذہ فراہم کرنا بھی ان اداروں کا کام ہے۔

قرآن مجید حفظ کرنے کے مدرسے ان مدرسوں کے علاوہ ہیں۔ ان میں لڑکیاں بھی قرآن حفظ کرتی ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ایک لاکھ ۶۳ ہزار طلبہ اور طالبات قرآن حفظ کر رہے تھے۔

عدالت پارٹی کے دور حکومت میں عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی اہم ترکی کتابوں کو لاطینی رسم الخط میں شائع کرنے کا کام بھی شروع کیا گیا۔ اور اس منصوبے کے تحت ایک ہزار ایک کتابوں کو لاطینی رسم الخط میں منتقل کرنا طے پایا تھا۔ لیکن پچاس ساٹھ کتابوں کی اشاعت کے بعد یہ منصوبہ اس وقت ختم کر دیا گیا جب ڈیمیریل کی حکومت ختم ہو گئی۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء کے انتخابات عدالت پارٹی نے بھاری اکثریت سے جیت لیے تھے۔ عدالت پارٹی نے ۲۵۴ نشستیں حاصل کیں جب کہ جمہور خلق پارٹی نے صرف ۴۴ نشستیں حاصل کیں۔ لیکن ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں طلبہ اور مزدوروں میں بے چینی اور انتہا پسند عناصر کے باہمی تصادم نے ترکی میں امن وامان کا مسئلہ پیدا کر دیا جس کا سہارا لے کر فوج نے ۱۲/ مارچ ۱۹۷۱ء کو سلیمان دیمیریل کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

مخلوط حکومتوں کا دور

مارچ ۱۹۷۱ء سے اکتوبر ۱۹۷۳ء تک ترکی میں فوج کی نگرانی میں دائیں بازو کی کئی حکومتیں قائم ہوئیں جن کی سربراہی نہاد ادام۔ فرید میلن اور نعیم تالو نے کی۔ اس دوران ملک کے کئی صوبوں میں مارشل لا لگا رہا اور بائیں بازو کی سرگرمیوں کو سختی سے دبایا گیا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں جب انتخابات ہوئے تو کسی بھی پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہوسکی۔ خلق پارٹی نے ۱۸۵، عدالت پارٹی نے ۱۴۹ ملی سلامت پارٹی نے ۴۸ اور نوتشکیل یافتہ ڈیموکریٹک[1] پارٹی نے ۴۴ نشستیں حاصل کیں۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۳ء تک جودت صونائی ترکی کے صدر رہے۔ اس کے بعد ''فخری کوروترک'' کو صدر منتخب کیا گیا۔ اگرچہ صدر کوروترک بھی فوجی ہیں لیکن ان کو فوج کے امیدوار کے مقابلے میں منتخب کیا گیا ہے کیونکہ سیاسی لحاظ سے وہ غیر جانبدار شخصیت ہیں جبکہ ان سے پہلے منتخب ہونے والے فوجی صدر سیاسی رجحان رکھتے تھے۔ فخری کوروترک کے صدر ہونے کے بعد حکومت میں فوج کی شرکت ختم ہوگئی اور ۲۵۔ جنوری ۱۹۷۴ء کو خلق پارٹی اور ملی سلامت پارٹی نے مل کر مخلوط حکومت بنائی۔ جس میں خلق پارٹی کے رہنما بلند ایجیوت Bulent Ecevit وزیر اعظم اور ملی سلامت پارٹی کے رہنما نجم الدین ارُبکان نائب وزیر اعظم تھے۔

بُلند ایجیوت

بلند ایجیوت Bulent Ecevit ۲۸۔ مئی ۱۹۲۵ء کو استنبول میں پیدا ہوئے۔ ان کے

---

(۱) یہ عدنان مندریس والی ڈیموکریٹ پارٹی نہیں ہے۔ اس کو فرخ بوزبیلی (Bozbeli) اور ان کے ساتھیوں نے ۱۸/ دسمبر ۱۹۷۰ء کو قائم کیا تھا۔ یہ عدالت پارٹی کے ان ارکان پر مشتمل تھی جو سلیمان دیمیریل سے اختلاف کے بعد عدالت پارٹی سے الگ ہوگئے تھے۔

والد فخری ایجیوت ڈاکٹر تھے اور والدہ نازلی ایجیوت مصور تھیں۔ بلند ایجیوت نے ۱۹۴۴ء میں رابرٹ کالج استنبول سے ادب میں بی۔اے کیا۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک انقرہ یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ محکمۂ نشر و اشاعت میں بھی کام کیا۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک لندن کے ترکی سفارت خانہ میں پریس اتاشی کے ساتھ کام کیا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے آرٹ کی تاریخ کا مطالعہ کیا اور سنسکرت زبان سیکھی۔ ۱۹۵۰ء میں جمہور خلق پارٹی میں شامل ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں ترکی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک انھوں نے عصمت انونو کے تحت مخلوط حکومتوں میں مزدوروں کے وزیر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے اور ۱۹۶۱ء کے لبرل آئین کی تیاری میں حصہ لیا۔ بلند ایجیوت اکتوبر ۱۹۶۶ء میں خلق پارٹی کے سکریٹری جنرل ہو گئے۔

بلند ایجیوت اگرچہ بائیں بازو کے رہنما ہیں لیکن عصمت انونو کے مقابلے میں وہ جمہوریت پسند اور اعتدال پسند رہنما ہیں۔ مذہب سے متعلق بھی ان کا طرز عمل عصمت انونو کے طرز عمل سے مختلف ہے۔ اور وہ مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں جب ۲۱۔ مارچ ۱۹۷۱ء کو سلیمان ڈیمیریل کی حکومت کو فوج نے مستعفی ہونے پر مجبور کیا تو بلند ایجیوت نے اس اقدام کی مخالفت کی اور اسے فوجی انقلاب کے مترادف قرار دیا۔ اس طرح جب خلق پارٹی کے پارلیمانی گروپ نے انونو کی مدد سے نہاد ارم کی حکومت کی تائید کی جنھیں فوج نے مقرر کیا تھا تو بلند ایجیوت نے بطور احتجاج سکریٹری جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ مئی ۱۹۷۲ء میں خلق پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں انونو کو ایجیوت کے مقابلے میں شکست ہوئی اور انونو پارٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ بلند ایجیوت ان کی جگہ خلق پارٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

بلند ایجیوت ایک ایسے سوشلزم کے علمبردار ہیں جس میں کمیونسٹوں کے لیے گنجائش نہیں ہوگی۔ وہ نجی ملکیت کے خلاف نہیں اور صرف بنیادی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے کے حامی ہیں۔ سیاست میں وہ تشدد کے سختی سے خلاف ہیں۔ وہ امریکہ پر ترکی کا انحصار کم کرنا چاہتے ہیں۔ بلند ایجیوت صحافی شاعر اور مصنف ہیں۔ وہ کئی سال خلق پارٹی کے روزنامہ اُلس (ulus) کے ادارتی عملے میں شامل رہے۔ ملت اور دوسرے اخباروں میں سیاسی کالم لکھتے رہے۔ بھگوت گیتا اور جواہر لال نہرو کے خطوط ان کی پسندیدہ کتابیں ہیں۔ وہ ترکی سیاست پر کئی کتابوں

کے مصنف ہیں۔[1]

بلند ایجیوت جب کہ اوپر بتایا جاچکا ہے بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جنوری ۱۹۷۴ء میں انھوں نے جو مخلوط حکومت بنائی اس میں انھوں نے ملی سلامت پارٹی سے تعاون کیا جو ترکی کی سیاسی جماعتوں میں سب سے زیادہ مذہبی جماعت ہے۔ یہ بات خواہ کتنی ہی حیرت انگیز ہو اور عجیب وغریب نظر آئے لیکن اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ بلند ایجیوت کے طرز عمل میں تعصب تنگ نظری اور کٹر پن نہیں ہے۔ بہر حال متضاد عناصر کا یہ تعاون سات آٹھ ماہ سے زیادہ نہیں چلا۔ اس دور میں ایک ایسا اہم واقعہ پیش آیا جو ترکی کے مستقبل پر طویل عرصہ تک اثر انداز ہوتا رہے گا۔ یعنی جزیرہ قبرص میں ترک فوجوں کا داخلہ۔

مسئلہ قبرص

قبرص کا مسئلہ کئی سال سے ترکی کی خارجہ سیاست کا بہت اہم مسئلہ رہا ہے۔ اس جزیرے پر جو ترکی کے جنوبی ساحل سے صرف ساٹھ میل دور ہے اور جس کے باشندوں کی اکثریت یونانی ہے ترکوں نے ۱۵۷۱ء میں قبضہ کیا تھا یہ قبضہ ۱۸۷۸ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد بعض سیاسی مصلحتوں کے تحت اس کا انتظام برطانیہ کے سپرد کردیا گیا تھا۔ لیکن بالادستی بدستور عثمانی سلطنت کی قائم رہی۔ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالمی جنگ چھڑی تو برطانیہ نے جزیرہ پر مستقل قبضہ کرلیا انیسویں صدی میں قبرص میں ترک مسلمانوں کی تعداد چالیس فیصد تھی لیکن برطانوی دور میں یہ تعداد گھٹتی گئی اور اب صرف بیس فیصد رہ گئی ہے۔ یونانی باشندے جزیرے کا الحاق یونان سے کرنا چاہتے ہیں جب کہ جزیرہ کے ترک باشندے اس الحاق کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قبرص تاریخ کے کسی دور میں بھی یونان کے تحت نہیں رہا۔ جب کہ وہ صدیوں تک ترکی کا ایک حصہ رہا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی۔ ترکوں اور یونانیوں کی قدیم دشمنی کے پیش نظر

---

(۱) تصانیف کے نام یہ ہیں۔

i_(Ecevit Diyorki) (ایجیوت کہتا ہے) ii_Ortanin Solu(مرکز کے بائیں طرف)

iii_(Bu Duzen Degismenli Dir)(اس نظام کو بدلنا چاہیے)

iv_Ataturdve Devrim Cilik(اتاترک اور انقلابیت) v_Dis Politiks(سیاست خارجہ)

یہ کتابیں بالعموم تقریروں اور بیانوں کے مجموعے ہیں۔

جزیرہ کے ترک باشندوں کو یہ خطرہ بھی ہے کہ اگر جزیرہ کا یونان سے الحاق ہو گیا تو یونانی ان کو ختم کر دیں گے۔ ترکی کو بھی یہ خطرہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تو قبرص کے مسلمانوں کو ترکی میں پناہ حاصل کرنی پڑے گی۔ اور اس کے لیے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے قبرصی ترکوں نے یہ تجویز پیش کی کہ چونکہ ترک اور یونانی الگ الگ قومیں ہیں اس لیے جزیرہ کو ترک اور یونانی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح ترکوں کا تحفظ بھی ہو جائے گا اور اگر یونانی اپنے حصہ کا یونان سے الحاق کریں گے تو ترک بھی ترکی کے ساتھ الحاق کرنے میں آزاد ہوں گے۔ اس مسئلہ پر ترکوں اور یونانیوں میں ۱۹۵۵ء سے تصادم ہوتے چلے آرہے ہیں۔ خاص طور پر جب برطانیہ نے جزیرہ کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا تو جزیرہ کی تقسیم کے مسئلے نے ایک نئی اہمیت اختیار کر لی۔ آخر کار ترکی، یونان برطانیہ اور اہل قبرص کے درمیان طویل مذاکرات کے بعد ۱۹۔ فروری ۱۹۵۹ء کو ایک نیا حل ڈھونڈ لیا گیا۔ یونان سے الحاق اور قبرص کی تقسیم کی تجویزوں کو رد کر دیا گیا اور قبرص کو آزاد مملکت قرار دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ معاہدے پر ترکی، یونان اور برطانیہ کے علاوہ قبرص کے یونانی اور ترک نمائندوں نے بھی دستخط کیے۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں ترکی اور یونان دونوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ جزیرے کے معاملات میں مداخلت کر سکتے ہیں۔

۱۶۔ اگست ۱۹۶۰ء کو قبرص نے برطانیہ سے آزادی حاصل کر لی اور قبرص میں ایک نئے وفاقی طرز کی حکومت قائم کر دی گئی۔ معاہدے کے تحت مجلس قانون ساز میں ترکوں کو تیس فیصد نشستیں دی گئیں اور نائب صدر کے لیے ترک ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ لیکن آزادی کے بعد یونانیوں نے جلد ہی معاہدے کی خلاف ورزی شروع کر دی اور ترکوں پر حملے شروع کر دیے جن میں بے شمار ترک ہلاک اور ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ صورت حال یہاں تک بگڑ گئی کہ ترکوں کے جان و مال کے تحفظ کے لیے ترکی کو مداخلت کرنی پڑی اور اگست ۱۹۶۴ء میں یونانی حملہ آوروں کو منتشر کرنے کے لیے فضائی حملہ کرنا پڑا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے دستے جزیرہ میں تعینات کر دیے گئے۔

اس انتظام کے بعد جزیرے کے ترک باشندوں کو بظاہر تحفظ تو مل گیا لیکن یونان سے الحاق کے حامی عناصر اپنی سازشوں میں مصروف رہے یہاں تک کہ انھوں نے جولائی ۱۹۷۴ء میں صدر میکاریوس کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور ترک باشندوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ یہ بات

معاہدے کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ چنانچہ ترکی کو جزیرہ میں پھر مداخلت کرنی پڑی۔ بلند ایجیوت کے حکم پر جو اس وقت مخلوط حکومت میں وزیر اعظم تھے، پہلی فضائی کاروائی کے ٹھیک دس سال بعد اگست ۱۹۷۴ء میں ترک فوجیں مسلمانوں کو بچانے کے لیے جزیرے میں اتار دی گئیں۔ ان فوجوں نے جزیرہ کے شمال مشرقی حصے پر جو کل جزیرے کے چالیس فیصد رقبے پر مشتمل ہے اور جہاں ترکوں کی بستیاں اور زمینیں ہیں قبضہ کر لیا۔ دارالحکومت کا ایک حصہ بھی ترکی کے پاس ہے۔ قبرصی ترکوں نے جن کے رہنما روف ونکتاش (Denktash) ہیں یہاں اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی ہے۔ جس کی ایک اسمبلی بھی ہے۔ ترکی کا موقف یہ ہے کہ اگر جزیرہ کو متحدہ رکھنا ہے تو یہ ایک ایسی مکمل وفاقی حکومت ہی کی شکل میں ممکن ہے جس میں ترک اکثریت کے علاقے میں ایک خود مختار حکومت اور خود مختار اسمبلی ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو قبرص میں مسلمان زندہ نہیں رہ سکیں گے اور یہ صورت حال ترکی کی سلامتی کے لیے خطرہ ہوسکتی ہے۔ قبرص کی ترک حکومت نے فاماگستا کو جسے ترک مگوسہ کہتے ہیں اور جہاں نامق کمال نے جلاوطنی کے کئی سال گزارے تھے چنگی سے آزاد بندرگاہ قرار دے دیا گیا ہے۔ مگوسہ اور ترکی کی بندرگاہ مرسین کے درمیان باقاعدہ جہاز رانی کی سروس قائم ہے۔

قبرص میں بلند ایجیوت کے دلیرانہ اقدام نے ان کو بہت مقبول بنا دیا۔ وہ ترکی کے ہیرو بن گئے۔ عوام نے ان کو فاتح قبرص اور دوسرا اتاترک قرار دیا۔ لیکن یہی مسئلہ مخلوط حکومت کی شکست کا باعث بنا۔ ایجیوت جہاں قبرص میں وفاقی طرز کی حکومت کے حامی ہیں وہاں ملی سلامت پارٹی قبرص کی تقسیم اور ترک حصہ کا ترکی سے الحاق چاہتی ہے۔ اس مسئلہ پر اختلاف اس حد تک بڑھا۔ کہ ۱۸/ ستمبر ۱۹۷۴ء کو بلند ایجیوت مستعفی ہو گئے۔

ملی سلامت پارٹی اور نجم الدین اربکان

اکتوبر ۱۹۷۳ء کے انتخابات اس لحاظ سے بہت اہم تھے کہ اس کے نتیجے میں نجم الدین اربکان کی قیادت میں ایک نئی سیاسی جماعت ملی سلامت پارٹی ترکی کی سیاست میں ابھری نجم الدین اربکان جو پیشہ کے لحاظ سے سلیمان ڈیمیریل کی طرح ایک انجینئر ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں بحیرہ اسود کے ساحلی شہر سنوپ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد صبری اربکان محکمہ فوجداری میں ملازم

تھے۔نجم الدین نے ابتدائی تعلیم قیصری اور ترابزون کے مدرسوں میں اور ثانوی تعلیم استنبول میں حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں استنبول کی ٹیکنیکل یونیورسٹی کے شعبہ مشین سے سند حاصل کی اور اسی سال اسی شعبہ کے نائب صدر مقرر ہو گئے۔انھوں نے ۱۹۵۱ء میں موٹروں سے متعلق تحقیقی مقالہ لکھا۔جس کے بعد ان کو یونیورسٹی کی طرف سے جرمنی بھیج دیا گیا۔ جرمنی میں انھوں نے بمقام آ کن (Aachen) اعلیٰ انجینئرنگ کے مدرسہ سے ڈاکٹر کی سند حاصل کی۔اس کے بعد انھوں نے موٹر سازی کے مشہور کارخانے (klocknek humbolt deutz) میں کام کر کے تحقیقی مقالہ لکھا۔نجم الدین اربکان ۱۹۵۳ء میں استنبول ٹیکنیکل یونیورسٹی کے شعبہ موٹر سازی میں نائب پروفیسر اور ۱۹۶۵ء میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

استنبول میں ڈیزل انجن تیار کرنے کے کارخانہ کی تکمیل میں نجم الدین اربکان کا نمایاں حصہ ہے۔ یہ کارخانہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان مکمل ہوا اور اس کی تکمیل کے بعد کر کارخانہ اپنی تیار کردہ موٹر انجنوں کی منڈی میں لانے کے قابل ہو گیا۔نجم الدین اس کارخانے میں جو پہلے گمش موٹر فیکٹری کہلاتا تھا اور اب پنجر موٹر فیکٹری کہلاتا ہے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۳ء تک جنرل منیجر رہے۔ ۱۹۶۶ء میں نجم الدین ترکی کے ایوان ہائے صنعت وتجارت کے جنرل سکریٹری ہوئے اور ۱۹۶۹ء میں صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۶۹ء سے نجم الدین اربکان نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ اس سال قونیہ سے مجلس کبریٰ کے آزاد رکن منتخب ہوئے۔ ۲۶۔ جنوری ۱۹۷۰ء کو انھوں نے ملی نظام پارٹی قائم کی۔ یہ پارٹی واضح دینی رجحان رکھنے کی وجہ سے ۲۰۔ مئی ۱۹۷۱ء کو خلاف آئین قرار دے دی گئی۔ الزام یہ تھا کہ پارٹی کے سالانہ اجتماع میں مقررین نے خلافت اور شریعت کے موضوع پر بہت زیادہ زور دیا۔اس کے بعد نجم الدین اربکان نے ۱۹۷۳ء کے اوائل میں ''ملی سلامت پارٹی'' کے نام سے دوسری جماعت قائم کی اور اکتوبر میں اس کے صدر منتخب ہوئے۔اس بار ان کی قیادت میں ملی سلامت پارٹی ترکی کی قومی اسمبلی کی ۴۸ نشستیں حاصل کر کے تیسری بڑی پارلیمانی پارٹی بن گئی۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں جب خلق پارٹی اور ملی سلامت پارٹی نے حکومت بنائی تو نجم الدین اربکان اس میں نائب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ لیکن ستمبر ۱۹۷۴ء میں یہ مخلوط حکومت ختم ہوگئی۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں جب سلیمان ڈیمیریل نے نئی مخلوط حکومت بنائی تو نجم الدین اربکان اس میں

بھی نائب وزیر اعظم مقرر ہوئے اور جون ۱۹۷۷ء کے انتخابات تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔

نجم الدین اربکان جو دو بچوں کے باپ ہیں علمی حیثیت سے بھی بلند پایہ رکھتے ہیں۔ جرمن زبان جانتے ہیں اور جرمن اور ترکی میں بکثرت علمی اور فنی کتابوں کے مصنف ہیں۔ سیاسی موضوع پر ان کی دو کتابیں اہم ہیں۔ ایک ترکی کے تیسرے پنج سالہ منصوبہ پر تنقید اور دوسری ملی گورش (milligorus) یعنی قومی نقطہ نظر۔

۱۹۵۰ء میں ترکی میں ڈیموکریٹک پارٹی کے دور اقتدار میں جمہوریت یقیناً بحال ہوئی اور مذہبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا لیکن اس پارٹی کے رہنما واضح اسلامی شعور نہیں رکھتے تھے۔ عدالت پارٹی نے ڈیموکریٹک پارٹی ہی کی حکمت عملیوں کو آگے بڑھایا اور ریاست اور مذہب کے تعلق کو زیادہ اچھی طرح واضح کیا لیکن صحیح اسلامی فکر کی کمی یا سیکولرازم کی آئینی دفعہ سے مجبور ہو کر عدالت پارٹی بھی اس معاملے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں لا سکی۔ نجم الدین اربکان اور ان کی ملی سلامت پارٹی ان دونوں پچھلی پارٹیوں کے مقابلے میں زیادہ واضح اسلامی شعور رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ملی سلامت پارٹی نے خلق پارٹی کے ساتھ مل کر جو سیکولرازم کی سب سے بڑی علمبردار مخلوط حکومت بنائی تو دنیا کو تعجب ہوا اور ترکی میں اس فیصلہ پر دونوں طرف سے تنقید بھی ہوئی۔ بہرحال یہ مخلوط حکومت چند ماہ سے زیادہ نہیں چل سکی اور ملی سلامت پارٹی نے عدالت پارٹی کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا جو نظریاتی طور پر اس سے قریب تر تھی۔ اس مخلوط حکومت میں دائیں بازو کی دو اور جماعتیں بھی شامل تھیں یعنی ملی حرکت پارٹی[1] (national action party) اور جمہوریت پسند اعتماد[2] پارٹی جس کو ترکی میں (demoeration reliance party)(cumhuriyetei guven partlsi) یا مخفف طور پر (C.G.P) کہا جاتا ہے۔ نجم الدین اربکان اس حکومت میں بھی نائب وزیر اعظم رہے۔

(۱) ملی حرکت پارٹی جسے ترکی میں "ملیت جی حرکت پارٹی سی" کہتے ہیں ۳۰۔ جولائی ۱۹۶۵ء کو قائم ہوئی۔ اس کے رہنما الپ اسلان ترکیش ہیں جنھوں نے اپنے نو نکاتی نقطہ نظر کو دو کتابوں (Dokus Isik) یعنی نو روشنی اور (Temelgo Usler) یعنی بنیادی انداز فکر میں پیش کیا۔

(۲) جمہوریت پسند اعتماد پارٹی ۳۔ مارچ ۱۹۶۷ء میں قائم ہوئی۔ یہ جمہوریت ملی خلق پارٹی سے نکلنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ نورخاں فیضی اور غلو اس کے صدر ہیں۔

اسلامی کانفرنس میں شرکت

مخلوط حکومت کے اس دور کا جب سلیمان دیمیریل وزیراعظم اور نجم الدین اربکان نائب وزیراعظم تھے سب سے اہم کارنامہ استنبول میں مئی ۱۹۷۶ء میں اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس کا انعقاد ہے۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے کسی بھی ایسی کانفرنس میں جو اسلام یا مسلمانوں کے نام پر بلائی گئی ہو ترکی کی حکومت شرکت کرنے کی جراءت نہیں کرسکتی تھی، کیونکہ ایسا کرنا سیکولرزام کے اصولوں کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں عدالت پارٹی کی پہلی حکومت نے رباط میں ہونے والی اسلامی سربراہوں کی کانفرنس میں پہلی مرتبہ اپنا مندوب بھیجا تھا تو ترکی کے سیکولر عناصر نے اس اقدام پر بڑی سخت تنقید کی تھی۔ بہرحال یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں ہونے والی مسلمان سربراہوں کی دوسری کانفرنس میں بھی ترکی مندوب نے شرکت کی۔ لیکن اس سلسلے میں ترکی نے انقلابی قدم ۱۹۷۶ء میں اس وقت اٹھایا جب اسلامی وزرائے خارجہ کا اجلاس استنبول میں طلب کیا اور ۱۱۔ مئی ۱۹۷۶ء کو خود وزیراعظم دیمیریل نے کانفرنس کا افتتاح کیا اس موقع پر ترکی نے اسلامی کانفرنس کے منشور پر دستخط کیے اور کانفرنس کا باضابطہ رکن بن کر نہ صرف اسلامی برادری میں شامل ہونے کا سرکاری اعلان کیا بلکہ کانفرنس کی کاروائیوں میں سرگرمیوں سے حصہ لیا۔

اس موقع پر ترکی میں بڑے جوش وخروش کا اظہار کیا گیا۔ ترکی کے اخباروں نے لکھا کہ استنبول ایک بار پھر اسلام کا قلب بن رہا ہے۔ نائب وزیراعظم نجم الدین اربکان نے ۱۴۔ مئی کو توپ کاپی کے تاریخی محل میں اسلامی کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں جب عشائیہ دیا تو ملی سلامت پارٹی کے ہزار ہا ارکان محل کے سامنے اسلام زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام کے حق میں اس طرح کھلے عام مظاہرہ کیا گیا۔ نجم الدین اربکان نے اپنی تقریر میں کشمیر اور ترکستان سمیت اسلامی دنیا کے تمام مسائل میں مسلمانوں کے موقف کی تائید کی اور فلسطینی عربوں کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ بیت المقدس ایک اسلامی شہر ہے۔ اور ان شاء اللہ ایک دن حملہ آوروں سے واپس لے لیا جائے گا۔[1] جون

---

(۱) ثروت صولت: بدیع الزمان سعید نورسی ص ۲۰۸، کراچی ۱۹۷۷ء

۱۹۷۷ء میں دوسری بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا استنبول میں انعقاد ترکی کے اس بدلتے ہوئے رجحان[1] کی عکاسی ہے۔ اس کانفرنس میں بھی نجم الدین نے مندوبین کا خیر مقدم کیا۔

عدالت پارٹی اور ملی سلامت پارٹی کی حکومت کے ان دو سالوں میں ترکی عربوں کے بھی بہت قریب آ گیا اور ۱۹۷۶ء میں لیبیا سے باہمی ترقی کے لیے بڑے مفید معاہدے کیے گئے۔ ۱۲۔ مارچ ۱۹۷۷ء کو معاہدہ ازمیر پر دستخط کیے گئے جس کا مقصد علاقائی تعاون برائے ترقی کے ادارے (R-C-D) کو اور زیادہ موثر بنانا تھا۔ ترکی کے اسلامی دنیا سے قریب آنے کی اگرچہ ایک وجہ نظریاتی انقلاب بھی ہے لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قبرص کے مسئلہ پر مغربی دنیا کے معاندانہ طرز عمل نے ترکوں کو مغرب سے مایوس کر دیا ہے اور ان کو پہلی مرتبہ احساس ہوا ہے کہ ترکی کے حقیقی اور مخلص دوست صرف مسلمان ہو سکتے ہیں۔ اسلام سے قریب آنے کی دوسری بڑی وجہ اشتراکیت کا بڑھتا ہوا خطرہ بھی ہے۔ جس کا مقابلہ اسلام کو تقویت دے کر کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے میں فوجی افسروں کا طرز عمل بھی بدل گیا ہے اور اب یہ افسر ۱۹۶۱ء کی طرح مذہبی رجحانات کے مخالف نہیں رہے بلکہ اشتراکیت کے مقابلے کے لیے مذہب کو تقویت دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء کے وسط میں فوجیوں کے لیے چیف آف دی اسٹاف کے حکم کے تحت دینی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری صالح قزاز نے اس فیصلہ پر صدر اور وزیر اعظم دونوں کو مبارک باد دی۔

نجم الدین اربکان نے اپنی کتاب ''قومی نقطہ نظر'' میں اپنے نقطہ نظر کا بڑا جراءت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ اور وہ قیام جمہوریت کے بعد پہلے وزیر ہیں جنھوں نے اپنی کتاب میں قرآن و حدیث کے حوالے دیے ہیں۔ سیکولرزام پر تنقید کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ترک ملت اسلامی کا ایک حصہ ہیں۔ انھوں نے دینی اور اخلاقی تربیت پر زور دینے کے علاوہ مادہ پرستانہ نظریات اور کمیونزم کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور ترکوں کو غیر اسلامی افکار سے نجات دلانے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ وہ یورپی منڈی میں ترکی کی شرکت کے خلاف ہیں۔ اور اسلامی دنیا کی

---

(۱) یکم جولائی تا ۵۔ جولائی ۱۹۷۷ء استنبول میں طلبہ تنظیموں کے بین الاقوامی اسلامی وفاق کا چوتھا اجتماع ہوا جس میں ۳۵ ملکوں کے ۸۵ مندوبین نے شرکت کی۔

علیحدہ مشترکہ منڈی کے قیام سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے ترکی کو سودی نظام سے نجات دلانے کا عزم بھی ظاہر کیا ہے۔ وہ اشتراکی سامراج کی طرح مغربی سامراج کے بھی شدت سے مخالف ہیں۔ اور عربوں کے موقف کے پرزور حامی ہیں۔

ترکی میں احیائے اسلام کی ان تمام کوششوں کے باوجود یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ترکی میں اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا ہے۔ ترکی میں غیر اسلامی فکر رکھنے والی قوتیں اب بھی بہت مضبوط ہیں اور ان کی بنائی ہوئی سیکولر آئین کی تلوار اب بھی سروں پر لٹک رہی ہے اور ترکی میں اسلامی انقلاب کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے ہر قدم جو سیاسی اور معاشی میدانوں میں اسلام کے مطابق تبدیلیاں لانے کے لیے اٹھایا جاتا ہے اس پر سیکولر حلقے شور مچانے لگتے ہیں اور اُسے آئین کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں۔ مولانا مودودی اور سید قطب وغیرہ کی ایسی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کرنے پر اب بھی مقدمے قائم کردیے جاتے ہیں جن میں دینی بنیاد پر سیاسی تبدیلی لانے پر زور دیا گیا ہے۔

اس وقت ترکی میں اسلام پسند عناصر آئین میں بنیادی تبدیلیوں کے لیے کوشش کررہے ہیں۔ اپریل ۱۹۶۸ء کے اوائل میں بروصہ میں مختلف تنظیموں نے ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کی جس میں اتاترک کی اصلاحات اور ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب پر تنقید کی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ نہ صرف اسکولوں ادب اور آرٹ کو بلکہ تھیٹر اور سنیما کو بھی اسلام کے رنگ میں رنگا جائے۔ انھوں نے قدیم (قبل از اسلام) ترکی زبان کے احیاء کی مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ ترکی کی لسانی انجمن کو توڑ دیا جائے۔ اس انجمن کا مقصد ترکی زبان سے عربی فارسی الفاظ نکالنا ہے۔ کانفرنس میں اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ طلبہ میں بھی اسلامی رجحان کافی قوی ہے۔ طلبہ اسلامی نظام تعلیم کے نفاذ کے علاوہ ہر سال استنبول کا یوم فتح منانے کے موقع پر ایا صوفیہ کو پھر سے مسجد میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات

ترکی میں ۱۹۷۷ء کے انتخابات اکتوبر کی بجائے جون میں منعقد ہوئے۔ انتخابات کو قبل از وقت کرانے کے فیصلے کی ملی سلامت پارٹی نے سخت مخالفت کی تھی اور اس کو نجم الدین اربکان نے ملی سلامت پارٹی کے خلاف ایک سازش قرار دیا تھا۔ انتخابات کے دوران دوسری بڑی جماعتوں

نے بھی اسلام کے نام کو استعمال کیا۔ حتیٰ کہ خلق پارٹی نے بھی علماء کے طبقہ سے امیدوار کھڑے کیے۔ سلیمان ڈیمیریل نے کہا کہ عدالت پارٹی کو اقتدار میں لاکر ہی ان عناصر کے خلاف سخت کاروائی کی جاسکتی ہے جو ہماری روحانی اور تاریخی اقدار اور ہمارے مذہب اور وجود کے دشمن ہیں۔ انتخابات کے نتائج اس مرتبہ بھی ۱۹۷۳ء کی طرح غیر فیصلہ کن رہے اور کسی بھی جماعت کو قطعی اکثریت حاصل نہ ہوسکی۔ خلق پارٹی نے ۲۱۳، عدالت پارٹی نے ۱۸۹ ملی سلامت نے ۲۴ اور ملی حرکت نے ۱۶ نشستیں حاصل کیں۔ سب سے بڑا نقصان ڈیموکریٹک پارٹی کو ہوا جس کا صرف ایک امیدوار کامیاب ہوا جب کہ ۱۹۷۳ء کے انتخابات میں اس کے نمائندوں کی تعداد ۴۵ تھی۔ دوسرا بڑا نقصان ملی سلامت کو ہوا جس کے نمائندے ۱۹۷۳ء کے مقابلے میں آدھے رہ گئے۔ جمہوریت اعتماد پارٹی کے نمائندے بھی تیرہ سے گھٹ کر تین رہ گئے۔ سب سے زیادہ فائدہ عدالت پارٹی کو ہوا جس کے نمائندوں کی تعداد ۱۴۹ سے بڑھ کر ۱۸۹ ہوگئی۔ اس کے بعد خلق پارٹی کو فائدہ ہوا جس کے نمائندوں کی تعداد ۱۸۵ سے بڑھ کر ۲۱۳ ہوگئی۔ کسی ایک پارٹی کی اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے صرف مخلوط حکومت ہی بن سکتی تھی۔ سب سے پہلے صدر نے بلند ایجیوت سے حکومت بنانے کے لیے کہا جو سب سے بڑی پارٹی کے رہنما تھے لیکن ان کی حکومت پارلیمنٹ کے پہلے ہی اجلاس میں ٹوٹ گئی۔ اور اعتماد کا ووٹ حاصل نہ کرسکی۔ ۲۱۔ جولائی کو سلیمان ڈیمیریل نے عدالت پارٹی' ملی سلامت پارٹی اور ملی حرکت پارٹی کی مخلوط حکومت بنائی جس کو ۴½ سو کے ایوان میں ۲۲۹ ممبروں کی حمایت حاصل تھی۔ نجم الدین اربکان اور حکومت پارٹی کے ارسلان ترکیش نائب وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اکیس افراد پر مشتمل کابینہ میں سولہ عدالت پارٹی کے سات ملی سلامت پارٹی کے اور پانچ حرکت پارٹی کے وزیر تھے۔ ان پارٹیوں نے جس مشترکہ پروگرام پر اتفاق کیا تھا۔ اس کے خاص خاص پہلو یہ تھے۔

۱۔ آزاد جمہوری نظام کی حمایت اور فسطائیت اور کمیونزم کی مخالفت کی جائے گی۔

۲۔ خارجی نظریات اور مادہ پرستانہ نظریات سے معاشرہ کو بچایا جائے گا۔

۳۔ قانون تعزیرات کی دفعہ ۱۶۳ پر نظرثانی کی جائے گی تاکہ لوگوں کو مذہب پر آزادانہ طریقہ پر عمل کرنے کا موقع ملے۔ (اس دفعہ کی تنگ نظری سے تعبیر وتشریح کرکے مخالف مذہب عناصر اس کو مذہبی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے ایک آلہ کے طور

پر استعمال کرتے رہے ہیں۔

۴۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو اس طرح استعمال کیا جائے گا کہ عوام کی قومی اخلاقی اور روحانی اقدار کو نقصان نہ پہنچے۔

۵۔ تعلیم کو بیرونی نظریات اور تقلیدی رجحانات سے پاک کیا جائے گا۔

۶۔ امام، خطیب، مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو یونیورسٹیوں میں داخلے کے یکساں مواقع دیے جائیں گے اور ابتدائی مدرسوں میں ان کو مذہب اور اخلاق کی تعلیم کے لیے ملازمت دی جائے گی۔

۷۔ اعلیٰ اسلامی تعلیم کے انسٹی ٹیوٹوں کو سائنس اکادی میں تبدیل کیا جائے گا۔

۸۔ سود سے آزاد قرضوں کا نظام قائم کیا جائے گا۔

مشترکہ پروگرام میں بھاری صنعتوں کے فروغ، افراط زر کی روک تھام دفاعی اسلحہ میں ترکی کو خود مکتفی بنانے اور قبرص کے ترکوں کے حقوق اور سلامتی کے تحفظ کے عزم کا بھی اظہار کیا گیا تھا۔[1] یہ پروگرام نظریاتی طور پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور ترکی میں اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن عدالت پارٹی کی یہ مخلوط حکومت صرف پانچ ماہ قائم رہ سکی۔ عدالت پارٹی کے دس ارکان پارلیمان اقلیتی پارٹیوں کو تناسب سے زیادہ وزارتیں دینے پر عدالت پارٹی سے نکل گئے۔ جس کی وجہ سے مخلوط حکومت کے خلاف خلق پارٹی کی تحریک عدم اعتماد کامیاب ہوگئی اور جنوری ۱۹۷۸ء میں مخلوط حکومت ٹوٹ گئی۔ اور بلند ایجیوت ایک بار پھر ترکی کے وزیر اعظم ہوگئے۔

بلند ایجیوت کے اس دور حکومت کا جو بائیس ماہ رہا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ترکی نے ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹ء کو تنظیم آزادی فلسطین کو تسلیم کرلیا اور انقرہ میں اس تنظیم کا دفتر کھل گیا۔ اس زمانے میں ترکی تجارت کے عدم توازن اور زرمبادلہ کی کمی کی وجہ سے معاشی بحران کا شکار رہا اور حکومت کو کئی مرتبہ سکے کی قیمت گرانی پڑی۔ علاوہ ازیں گرانی میں مسلسل اضافہ ہوا اور ملک میں دہشت انگیزی پورے عروج پر پہنچ گئی اور بائیس ماہ کی مدت میں دو ہزار اشخاص دہشت گردی میں

---

(۱) یی آسیا۔

ہلاک ہوئے۔ بدامنی اور معاشی بدحالی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو جب ترکی میں درمیانی مدت[1] کے انتخابات ہوئے تو ترکی سینٹ کی پچاس نشستوں میں سے ۳۳ نشستوں پر عدالت پارٹی کے نمائندے کامیاب ہوگئے۔ ان کے علاوہ ایوان نمائندگان کی ان پانچ نشستوں پر بھی عدالت پارٹی کے پانچوں امیدوار کامیاب ہوگئے جو ارکان پارلیمنٹ کی موت کی وجہ سے خالی ہوگئی تھیں۔ ہوا کے اس رخ کو دیکھ کر بلند ایجیوت مستعفی ہوگئے اور ۱۴۔ نومبر ۱۹۷۹ء کو سلیمان دیمیریل نے ایک بار پھر حکومت بنالی۔ ملی سلامت پارٹی اور ملی حرکت پارٹی نے اس مرتبہ حکومت میں شرکت نہیں کی لیکن یہ دونوں پارٹیاں عدالت پارٹی کی حکومت کی حمایت کررہی ہیں۔

اس وقت سلیمان دیمیریل دہشت انگیزوں کے خلاف سخت کاروائیاں کررہے ہیں۔ ملازمین کی تطہیر کی مہم چلا رکھی ہے جس کے تحت صوبوں کے تمام گورنر بدل دیئے گئے ہیں اور محکمہ تعلیم میں وسیع پیمانہ پر تطہیر کی گئی ہے۔

خارجہ پالیسی کے معاملے میں ترکی مغربی ملکوں کی طرف مائل ہے۔ اس کی بڑی وجہ وہ خطرے ہیں جو روس کی طرف سے ترکی کو لاحق رہتے ہیں اور جن کا پیچھے تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ چنانچہ جس طرح پاکستان اپنے پڑوسی بھارت کے جارحانہ عزائم کی وجہ سے امریکہ کی فوجی امداد حاصل کرنے کے لیے مجبور ہوا تھا۔ تقریباً ان ہی نوعیت کے اسباب کی وجہ سے ترکی امریکی فوجی امداد حاصل کرنے پر اور امریکہ کو فوجی اڈے دینے پر مجبور ہوا۔ ترکی اس وقت میثاق مرکزی (سنٹو) اور معاہدہ شمالی اوقیانوس کا رکن ہے۔ اس کے علاوہ ترکی کونسل آف یورپ کا رکن بھی ہے۔

حزب عدالت کے برسراقتدار آنے کے بعد سے ترکی نسبتاً زیادہ آزاد خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ چنانچہ اب روس سے بھی ترکی کے قریبی تعلقات قائم ہوگئے ہیں۔ اور ترکی میں فولاد سازی کی صنعت میں روس وسیع پیمانے پر امداد دے رہا ہے۔ عربوں اور اسلامی ملکوں سے بھی ترکی اب زیادہ قریبی تعلقات قائم کررہا ہے۔ جس کا تذکرہ پیچھے کیا جاچکا ہے۔

معیشت

معاشی، صنعتی اور تعلیمی لحاظ سے ترکی اسلامی دنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک ہے زرعی اور

---

(۱) ترکی سینٹ کے ایک تہائی ارکان ہر دو سال بعد مستعفی ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ارکان کا انتخاب ہوتا ہے۔

معدنی وسائل کی کثرت ہے۔ ملک کی دو تہائی آبادی زراعت پیشہ ہے اور برآمد کا ساٹھ ستر فیصد حصہ زرعی اشیاء پر مشتمل ہے۔ زمین زرخیز ہے صرف اٹھارہ فیصد زمین ایسی ہے جس پر کاشت نہیں ہو سکتی باقی زمین یا تو زیر کاشت ہے یا قابل کاشت بنائی جا سکتی ہے۔ ساحلی علاقوں میں بارش کی کثرت اور اندرونی علاقوں میں برف باری کی وجہ سے پانی کی کمی نہیں۔ ان دریاؤں کے پانی کو آبپاشی اور بجلی پیدا کرنے کے کام میں لانے کے لیے بکثرت بند تعمیر کیے گئے ہیں اور تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ دریائے سقاریہ پر سریار بند، ادانہ کے پاس سبحان بند، انقرہ کے جنوب مشرق میں دریائے قزل ارماق پر حرفافلی بند اور دریائے فرات پر کیبان بند ترکی کے بڑے بندوں میں سے ہیں۔ کیبان بند جو ۱۹۷۳ء میں مکمل ہوا ہے سب سے بڑا بند ہے اور پاکستان کے منگلا بند کے برابر ہے۔ اس میں بارہ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا ہونے کی صلاحیت ہے۔

گیہوں، جو، چاول، مکئی، تمباکو، روئی، چاء، زیتون، افیون، چقندر اور مختلف پھل خصوصاً سیب، انجیر، آڑو، خوبانی، ناشپاتی، نرنگی اور کیلے بڑی زرعی پیداوار ہیں۔ گیہوں، تمباکو، روئی، افیون کا روغنی تخم اور پھل برآمد کیے جاتے ہیں۔ ترکی کی تمباکو دنیا کی بہترین تمباکو سمجھی جاتی ہے۔ اسپین، اٹلی، یونان اور تونس سمیت ترکی دنیا میں سب سے زیادہ زیتون پیدا کرنے والے پانچ ملکوں میں شامل ہے۔ انجیر اور سیب بھی اپنی خوبی کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ ترکی میں ساڑھے چار سو قسم کے سیب ہوتے ہیں۔ افیون کی کاشت ۱۹۷۱ء میں بند کر دی گئی تھی لیکن ۱۹۷۴ء سے پھر شروع کر دی گئی ہے۔

ترکی میں مویشیوں کی بھی کثرت ہے۔ ایران کی طرح ترکی گوشت کے لیے مویشیوں کی درآمد کا محتاج نہیں بلکہ مویشی برآمد کرتا ہے۔ بھیڑیں اور بکری اپنے بہترین اون کی وجہ سے مشہور ہیں۔ خصوصاً انگورا کی بکری جس کے اون کی بین الاقوامی مانگ ہے۔ ترکی کی زرعی برآمد میں پنیر بھی شامل ہے۔ چراگاہوں کی کثرت ہے اور گلہ بانی کے لحاظ سے ترکی دنیا کا نواں بڑا ملک ہے۔

معدنی پیداوار کے لحاظ سے بھی ترکی اسلامی دنیا میں سرفہرست ہے۔ کوئلہ، لوہا، کرومیم، تانبا، مینگنیز، گندھک، جست اور سیسہ بڑی معدنی پیداوار ہیں۔ اس وقت دنیا میں کرومیم کی پیداوار کا دسواں حصہ ترکی میں ہوتا ہے۔ لوہا، کرومیم اور مینگنیز برآمد کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں بحیرہ اسود کے کنارے لوہے کے ۷۷ کروڑ ٹن کے ذخیرے ملے۔ مشرقی ترکی کے لوہے کے

ذخیرے اس کے علاوہ ہیں۔ کوئلہ کے معلوم ذخیرے ساڑھے پانچ ارب ٹن سے زیادہ ہیں۔ تانبے کے ذخیروں کا تخمینہ ۳۹ کروڑ ٹن ہے۔ جس میں نو کروڑ ٹن اعلیٰ درجہ کا تانبا شامل ہے۔ حال ہی میں باکسائٹ کے تین کروڑ ٹن کے ذخیرے ملے ہیں۔

تیل اور گیس کے ذخیرے اب تک ترکی میں کم تھے۔ ترکی اپنی ضرورت کا صرف نصف تیل پیدا کرتا ہے۔ یہ تیل زیادہ تر مشرقی ترکی میں ہوتا ہے، لیکن اب مشرقی ترکی اور آبدیمان (وسطی ترکی) میں نئے ذخیروں کا پتہ چلا ہے۔ اس کے علاوہ ستمبر ۱۹۷۶ء میں مشرقی ترکی میں نصیبین کے مقام پر قدرتی گیس کے بھی وسیع ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ بحیرہ ایجین میں بھی تیل دریافت ہوا ہے جس سے استفادہ کرنے کے مسئلہ پر یونان سے جھگڑا چل رہا ہے۔ فی الحال ترکی تیل کی ضرورت لیبیا اور عراق سے پوری کرتا ہے۔ مئی ۱۹۷۷ء میں عراقی تیل کو ترکی کے راستے بحیرہ روم تک پہنچانے کے لیے کرکوک سے براہ ماردین ولایت ادانہ تک ایک پائپ لائن مکمل ہوئی ہے جو سالانہ ساڑھے تین کروڑ ٹن تیل منتقل کر سکتی ہے۔ اس پائپ لائن کی ترکی کو سالانہ دس کروڑ ڈالر فیس ملے گی اور ترکی اپنی ضرورت کے لیے ایک کروڑ سے ایک کروڑ چالیس لاکھ ٹن تک تیل استعمال کر سکے گا۔

زرعی اور معدنی پیداوار کی کثرت کی بنا پر ترکی صنعتی میدان میں تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ سیمنٹ، شکر، تمباکو، چائے، سوتی اور اونی پارچہ بافی، فولاد سازی زرعی مشینیں اور سامان، شیشہ سازی، سیمنٹ سازی، کیمیاوی صنعت۔ پلاسٹک اور ربڑ کی صنعت، کاغذ سازی، موٹر مشین، ریفریجریٹر، المونیم، ٹریکٹر سازی اور جہاز سازی بڑی صنعتیں ہیں۔ تیل صاف کرنے کے چار کارخانے ہیں جن میں ۶۵ لاکھ ٹن تیل صاف کرنے کی گنجائش ہے۔ پٹرو کیمیکل صنعت پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ موٹر کار کی صنعت کافی ترقی یافتہ ہے۔ اس وقت چار مختلف ساخت کی موٹریں کل پرزے جوڑ کر تیار کی جا رہی ہیں۔ ان کے اسی فیصد پرزے ملک میں تیار ہوتے ہیں۔ اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اگلے پانچ سالوں میں سو فیصد پرزے ترکی میں بننے لگیں۔ ریل کے انجن بھی اب ترکی میں بننے لگے ہیں اور طیارہ سازی کی صنعت کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ ترکی سیمنٹ کی پیداوار میں اسلامی دنیا میں سب سے آگے ہے۔ یہاں ایک کروڑ ٹن سیمنٹ سالانہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح فولاد سازی کے معاملے میں بھی ترکی اسلامی دنیا میں سب سے آگے

ہے۔اس وقت ملک میں قرابوق، اریغلی اور اسکنداون میں فولادسازی کے تین بڑے کارخانے قائم ہیں جن کی پیداوار ۲۵ لاکھ ٹن سے زیادہ ہے۔چوتھا کارخانہ مرمرہ کے کنارے ایدریمت میں روس کی مدد سے زیرتعمیر ہے۔جس کی پیداوار دس لاکھ سے پندرہ لاکھ ٹن تک ہوگی۔ ۱۹۷۷ء میں ترکی اور لیبیا کے درمیان سات منصوبوں کو مکمل کرنے کے لیے ایک معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت کاغذ سازی لینڈ روور اور لاریوں کے انجن گہرے کنوؤں کے پمپ، ٹرانسفارمر، بجلی کے موٹر، کیمیاوی کھاد اور بال بیرنگ کے کارخانے قائم کیے جائیں گے۔ایٹمی طاقت سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ترکی میں حال ہی میں یورے نیم کے ذخیرے بھی دریافت ہوئے ہیں اوراس وقت ترکی میں پہلا ایٹمی بجلی گھر جس کی گنجائش چھ لاکھ کلوواٹ ہوگی مرسین کے مقام پر زیرتعمیر ہے۔مختصر یہ کہ ترکی ایک بڑا صنعتی ملک بننے کی بھرپور کوشش کررہا ہے۔ترک رہنما چاہتے ہیں کہ وہ اگلے دس سالوں میں ترکی کو یورپ کا پانچواں سب سے بڑا صنعتی ملک بنادیں۔ بہرحال اس تمام ترقی کے باوجود اسلحہ سازی کی صنعت ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔اگرچہ اسلحہ سازی کی یہ صنعت بھی اسلامی دنیا میں سب سے ترقی یافتہ ترکی ہی میں ہے۔قبرص کے تنازعہ کے بعد فروری ۱۹۷۵ء سے امریکہ نے ترکی کی فوجی امداد بڑی حد تک بند کردی[1] ہے اور ترکی میں یہ احساس بہت شدت اختیار کرگیا ہے کہ ترکی کو بھاری اسلحہ کے میدان میں خود مکتفی بنایا جائے۔ صنعت کی اس تیز رفتار ترقی کی وجہ سے ترکی میں گرانی بھی بڑھ گئی ہے اور توازن تجارت بھی خلاف ہوگیا ہے۔ترکی میں زرعی اور معدنی پیداوار اور مصنوعات کی برآمد کے علاوہ زرمبادلہ کا بہت بڑا ذریعہ وہ ترک مزدور ہیں جو جرمنی میں کام کرتے ہیں۔ان مزدوروں کی تعداد کم وبیش چھ لاکھ ہے۔اور ۱۹۷۴ء میں ان مزدوروں نے ایک ارب ۴۲ کروڑ ڈالر ترکی بھیجے تھے۔سیاحت بھی ترکی کے زرمبادلہ کا بڑا ذریعہ ہے۔اگر ہم ملیشیا کو چھوڑ دیں جہاں سیاحوں کی تعداد ۲۶ لاکھ سالانہ ہے تو مراکش اور لبنان کو شامل کرکے ترکی اسلامی دنیا کے ان تین سب سے بڑے ملکوں میں ہے جہاں تقریباً چودہ پندرہ لاکھ سیاح ہرسال آتے ہیں۔

(۱) افغانستان میں روس کی جارحیت کے بعد اب امریکہ کی پالیسی میں تبدیلی آگئی ہے اور امریکہ نے ترکی کو بڑے پیمانے پر اقتصادی اور فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

تعلیم و صحافت

تعلیمی میدان میں بھی ترکی اسلامی دنیا میں سرفہرست ہے۔ ۱۹۷۷ء میں صرف ابتدائی مدرسوں میں طلبہ کی تعداد پچاس لاکھ تھی۔ سرکاری مدرسوں میں ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی تک ہر مرحلے پر تعلیم مفت ہے۔ خواندگی کا تناسب ساٹھ فیصد ہی ہے جو لبنان کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ استنبول ازمیر، انقرہ، ارض روم، بروصہ اور ادانہ میں یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ انقرہ کی تکنیکل تعلیم کی مشرق وسطی ٹکنکل یونیورسٹی اسلامی دنیا کا بہت اہم تعلیمی ادارہ ہے۔ استنبول میں بھی ایک ٹیکنکل یونیورسٹی قائم ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد ترکی میں دینی تعلیم کے مدرسوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ امام خطیب مدرسوں کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ہوا اور ۱۹۷۷ء تک ترکی میں دو سو اکتالیس امام خطیب مدرسے قائم ہو چکے تھے۔ اسی طرح اعلیٰ اسلامی تعلیم کے مدرسوں کی تعداد ۱۹۷۷ء میں آٹھ تھی[۱] مولانا خلیل حامدی نے جو ۱۹۶۸ء میں ترکی گئے تھے۔ امام خطیب مدرسوں کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ میرے سامنے جو حاضرین موجود تھے۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ امام و خطیب اسکول کے نام سے طلبہ اور اساتذہ کا جو تصور میں نے قائم کر رکھا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان مدارس میں اسی نوعیت کے اماموں اور خطیبوں کی کھیپ تیار ہو رہی ہے جو ہندو پاکستان کے اکثر دینی مدارس میں تیار ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے بلکہ یہاں تازہ دم، صحت مند زندگی کی توانائیوں سے بھرپور عنصر جمع ہے۔ ان کے چہرے غمازی کر رہے ہیں کہ دین سے گہرا عشق ان کو اس ادارے میں کھینچ لایا ہے۔[۲]

ان دینی مدرسوں کے علاوہ جو نجی اداروں کے زیر انتظام ہیں، انقرہ یونیورسٹی اور ارض روم یونیورسٹیوں میں ''الٰہیات فیکلٹی'' کے نام سے شعبے بھی قائم ہیں جہاں اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم سرکاری سطح پر دی جاتی ہے۔

---

(۱) یہ تعداد روزنامہ یمی آسیا، استنبول مورخہ ۱۶/ جولائی ۱۹۷۷ء میں شائع ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق ہے۔ لیکن دسمبر ۱۹۷۹ء کے پہلے ہفتہ میں نجم الدین اربکان صدر ملی سلامت پارٹی نے پاکستان کے دورہ میں جسارت کے نمائندہ کو بتایا کہ اب دینی مدرسوں کی تعداد ساڑھے تین سو اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کی تعداد دس ہوگئی ہے۔

(۲) خلیل احمد حامدی: ترکی: قدیم و جدید ص ۳۷۔۳۸۔

اسلامی دنیا میں ترکی اور مصر میں صحافت کا معیار سب سے بلند ہے۔ ترکی میں ۱۹۶۹ء میں اخبارات کی تعداد ۴۶۸ تھی جن کی مجموعی اشاعت سولہ لاکھ تھی۔ روزنامہ ''حریت'' کی اشاعت سات لاکھ ہے اور روزنامہ ''ترجمان'' کی اشاعت ۴½ لاکھ ہے، روزنامہ ''ملت'' ڈھائی لاکھ اور ''جمہوریت'' ایک لاکھ چھپتا ہے۔ یہ تمام اخبارات استنبول سے شائع ہوتے ہیں لیکن ان کے انقرہ ایڈیشن بھی نکلتے ہیں۔ ازمیر کے روزنامہ ینی عصر کی اشاعت ستر ہزار ہے۔ بارش جو پہلے اُلس کہلاتا تھا اور ظفر صرف انقرہ سے نکلتے ہیں اور ان کی اشاعت بالترتیب سترہ ہزار اور تیرہ ہزار ہے۔ ترکی سے کئی اعلیٰ درجہ کے ہفت روزہ اور ماہنامے بھی شائع ہوتے ہیں۔ علمی اور ادبی جریدوں اور رسالوں کی بھی کمی نہیں۔ تقریباً ہر یونیورسٹی اور ہر تحقیقی ادارہ کوئی نہ کوئی علمی رسالہ شائع کرتا ہے۔

ترکی آئین کی یہ خصوصیت قابل غور ہے کہ اس آئین کے تحت اخبارات نکالنے کے لیے سرکاری اجازت کی ضرورت نہیں اور حکومت اخبارات کی خبروں پر سنسر نہیں کر سکتی اور نہ ان کے خلاف کوئی کاروائی کر سکتی ہے۔ یہ حق صرف عدالتوں کو حاصل ہے۔ (اردو ڈائجسٹ سالنامہ ۱۹۶۹ء)

کتابوں کی اشاعت کے معاملے میں بھی ترکی اسلامی دنیا میں سب سے آگے ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ترکی میں پانچ ہزار چار سو کتابیں طبع ہوئی تھیں جبکہ مصر میں جو اسلامی دنیا میں دوسرے نمبر پر تھا صرف پونے تین ہزار کتابیں چھپی تھیں ۱۹۷۲ء میں ترکی سے چھ ہزار نو سو کتابیں شائع ہوئیں۔ اخباروں کی طرح کتابوں کی اشاعت کا بھی سب سے بڑا مرکز استنبول ہے۔ ۱۹۷۲ء میں شائع ہونے والی کتابوں میں سے چار ہزار ایک سو بیس کتابیں استنبول سے دو ہزار دو سو کتابیں انقرہ سے اور باقی دوسرے شہروں سے شائع ہوئی تھیں۔ (۱)

قدیم دور کے مخطوطات یعنی قلمی کتابوں کے لحاظ سے ترکی کے کتب خانے دنیا میں سب سے قیمتی کتب خانے ہیں۔ صرف استنبول کے کتب خانوں میں قلمی نسخوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ استنبول کے علاوہ ترکی کے دوسرے شہروں اور قصبوں کے کتب خانوں میں بھی قلمی

---

(۱) ترکی میں کتابوں کی نشر و اشاعت کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے دیکھیے میری کتاب ''ترکی اور ترک'' حصہ اول۔ شائع کردہ اسلامک پبلی کیشنز لاہور۔

نسخوں کی کمی نہیں۔ [1]

ترکی ادب

ترکی جمہوریہ کے قیام کے بعد سے اب تک گزشتہ نصف صدی میں ترکی ادب نے جو ترقی کی ہے اس کا جائزہ دو چار صفحات میں ممکن نہیں۔ ترکی زبان میں علم و ادب کی تقریباً ہر صنف اور ہر شاخ میں وافر کام ہوا ہے اور اتنا وسیع ادبی ذخیرہ شاید اسلامی دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں۔ ترکوں نے گزشتہ نصف صدی میں اپنی زبان کو تالیف اور ترجمے دونوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ مغربی زبانوں کا تقریباً تمام کلاسیکی ادب ترکی میں منتقل ہو چکا ہے۔ جدید ترین افکار اور نظریات پر ترکی میں کتابیں مل جائیں گی۔ اسلامی اور دینی موضوعات پر قدیم اور جدید عربی کتابوں کے ترجموں کی کمی نہیں حتیٰ کہ اردو کے مصنفین کی کتابوں کے ترجمے بھی کثرت سے موجود ہیں۔ یہ ترجمے زیادہ تر عربی یا انگریزی ترجموں کی مدد سے کیے گئے ہیں۔

ترکی کے جن محققوں نے تحقیقی میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی ان میں محمد فواد کو پرولو (۱۸۹۰ء تا ۱۹۶۶ء) اور زکی ولیدی توغان (۱۸۹۰ء تا ۱۹۷۰ء) کے نام سے نمایاں ہیں۔ فواد کو پرولو ڈیموکریٹ پارٹی کے دور حکومت میں سات سال وزیر خارجہ بھی رہے۔ ان کے تحقیقی مقالوں، کتابوں اور کتابچوں کی تعداد چار سو سے زیادہ ہے۔ انھوں نے زیادہ تر قدیم ترکی ادب کے گمنام گوشوں پر تحقیق کی ہے۔ ترکی زبان کے صوفی شاعروں اور عوامی شاعروں پر انھوں نے کئی جلدیں مرتب کی ہیں۔ وہ "انجمن تحقیق آثار اسلامیہ و ملیہ" اور "ترکیات انسٹی ٹیوٹ" کے بانی تھے۔

زکی ولیدی توغان روسی مہاجر تھے اور ترکی سے باہر ترکوں کی تاریخ خصوصاً روس کے ترک علاقوں کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ وہ استنبول یونیورسٹی میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کے سربراہ تھے۔ [2]

اسماعیل حبیب سیوک (۱۸۹۲ء تا ۱۹۵۴ء) احمد حمدی تان پنار (۱۹۰۱ء تا ۱۹۶۲ء)

---

(۱) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے مذکورہ بالا کتاب میں مضمون "ترکی کے کتب خانے"

(۲) فواد کو پرولو اور زکی ولیدی توغان کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے میری کتاب "ترکی اور ترک حصہ اول۔

نہاد سمیع بنارلی (۱۹۱۱ء تا ۱۹۷۴ء) اور احمد کبکلی (پیدائش ۱۹۲۴ء) کے نام اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انھوں نے ترکی ادب کی نہایت جامع اور تحقیقی تاریخیں لکھیں جو بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

تاریخ وسوانح وہ موضوع ہیں جن میں بقول خالدہ خانم ترکوں کی ذہانت کا سب سے زیادہ مظاہرہ نظر آتا ہے۔عثمان توران (۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۸ء) نے سلجوقوں کی تاریخ پر خصوصاً ترکی کے سلاجقہ پر تحقیقی کتابیں لکھیں۔ احمد رفیق (۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۷ء) ڈاکٹر رضا نور (۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۲ء) اسماعیل حامی دانشمند (۱۸۸۹ء تا ۱۹۶۷ء)، اسماعیل حقی قونوی (پیدائش ۱۸۹۶ء، اسماعیل حقی اوزون چارشلی (پیدائش ۱۸۸۸ء) اور یلماز زورلتونہ نے عثمانی تاریخ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر نہایت مفصل اور محققانہ کتابیں لکھیں۔آخر الذکر تینوں مورخ ان سطور کے لکھے جانے تک زندہ ہیں۔ جدید ترکی کی تاریخ پر انور بھنان شاپولیو (پیدائش ۱۹۰۰ء) انور ضیا کرالی (پیدائش ۱۹۰۶ء) اور یوسف حکمت بایوانے اہم کتابیں لکھی ہیں۔

بلند پایہ سوانح نگاروں میں ابن الامین محمود کمال (۱۸۷۰ء تا ۱۹۵۷ء) کا نام قابل ذکر ہے۔جنھوں نے آخری عثمانی دور (انیسویں صدی) کے وزرائے اعظم شاعروں اور خوشنویسوں اور موسیقاروں کے مفصل حالات لکھے۔موجودہ دور کے سب سے بڑے سوانح نگار شوکت ثریا (۱۸۹۷ء تا ۱۹۷۶ء) ہیں جنھوں نے انور پاشا، مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو میں سے ہر ایک کے حالات تین تین جلدوں میں لکھے۔ان کے علاوہ ایک جلد عدنان مندریس پر بھی لکھی۔ جمہوری دور سے قبل محمد ثریا (متوفی ۱۹۰۸ء) نے ''سجل عثمانی'' کے نام سے عثمانی دور کے مشاہیر کا دائرۃ المعارف کے انداز میں ڈہائی ہزار صفحات پر مشتمل تذکرہ لکھا تھا۔ جمہوری دور میں شاد اکرم کوچو (۱۹۰۵ء تا ۱۹۷۵ء) نے استنبول کی انسائیکلو پیڈیا اور مختلف مشاہیر کے حالات پر کتابیں لکھ کر اس سلسلے کو جاری رکھا۔اس ضمن میں ابراہیم علاء الدین (۱۸۹۹ء تا ۱۹۴۹ء) کا نام بھی قابل ذکر ہے جنھوں نے مشاہیر عالم کی انسائیکلو پیڈیا چار جلدوں میں اور ترک مشاہیر کی انسائیکلو پیڈیا ایک جلد میں مرتب کی۔

دینی علوم پر ۱۹۴۶ء تک جمہوری دور میں بہت کم لکھا گیا۔ اس دور میں اگرچہ احمد نعیم (۱۸۷۲ء تا ۱۹۳۴ء) اسماعیل حقی ازمیرلی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۴ء) محمد شرف الدین یالت قیا (۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۷ء) ممتاز عالم ہوئے ہیں لیکن ان کی تصانیف زیادہ تر قیام جمہوریت سے

پہلے لکھی گئیں۔ جمہوری دور کے علماء میں الما لیل محمد حمدی (۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۲ء) جنھوں نے آٹھ جلدوں میں ترکی زبان میں قرآن کی تفسیر لکھی، احمد حمدی آقسیکی (۱۸۸۷ء تا ۱۹۵۱ء) جو ''اسلام دین فطرت ہے'' نامی کتاب اور کئی دوسری اہم کتابوں کے مصنف تھے اور حسن بصری چانتائے (۱۸۸۷ء تا ۱۹۵۱ء) جو قرآن کے ایک مقبول ترجمہ اور تفہیم کے مصنف تھے، کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سے ترکی میں حدیث، فقہ اور دوسرے اسلامی علوم پر کتبوں کے ترجمے تیزی سے ہو رہے ہیں۔ سید قطب، محمد قطب، مصطفیٰ سباعی اور شام و مصر کے علماء کی کتابوں اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف کے بکثرت ترکی میں ترجمے کیے گئے ہیں اور کیے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ممتاز محقق ڈاکٹر حمید اللہ کا نام بھی قابل ذکر ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے بون یونیورسٹی (جرمنی) سے اسلامی نظام حکومت پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہو گئے۔ ریاست حیدر آباد پر ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ کچھ مدت یہاں قیام کرنے کے بعد وہ فرانس چلے گئے جہاں وہ تیس سال سے پیرس میں مقیم ہیں۔ وہ آٹھ زبانیں جانتے ہیں۔ ان کی تصانیف عربی، اردو، انگریزی، جرمن اور فرانسیسی میں ہیں۔ انھوں نے فرانسیسی زبان میں قرآن کا جو ترجمہ کیا وہ بہت مقبول ہوا اور فرانسیسی میں قرآن کا سب سے اچھا ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ ہر سال ترکی میں تین ماہ قیام کر کے استنبول یونیورسٹی میں تاریخ اسلام اور اسلامی قانون بین الممالک پر لیکچر دیتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں پیغمبر اسلام، اسلامی نظام حکومت، عہد نبوی کے میدان جنگ اور صحیفہ ہمام بن منبہ کا ترکی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

دوسری زبانوں سے ترکی میں اسلامی موضوعات پر ترجمہ کرنے والوں میں عمر رضا دوغرلی (۱۸۹۳ء تا ۱۹۵۲ء) کا نام قابل ذکر ہے۔ وہ ترکی کے شاعر اسلام محمد عاکف کے داماد تھے۔ ان کی تالیف اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تعداد پچاس ہے جن میں شبلی کی سیرت النبی اور الفاروق اور دارالمصنفین کی سیر الصحابہ کے نام اہم ہیں۔ یہ کتابیں عربی اور انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

اس جگہ ناشر اور صحافی اشرف ادیب (۱۸۸۲ء تا ۱۹۷۱ء) کا تذکرہ بھی ضروری ہے جن

کا ہفت روزہ۔ صراط مستقیم اور سبیل الرشاد جمہوریت سے قبل دوسری مشروطیت کے زمانہ میں ترکی کے اسلام پسند عناصر کا سب سے بڑا ترجمان تھا۔ عاکف، سعید حلیم پاشا، احمد نعیم، احمد حمدی آقسکی اور دوسرے اسلام پسند ترکوں کے مضامین اسی رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔ ترکی کے باہر مفتی محمد عبدہ' فرید وجدی اور مولانا شبلی کے مضامین کے ترجمے بھی اس میں شائع کیے جاتے تھے۔ اس کا دائرۂ اشاعت روس کے ترکی بولنے والے مسلمانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ عہد جمہوریت کے ابتدائی دور میں مذہبی مطبوعات پر پابندی کے بعد سبیل الرشاد بند ہوگیا تھا لیکن ۱۹۴۰ء کے بعد پھر نکلنے لگا اور اشرف ادیب کی وفات تک جاری رہا۔ اس دور میں بھی یہ اخبار ترکی میں اسلام کا دفاع کرتا رہا اور اسلامی فکر کا ترجمان بنا رہا۔ بدیع الزمان سعید نورسی کے دفاع میں بھی اشرف ادیب نے زوردار مقالے لکھے۔ دینی موضوعات پر کئی اہم کتابیں جن میں عمر رضا دغرل کا سیرت النبی اور الفاروق کا ترجمہ بھی شامل ہے سبیل الرشاد کے دفتر سے شائع ہوئیں۔ اشرف ادیب خود بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سب سے اہم اور ضخیم شاعر محمد عاکف کی سوانح عمری ہے۔

۱۹۴۶ء کے بعد جب ترکی میں مذہبی مطبوعات پر سے پابندیاں اٹھ گئیں اور حقیقی جمہوریت کا بول بالا ہوا تو کئی اہل قلم اشخاص نے سیکولرازم پر اور خلق پارٹی کے دور حکومت کے مخالف اسلام اقدامات پر سخت تنقید کی۔ ان میں ڈاکٹر علی فواد باشگل (۱۸۹۱ء تا ۱۹۶۷ء) اور پروفیسر نورالدین توپچو (۱۹۰۹ء تا ۱۹۷۵ء) کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ ترکی میں حقیقی جمہوریت کی بحالی اور اس کے بعد دینی مدارس کے قیام کے سلسلے میں ڈاکٹر علی فواد کی جرأت مندانہ کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔[1] اسی طرح پروفیسر نورالدین توپچو نے ماہنامہ ''حرکت'' کے ذریعہ ترکی میں اسلامی فکر کا جدید انداز میں احیاء کیا۔ ان کو ترکی میں سعید حلیم پاشا کے بعد اسلامی فکر کا سب سے بڑا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔[2] ان کی فکر انگیز تحریروں سے نوجوان اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ بہت متاثر ہے۔ اس وقت ترکی میں علی فواد باشگل اور نورالدین توپچو سے اثر پذیر ہوکر فکری محاذ پر جو اہل قلم کام کر رہے ہیں ان میں جمیل میرچ (پیدائش ۱۹۱۷ء) سزائی قراکوچ

---

(۱) علی فواد کی تصانیف میں دین اور سیکولرازم، جمہوریت کی راہ میں اور علم کی روشنی میں مسائل حاضرہ اہم کتابیں ہیں۔

(۲) نورالدین توپچو کی تصانیف میں ہماری قومیت کی بنیادیں، مستقبل کا ترکی، اسلام اور انسان اور نظریہ تعلیم اہم ہیں۔

(پیدائش ۱۹۳۳ء)، صادق البائرق اور ارطغرل دُزداغ کے نام قابل ذکر ہیں۔ صف اول کے ادیبوں میں محمد کیلان (پیدائش ۱۹۱۵ء) اور احمد کبکلی (پیدائش ۱۹۲۴ء) بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو علی فواد باشگل اور نورالدین توپچو سے متاثر ہیں۔

موجودہ صدی میں ترکی میں جو صف اول کے شاعر ہوئے ہیں ان میں سے عبدالحق حامد عاکف اور توفیق فکرت کا تذکرہ اسی تاریخ کی دوسری جلد میں کیا جاچکا ہے۔ ان کے بعد جن شاعروں کو عروج حاصل ہوا ان میں یحییٰ کمال بیاتلی (۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۸ء) کا نام سرفہرست ہے۔ بعض نقادان کو فضولی کے بعد سب سے بڑا ترک شاعر تسلیم کرتے ہیں اور اس بات سے تو شاید کسی کو انکار نہیں کہ یحییٰ کمال جدید دور کے سب سے بڑے ترک شاعر ہیں۔ یحییٰ کمال جو ایک اچھے نثر نویس بھی تھے پاکستان میں ترکی کے پہلے سفیر تھے۔ ان کو ترکوں کی تاریخ کے عثمانی دور سے گہرا لگاؤ تھا جس کا اظہار جگہ جگہ ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ ''جامعہ سلیمانیہ میں عید قربان کی صبح'' ان کی شاہکار نظم ہے۔ وہ عاکف کی طرح نظریاتی شاعر تو نہیں تھے لیکن ان کے کلام میں اسلام سے گہری وابستگی پائی جاتی ہے۔ عاکف اور یحییٰ کمال کی روایات کو جس شاعر نے پوری قوت سے آگے بڑھایا وہ عارف نہاد آسیا (۱۹۰۴ء تا ۱۹۷۵ء) ہیں جن کو ترکی پرچم کا شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ جدید ترکی کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر تھے اور ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ محمد امین کے رنگ میں اس دور میں جس شاعر نے قومی شاعری کی وہ فاروق نغبذ (۱۸۹۸ء تا ۱۹۷۳ء) ہیں اور ان کا شمار موجودہ دور کے صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ رضا توفیق (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۹ء) اور نجیب فاضل (پیدائش ۱۹۰۵ء) اس لحاظ سے امتیازی مقام رکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں انسان دوستی اور تصوف کا رنگ گہرا ہے۔ اشتراکی نظریات رکھنے والے شاعروں میں سب سے مشہور ناظم حکمت (۱۹۰۲ء تا ۱۹۶۳ء) تھے۔ نجیب فاضل کی طرح انھوں نے ناول اور ڈرامے بھی لکھے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا دلکش کلام صرف وہ ہے جس میں سیاسی نظریات کی جھلک نہیں جس طرح ہم عاکف کو ترکی کا اقبال، توفیق فکرت کو ترکی کا جوش کہہ سکتے ہیں اسی طرح ناظم حکمت کو ہم ترکی کا فیض احمد فیض کہہ سکتے ہیں۔ وہ ترکی سے فرار ہو کر روس چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

ناول نویسی، افسانہ نگاری اور ڈرامہ نگاری وہ تین اصناف ادب ہیں جن میں ترکی ادب

مغرب کی سطح پر پہنچ گیا ہے اور نقادوں کا خیال ہے کہ دنیائے اسلام میں کسی ملک کا ادب، حتیٰ کہ عربی ادب بھی ان اصناف میں ترک فن کاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان اصناف میں ترک ادیب نظریاتی طور پر ہر اسلامی ملک کی طرح دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔ ایک گروہ اشتراکی ادیبوں کا ہے اور دوسرا غیر اشتراکی ادیبوں کا۔ غیر اشتراکی ادیب خود کو قوم پرست یا حصار جی (روایت پسند) کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں اسلامی فکر نمایاں ہے اور بعض میں دبی ہوئی ہے۔ ایک تیسرا گروہ ان ادیبوں کا ہے جو ادب برائے ادب کے قائل ہیں اور نظریاتی کشمکش سے الگ ہیں۔

اشتراکی گروہ کے ممتاز نمائندے صباح الدین علی (۱۹۰۷ء۔ ۱۹۴۸ء) کمال طاہر (۱۹۱۰ء تا ۱۹۷۳ء) اور خان کمال (۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۰ء) اور باشر کمال (پیدائش ۱۹۲۲ء) محمود مقال (پیدائش ۱۹۳۰ء) اور فقیر بائے کرد (پیدائش ۱۹۲۹ء) اور عزیز نے سن (پیدائش ۱۹۱۵ء) ہیں۔ قوم پرست، روایت پسند اور آزاد گروہ کے ممتاز نمائندے ممدوح شوکت (۱۸۸۳ء تا ۱۹۵۲ء) خالدہ ادیب (۱۸۸۴ء تا ۱۹۶۴ء) رفیق خالد (۱۸۸۸ء تا ۱۹۶۵ء) ارشاد نوری (۱۸۸۹ء تا ۱۹۵۶ء)، یعقوب قدری (۱۸۸۹ء تا ۱۹۷۴ء)، پیامی صفا (۱۸۹۹ء تا ۱۹۵۶ء)، یعقوب قدری ۱۸۸۹ء تا ۱۹۷۴ء)، پیامی صفا (۱۸۹۹ء تا ۱۹۶۱ء)، سعید فائق (۱۹۰۶ء تا ۱۹۵۴ء) اور طارق بغرا (پیدائش ۱۹۱۸ء) اور خلدون تانیر (پیدائش ۱۹۱۶ء) وغیرہ ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ترکی میں ایسے ادیب شاعر ناول نویس اور افسانہ نگار ابھر رہے ہیں جو واضح اسلامی فکر رکھتے ہیں۔ ان میں سزائی قرہ کوچ (پیدائش ۱۹۳۳ء) سرفہرست ہیں۔ ان کی نظم ونثر دونوں میں ندرت فکر پائی جاتی ہے۔ اس گروہ کے دوسرے نمائندے عاکف عنان (پیدائش ۱۹۴۰ء)، راسم اوزدن اورین، (پیدائش ۱۹۴۰ء)، نوری پاکدل (پیدائش ۱۹۳۴ء) اور جاہد ظریف اور غلو (پیدائش ۱۹۴۰ء) ہیں۔ ان کے علاوہ تاریخی ناول نگاروں میں بھی اسلامی رجحان کا غلبہ ہے۔ ان میں جو ناول نگار فنی لحاظ سے بھی بلند ہیں ان میں عبداللہ ضیا (۱۹۰۶ء تا ۱۹۶۶ء)، فریدوں فاضل (پیدائش ۱۹۱۲ء) اور مصطفیٰ نجانی (پیدائش ۱۹۳۲ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک ڈرامہ نویسی کا تعلق ہے، اگر ہم نامق کمال کو نظر انداز کر دیں، جن کے ڈرامے اسٹیج سے زیادہ پڑھنے کے لیے موزوں ہیں تو ترکی میں صف اول کے پہلے ڈرامہ نگار مصاحب زادہ جلال (۱۸۶۸ء تا ۱۹۵۹ء) اور ابن الرفیق (۱۸۷۴ء تا ۱۹۳۵ء) قرار پاتے ہیں۔

لیکن ان دونوں کے بیشتر ڈرامے جمہوری دور سے پہلے کے ہیں۔ جمہوری دور کے ممتاز ڈرامہ نگاروں میں نجیب فاضل (پیدائش ۱۹۰۵ء) مصطفیٰ نجاتی (پیدائش ۱۹۳۲ء)، محمود یساری (۱۸۹۵ء تا ۱۹۴۵ء)، رشاد نوری (۱۸۸۹ء تا ۱۹۵۶ء) اور جواد فہمی (۱۹۰۵ء تا ۱۹۷۱ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ ترکی ڈرامہ نویسی کا معیار اتنا ہی بلند ہے جتنا ناول نویسی اور افسانہ نگاری کا ہے۔

جدید دور میں ادب و تحقیق کے میدان میں کئی خواتین نے بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ شگوفہ نہال (۱۸۹۶ء تا ۱۹۷۳ء) اور خالدہ نصرت (پیدائش ۱۹۰۱ء) بحیثیت شاعر، کریمہ نادر (پیدائش ۱۹۱۷ء) نزیہہ میرچ (پیدائش ۱۹۲۵ء) اور خالدہ خانم (۱۸۸۴ء تا ۱۹۶۴ء) بحیثیت ناول نگار ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ خالدہ ادیب کی کتاب "سینکلی بقال" ترکی زبان کی سب سے مقبول ناول ہے، جس کے ۱۹۷۴ء تک ۳۲ اڈیشن نکل چکے تھے۔ خالدہ خانم نے بعض سنجیدہ موضوعات پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ اس قسم کی کتابوں میں سے ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش اور اندرون ہند کا اردو میں ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔[1] لیکن علمی اور تحقیقی میدان میں زیادہ ممتاز نام سامحہ آ یوردی (پیدائش ۱۹۰۶ء) اور فوزیہ عبداللہ تنسل (پیدائش ۱۹۱۲ء) کے ہیں۔ سامحہ نے ناولوں کے علاوہ تاریخی موضوعات پر بھی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ ناولوں میں ان کا نقطۂ نظر دینی ہے۔ فوزیہ عبداللہ نے ادبی موضوعات پر بنیادی اہمیت کا تحقیقی کام کیا ہے۔ انھوں نے ضیا گوک الپ اور نامق کمال کے مکتوبات اور مقالوں کے ضخیم مجموعے مرتب کیے اور دینی ادب پر تحقیقی کام کیا۔ عاکف کی سوانح عمری ان کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے۔

---

(۱) خالدہ ادیب خانم کی تصانیف کی تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب "ترکی اور ترک" حصہ اول۔

(د) المشرق العربی (ا) زرخیز ہلال

ملک	رقبہ	آبادی
۱۔عراق	ایک لاکھ ۶۸ ہزار مربع میل ۴ لاکھ ۸ ۳ ہزار مربع کیلومیٹر	ایک کروڑ بیس لاکھ (۱۹۷۸ء)
۲۔شام	۷۱ ہزار مربع میل ایک لاکھ ۸۵ ہزار مربع کیلومیٹر	۸۷ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۳۔لبنان	۴ ہزار چار سو مربع میل دس ہزار چار سو مربع کیلومیٹر	۳۳ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۴۔اردن	۳۷ ہزار چار سو مربع میل ۹۷ ہزار ۷ سو مربع کیلومیٹر	۲۸ لاکھ (۱۹۷۸ء)
۵۔فلسطین	۸ ہزار مربع میل ۲۰ ہزار ۷ سو مربع کیلومیٹر	۳۶ لاکھ (۱۹۷۸ء)

اُردن کے رقبہ اور آبادی میں فلسطین کا وہ حصہ شامل ہے جو ۱۹۴۸ء میں اردن کے پاس تھا اور فلسطین کے اعداد و شمار اسرائیل کی ناجائز مملکت کے رقبہ اور آبادی کو ظاہر کرتے ہیں، جہاں چار لاکھ عرب آباد ہیں باقی یہودی ہیں۔

باب ۱۶

عربوں کی نشاۃ ثانیہ

نسلی اور لسانی اعتبار سے اسلامی دنیا کا سب سے بڑا خطہ وہ ہے جس میں عرب باشندے آباد ہیں۔ یہ خطہ خلیج فارس سے بحر اوقیانوس تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا رقبہ پچاس لاکھ مربع میل سے زیادہ اور آبادی (۱۹۷۸ء) پندرہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ یہ وسیع و عریض عرب دنیا بائیس ملکوں پر مشتمل ہے جن میں اکیس اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ اس خطے میں عربوں کے علاوہ کرد، ترک، قبطی، بربر، حبشی اور دوسری نسلوں کے لوگ بھی آباد ہیں لیکن عربی ان سب کی مادری یا مشترکہ زبان ہے۔ اسی طرح یہودی اور عیسائی بھی کافی تعداد میں موجود ہیں لیکن باشندوں کی ۹۵ فیصد سے زیادہ تعداد مسلمان ہے۔ دنیائے عرب کا بڑا حصہ ریگستانوں پر مشتمل ہے۔ ربع الخالی اور صحرائے اعظم کے مشہور عالم ریگستان اسی خطے میں ہیں۔ ریگستانوں کے بعد جو علاقہ باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یمن کی سطح مرتفع، دجلہ اور فرات کے نہری علاقے، شام، لبنان اور فلسطین کے ساحل، دریائے نیل کی وادی اور بحیرۂ روم کا ساحلی علاقہ ——— وہ اپنی زرخیزی اور سرسبزی اور شادابی میں بے مثال ہیں۔ قدرتی مناظر کے لحاظ سے لبنان ساحل شام اور مراکش عرب دنیا کے حسین ترین خطے ہیں۔ دنیا کی تین بڑی بین الاقوامی آبی گزرگاہوں آبنائے جبل الطارق، نہر سوئیز اور باب المندب پر عربوں کا کنٹرول ہے۔ مشرق کو مغرب سے ملانے والے اہم ترین راستے عرب دنیا سے گزرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ، مدینہ اور بیت المقدس اسی خطہ میں واقع ہیں۔ اور عربی زبان قدیم اور جدید علوم اور سرمایہ سے مالا مال ہے اور عربی صحافت اسلامی دنیا کی سب سے ترقی یافتہ صحافت ہے۔ اسلام کے بعد دنیائے عرب کی دوسری بڑی دولت پٹرول ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ پٹرول عرب ملکوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں عرب ملکوں میں اسی کروڑ ٹن پٹرول نکالا گیا تھا جو دنیا کی کل پیداوار کا چالیس فیصد تھا۔

آغاز اسلام کے بعد ڈھائی سو سال تک اسلامی دنیا کی سیاسی، ثقافتی اور فکری قیادت پوری

طرح عربوں کے ہاتھ میں رہی۔ اور انھوں نے عظیم اور بے مثل اسلامی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد غیر عرب مسلمانوں کا عروج شروع ہوا۔ مشرق میں ایرانی اور مغرب میں بربر آگے بڑھے۔ لیکن ترکوں نے جلد ہی سب کو بیدخل کر دیا اور اسلامی دنیا کی سیاسی قیادت ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ غیر عرب قوموں کے عروج کے ابتدائی ڈھائی سو سالہ دور میں اگرچہ سیاسی قیادت غیر عرب اقوام کے ہاتھ میں آ گئی تھی لیکن فکری اور ثقافتی قیادت اب بھی عربوں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ خلیفہ بھی عرب تھا اور اسلامی دنیا کی علمی اور تعلیمی زبان بھی عربی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا ابتدائی پانچ سو سالہ دور عربوں کا دور کہلاتا ہے۔ یہ دور بلاشک وشبہ اسلامی تاریخ کا سب سے شاندار دور ہے کیونکہ اس دور میں مسلمان نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی سیاسی طاقت تھے بلکہ علمی اور ثقافتی میدان میں بھی وہ سب سے آگے تھے۔ ان کی حیثیت اس زمانہ میں دنیا کے معلم کی تھی۔

بغداد کی تباہی کے بعد عربوں کا تیزی سے زوال شروع ہوا۔ سیاسی قیادت پوری کی پوری ترکوں کے ہاتھ میں چلی گئی، خلافت بھی ان کے ہاتھ سے نکل کر عثمانی ترکوں کے ہاتھ میں چلی گئی، فکری، علمی اور ثقافتی میدان میں بھی عرب دنیا کے قائد نہیں رہے اور ان میدانوں میں قیادت یورپ کی غیر مسلم قوموں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ عرب زبان کو بھی اب پہلی سی بالادستی نہیں رہی اور فارسی اور ترکی کی شکل میں دو حریف زبانیں پیدا ہوگئیں۔ ۱۵۰۰ء کے بعد عرب دنیا میں وہ ذہین اور عبقری انسان پیدا ہونا بند ہو گئے جن کی عرب دنیا میں کبھی کمی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ گویا عربوں کا زوال اسلامی دنیا کے زوال کا پیش خیمہ بن گیا۔

سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک مراکش کے علاوہ دنیائے عرب کا بیشتر حصہ چونکہ ترکوں کی عثمانی سلطنت میں شامل تھا اس لیے عرب قوم پرست اپنے اس زوال کا ذمہ دار عثمانی ترکوں کو قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال اگرچہ بالکل بے بنیاد نہیں لیکن مبالغہ آمیز ضرور ہے۔ خود عثمانی ترکوں کا عروج ایک ایسے دور میں ہوا جب اسلامی دنیا ہر جگہ فکری لحاظ سے زوال پذیر ہو چکی تھی اور اس کی اجتہادی صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں۔ عثمانی ترکوں کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس کمزوری کے باوجود انھوں نے مسلمانوں کو اپنے دور کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بنا دیا اور سترھویں صدی کے بعد بھی وہ دو سو سال تک متحدہ یورپ کا کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے۔ اسلامی دنیا کے زوال کے اسباب دوسرے تھے جن کی ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں نشاندہی کر چکے ہیں۔

جہاں تک عرب دنیا کی معاشی ابتری کا تعلق ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ مشرق اور مغرب کے درمیان بحری راستہ کی دریافت ہے۔ بحری راستہ کی دریافت سے پہلے یورپ اور ایشیا کی تجارت کا سب سے بڑا راستہ شام اور مصر سے ہو کر گزرتا تھا اور اس کی وجہ سے شام اور مصر اور ان سے ملے ہوئے ملکوں میں خوشحالی پیدا ہو گئی تھی۔ جب بحری راستہ کی دریافت کے بعد یہ تجارتی راستہ بند ہو گیا تو ان ملکوں کی معیشت ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ ایران، اور ترکستان کی معیشت بھی تباہ ہو گئی حالانکہ وہاں عثمانی حکومت قائم نہیں تھی بلکہ مقامی باشندے حکمران تھے۔ ہاں یہ بات ضرور صحیح ہے کہ عثمانی حکمرانوں نے اپنے ان مقبوضات کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے خصوصی توجہ نہیں دی۔ لیکن اس کی وجہ عربوں سے تعصب نہیں تھا یورپ سے مسلسل جنگوں کی وجہ سے وہ ملکی معیشت کی طرف ضرورت کے مطابق توجہ نہیں دے سکے جس کا اثر خود ترکی (اناطولیہ) پر بھی پڑا۔ عرب ملکوں خصوصاً مصر کی معیشت دوبارہ اس وقت بحال ہوئی جب نہر سویز تعمیر ہوئی اور مشرق و مغرب کی تجارت کا قدیم راستہ پھر بحال ہو گیا۔

عثمانی ترکوں کو جب زوال ہوا تو عرب ملک بتدریج ان کے ہاتھ سے نکلتے چلے گئے۔ شمالی افریقہ جس پر پہلے ہی ترکوں کا تسلط کمزور تھا سب سے پہلے فرانس کے قبضہ میں گیا۔ اس کے بعد انگریز مصر پر قابض ہو گئے اور جنگ عظیم سے دو تین سال پہلے لیبیا پر اٹلی نے قبضہ کر لیا۔ عربوں میں بیداری کا آغاز انیسویں صدی میں مصر اور تونس سے ہوا جہاں عثمانی سلطنت کے باجگذار ترک النسل خانوادے حکمراں تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب پوری اسلامی دنیا میں نہضت شروع ہو چکی تھی۔ خود ترکی میں تنظیمات کا آغاز ہو چکا تھا اور برطانوی ہند میں علی گڑھ اور دیوبند کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کی بیداری کے اس نئے دور میں اسلام کے بجائے قومیت اور وطنیت کا جذبہ ایک قوت محرکہ کے طور پر ابھرا۔ یہ جذبہ بحیثیت ایک تحریک کے اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف تھا۔ اسلام قومیت اور وطنیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کو مناسب اہمیت بھی دیتا ہے لیکن رنگ، نسل اور وطن کو اسلام میں قوت محرکہ کی حیثیت حاصل نہیں اور نہ ہی قومیں اس بنا پر ایک دوسرے سے افضل ہو سکتی ہیں۔ قومیت اور وطنیت کا جذبہ اپنے آباو اجداد پر فخر کرنا سکھاتا ہے چاہے یہ آباو اجداد کتنے ہی گمراہ کیوں نہ ہوں۔ یہ جذبہ بنی نوع انسان کو ایسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے جو ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ یہ جذبہ خود غرضی کا باعث ہوتا ہے۔ اور

اس کے تحت ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک سے تعلق قائم کرتے وقت محض مادی فائدے اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ انسانیت کا برتر نقطۂ نظر ان کے سامنے کبھی نہیں ہوتا۔ مسلمان اپنی بیداری کے اس دور میں قوم پرستی اور وطن پرستی کے اسی سیلاب میں بہہ گئے۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنی زبان سے محبت ہوتی ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس جذبہ کی وجہ سے کوئی قوم دوسری قوم کی برتری تسلیم نہیں کر سکتی۔ ایک قوم دوسری کے ساتھ برابری کی حیثیت سے تو رہ سکتی ہے لیکن غلام بن کر نہیں رہ سکتی۔ عہد بنی امیہ میں جب عربوں نے ایرانیوں کو مساوی حیثیت نہیں دی تو انھوں نے بغاوت کر دی، لیکن جب عباسی دور میں ان کو مساوی حیثیت مل گئی تو انھوں نے اسلامی خلافت اور اسلامی تہذیب کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں عربوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وطنیت اور قومیت کا جذبہ اگر جائز حدود میں رہے تو یہ ظلم کے خلاف ایک ہتھیار ہے، ایک تعمیری قوت بھی ہے۔

انیسویں صدی میں جب مسلمان قوموں کو اپنی پستی اور مغرب کے مقابلے میں اپنی ناکامی اور مغربی اقوام کی برتری اور کامیابی کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے زوال کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا۔ کچھ اہل علم اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان معاشرہ اسلامی تعلیمات سے دور ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، محمد سنوسی اور محمد بن عبدالوہاب اس گروہ کے ترجمان تھے۔ لیکن کچھ اہل فکر نے جو ان کے بعد آئے یہ کہا کہ اسلام سے دوری کے علاوہ ہمارے زوال کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے افکار میں جمود پیدا ہو گیا ہے جس نے ہمیں تخلیقی صلاحیتوں سے محروم کر دیا ہے۔ اس گروہ کے افراد نے مغرب کا رخ کیا اور وہاں جا کر مغربی علوم حاصل کیے اور اہل یورپ کی زندگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے یورپ کی ترقی کے اسباب کا جائزہ لیا۔ اس مشاہدہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ منجملہ دوسرے اسباب کے اہل یورپ کی اپنے ملک اور وطن سے غیر معمولی محبت بھی یورپ کی ترقی کی بہت بڑی وجہ ہے۔ تونس کے خیر الدین پاشا مصر کے رافع طہطاوی اور ترکی کے نامق کمال اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جمال الدین افغانی نے جو اتحاد اسلامی کے عظیم علمبردار تھے۔ یہی رائے دی کہ مسلمان حب وطن کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہی یورپ کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان تمام افکار کا اسلامی

دنیا پر گہرا اثر پڑا۔ عرب اور ترک خاص طور پر ان نظریات سے بہت متاثر ہوئے۔ عربوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اگرچہ انھوں نے تاریخ میں عظیم کارنامے انجام دیے ہیں اور ایک زمانے میں ساری دنیا کی فکری اور سیاسی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی لیکن اب وہ بہت پستی کی حالت میں ہیں۔ اور سلطنت عثمانیہ میں ان کی حیثیت ترکوں کے مساوی نہیں بلکہ ثانوی ہے اور ان کی زبان کو وہ مقام حاصل نہیں جو کسی زمانے میں حاصل تھا۔ اسی زمانے میں محمد علی پاشا اور اس کے جانشینوں نے جو مصر کے نیم خود مختار والی تھے مصر کو ایک جدید مملکت بنانے کی بڑی کامیاب کوشش کی۔ محمد علی پاشا نے مصری فوجوں کو منظم کر کے ترکوں کو مسلسل شکستیں دیں، مصر کو معاشی خوشحالی کی راہ پر ڈالا اور عربی زبان میں مغربی زبانوں سے جدید علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ ان کامیاب کوششوں نے عربوں میں بجا طور پر یہ احساس پیدا کر دیا کہ اگر وہ اپنی قسمت کے مالک خود ہوں تو وہ ایک بار پھر قدیم عظمت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس احساس نے عربوں میں اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور اس طرح عربوں میں قومی تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ قومی تحریک اپنی ابتدائی شکل میں جارحانہ قوم پرستی کی تحریک نہیں تھی اور اس کا اسلام سے تعلق بھی بڑا مضبوط تھا۔ اس لیے قوم پرستی کے اس جذبہ کو غلط اور ناجائز بھی نہیں کہا جا سکتا۔

یورپ میں اسی جذبہ کے تحت نشاۃ ثانیہ کے بعد سے یعنی پندرھویں صدی سے وطنی بنیاد پر قومیں وجود میں آنا شروع ہو گئی تھیں اور اس طرح وطن پرستی اور قوم پرستی کا وہ جذبہ پیدا ہوا جو یورپ کی سب سے بڑی قوت محرکہ بن گیا اور اس نے ایک مستقل سیاسی فلسفہ اور سیاسی فکر کی شکل اختیار کر لی۔ یورپ میں قوم پرستی کے نظریہ کو اپنانے کے کچھ مفید نتائج بھی نکلے۔ اس کی وجہ سے قوموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور یورپ کا چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا۔ یہ ویسا ہی عمل تھا جیسا اندلس میں قرطبہ کی مرکزی حکومت کے خاتمہ کے بعد اور ہندوستان میں سلطنت دہلی کے زوال کے بعد شروع ہوا تھا۔ قرطبہ اور دہلی کی مرکزیت ختم ہوئی تو اندلس میں اشبیلیہ، غرناطہ، طلیطلہ کے اور ہندوستان میں جونپور، احمد آباد، ٹھٹھہ، برہانپور، گلبرگہ، بیدر، بیجاپور اور گولکنڈہ کے نئے سیاسی مرکز قائم ہو گئے جس کی وجہ سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون قرطبہ اور دہلی تک محدود نہیں رہے بلکہ ملک کے گوشے گوشے میں

پھیل گئے۔ چنانچہ یورپ میں وطن پرستی کے اس جذبہ کے تحت جو درخشاں کامیابیاں حاصل ہوئیں ان سے انیسویں صدی کے مسلمان مفکرین بہت متاثر ہوئے۔

وطن پرستی کے اس مغربی تصور کو مسلمانوں میں عام کرنے میں ان مغربی مصنفین اور محققین نے اہم کردار ادا کیا جن کو مستشرقین کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کچھ تو تحقیق کے جذبے کے تحت لیکن زیادہ تر اپنے اپنے قومی مفادات کے تحت عربوں، ترکوں اور ایرانیوں کی قدیم تاریخ پر تحقیق کی اور ان کو عظمت رفتہ کا احساس دلایا۔ عربوں میں خصوصاً افکار کو عام کرنے میں شام و مصر کی عربی النسل عیسائی آبادی نے خصوصی کردار ادا کیا۔ ان عرب عیسائیوں نے یورپ کے تبلیغی اداروں کے قائم کردہ مشن اسکولوں میں تعلیم پائی تھی اور ان کا طرز عمل مسلمانوں کی طرح یورپ کے مقابلہ میں معاندانہ نہیں تھا بلکہ دوستانہ تھا۔ ان عیسائی باشندوں کو اتحاد اسلام کے تصور سے بھی دلچسپی نہیں تھی اور خلافت عثمانیہ سے وفاداری ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لہٰذا وطنیت کے ایک ایسے تصور میں ان کے لیے بڑی کشش تھی جس میں مذہب کو اہمیت حاصل نہ ہو بلکہ مذہب کو سیاست سے بے دخل کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں میں وطن پرستی کے سب سے پرجوش اور اولین علمبردار شام و لبنان کے یہی عیسائی باشندے تھے۔ ناصیف یازجی (۱۸۰۰ء تا ۱۸۷۱ء) بطرس بستانی (۱۸۱۹ء تا ۱۸۸۳ء) اور ابراہیم یازجی (۱۸۴۷ء تا ۱۹۰۶ء) ان عیسائی وطن پرستوں کے سرخیل تھے۔ ان کی کوششوں سے شام میں ۱۸۴۷ء میں سوسائٹی آف آرٹس اینڈ سائنس اور ۱۸۵۰ء میں اورنیٹل سوسائٹی قائم ہوئیں جن کا مقصد عرب قوم پرستی کا فروغ تھا۔ یہ دونوں خالص مسیحی ادارے تھے۔ لیکن عربوں میں قوم پرستی کا تصور اس وقت تک فروغ نہیں پا سکتا تھا جب تک مسلمان بھی اس کو اپنا نہ لیتے۔ اس لیے ۱۸۵۷ء میں ان عیسائیوں نے الجامعہ العلمیہ السعودیہ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس میں پہلی مرتبہ عرب مسلمان بھی شامل کیے گئے۔[1] اس تنظیم کے بعض ارکان نے خفیہ اجلاس بھی کیا جسے عربوں کی قومی تحریک کا آغاز

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: "عربوں کی بیداری" از جارج انٹونیس (انگریزی) "مشرق وسطیٰ کا بحران از غلام محمد (انگریزی) اور عرب دنیا از محمود حسین۔ ان کے علاوہ فلپ حتی کی تاریخ شام اور تاریخ لبنان کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ اگرچہ ان کتابوں میں قبل از اسلام کی تاریخ پر زور دیا گیا ہے لیکن ان ملکوں میں انیسویں صدی کی سیاسی بیداری سے متعلق بھی مفید معلومات ہیں۔ تاریخ شام کا اردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے۔

سمجھا جاتا ہے۔ اس اجلاس میں ناصیف بازجی نے پہلی مرتبہ ایک نظم لکھی جس میں عرب وطن پرستی کے جذبے سے اپیل کی گئی اور عرب نسل اور عرب تاریخ پر فخر کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی ترکوں کا جوا اپنے شانوں سے اتار پھینکنے کی اپیل کی گئی تھی۔

عربوں اور ترکوں میں قوم پرستی کے تصور کو مقبول بنانے میں یہودیوں کی فری میسن تحریک کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یورپ کی حکومتیں خلافت عثمانیہ کی دشمن تھیں اور اس کو پارہ پارہ کرنا چاہتی تھیں اس لیے انھوں نے فری میسن تحریک کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ استنبول میں پہلا فری میسن لاج ۱۸۵۷ء میں برطانوی سفیر نے قائم کیا، اگلے سال دوسرا لاج فرانسیسی سفیر نے قائم کیا۔ اس کے بعد سالونیکا اور عثمانی سلطنت کے دوسرے شہروں میں بھی لاج قائم کیے گئے۔ [۱] رشید پاشا، خدیو پاشا اور عالی پاشا جو سلطنت عثمانیہ کے وزیر اعظم تھے فری میسن لاج کے اولین ممبروں میں سے تھے۔ بعد میں منیف پاشا اور احمد مدحت پاشا کے نام بھی نظر آتے ہیں حتیٰ کہ نامق کمال، ضیاء پاشا اور احمد وافق پاشا جیسے محب وطن اور محب اسلام افراد بھی استنبول کے ارمنی فری میسن لاج میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ تقریباً اسی زمانہ میں شام و لبنان میں بھی فری میسن لاج قائم ہوئے اور الجامعہ السعودیہ کے عرب قوم پرستوں نے اپنی قومی تحریک کے فروغ میں ان سے مدد حاصل کی۔ [۲]

فری میسن تحریک کی بنیاد لادینیت (سیکولرازم) پر تھی اور اس کا مقصد ایسے کلچر کو فروغ دینا تھا جو مسلمانوں کو مذہب سے دور پہنچائے۔ فری میسن تحریک کے علمبردار مذہب کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے اصلی عزائم کو چھپا کر حریت، مساوات اور عدالت کے دلکش نعروں کے ذریعہ عربوں اور ترکوں میں مقبولیت حاصل کی۔ ضیا گوک الپ نے لکھا ہے کہ اسلامی دنیا میں قوم پرستی کے تصور کو سب سے پہلے عربوں اور البانوی باشندوں نے داخل کیا۔ عربوں میں اس کا آغاز عبداللہ ندیم (۱۸۵۴ء تا ۱۸۸۶ء) نے کیا اور البانوی مسلمانوں میں اس کا آغاز نعیم بیگ فراشری نے کیا۔ [۳] ضیا گوک الپ کا کہنا ہے کہ ترکوں میں قوم پرستی کا تصور

---

(۱) برنرڈلیوس: جدید ترکی کا ظہور (انگریزی) ص ۲۰۷ ـ ۲۰۸ (حاشیہ)

(۲) عربوں کی بیداری (انگریزی) از جارج انٹونیس اور مشرق وسطی کا بحران (انگریزی) از غلام محمد۔

(۳) ضیا گوک الپ: ترک لشمک، اسلام لشمق، معاصر لشمق ص ۴۵۔

البانوی اور عرب قوم پرستی کے ردعمل کے طور پر شروع ہوا۔ ضیا گوک الپ کا یہ دعویٰ ممکن ہے کسی حد تک درست ہو لیکن جیسا کہ وضاحت کی جا چکی ہے مسلمانوں میں قوم پرستی کا تصور مغربی افکار کے زیر اثر تقریباً ایک ہی زمانہ میں داخل ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا اظہار کسی قوم میں چند سال آگے پیچھے ہوا ہو۔ لیکن یہ جذبہ اندر ہی اندر تمام قوموں میں کام کر رہا تھا۔ اور صرف اپنے اظہار کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

مسلمانوں کو اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں بھی غیر اسلامی افکار کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کو دنیا میں سیاسی غلبہ حاصل تھا، ان کی فکری اور تخلیقی قوتیں عروج پر تھیں، تقلید نے ان کے ذہنوں کو زنگ آلود نہیں کیا تھا اور دینی جذبہ کمزور نہیں پڑا تھا۔ لیکن اب جب ان کو انیسویں صدی میں مغربی افکار سے سابقہ پڑا وہ سیاسی اور فکری میدانوں میں زوال پذیر تھے اور مغربی قوتیں ہر لحاظ سے عروج پر تھیں۔ اسلام اب ایک روایتی مذہب بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا انقلابی پیغام جو قرن اول میں تخلیقی قوتوں کے لیے محرک تھا بڑی حد تک فراموش کر دیا گیا تھا۔ ملوکیت کے نظام کے تحت اسلام کے سیاسی اور اجتماعی تصورات بے جان ہو چکے تھے وفاداریاں اب اسلام سے نہیں حکمران خاندانوں سے وابستہ تھیں۔ ایسی حالت میں کہ جب مسلمان اسلام کی قوت محرکہ سے محروم ہو چکے تھے۔ اور مسلمانوں کی فکر میں جمود پیدا ہو گیا تھا مسلمان اس قابل نہیں رہے تھے کہ وہ اپنے مسائل اسلام کے سیاسی اور اجتماعی تصور کے تحت حل کر سکیں، ان کے فکری خلا کو مغربی قوموں کے افکار نے پورا کیا جو تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھیں اور مسلمانوں پر اپنی برتری ثابت کر رہی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے وطن پرستی اور قوم پرستی کے نظریہ کو بھی بغیر کسی تنقید کے اپنا لیا۔

موجودہ دور کے ایک عظیم مسلمان مفکر نے لکھا ہے کہ:

''جس مسلمان نے بھی نیشنلزم کے شیطان سے بیعت کی اسلام کے فرشتوں سے اس کا رخصتی مصافحہ ہو گیا''[1]

چنانچہ جیسے جیسے قومیت کا تصور مسلمان اقوام میں قوت پکڑتا گیا اسلام کا رشتہ ان میں کمزور

(1) سید ابوالاعلیٰ مودودی: مسئلہ قومیت۔

ہوتا گیا۔ ہر قوم نے قبل از اسلام کے عہد جاہلیت کی طرف رجعت کی۔ مصریوں نے نحن آل فرعون کا نعرہ لگایا، عربوں نے عہد جاہلیت کے تعصّبات کو زندہ کیا، ترکوں نے اپنے خرافاتی دور کا رخ کر کے بوز کرت یعنی بھورے بھیڑیے کو اپنی عظمت کی علامت قرار دیا اور ایرانیوں نے کیانی شہنشاہوں کے افسانوی دور پر فخر کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ امت مسلمہ جس میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا گیا تھا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی جو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے۔

قوم پرستی نے ترکوں اور عربوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا اور یہ دشمنی اس حد تک بڑھی کہ عبدالرحمن کواکبی جیسے دیندار شامی رہنما نے کھل کر عرب نسل پر فخر کا اظہار کیا اور ترکوں سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ:

''کاش ترک قومیں اسلام قبول نہ کرتیں کیونکہ ترکوں نے مسلمان ہو کر اسلام کو بگاڑ دیا''[1]

پہلی عالمی جنگ کے دوران عربوں نے عثمانی سلطنت کے خلاف جو بغاوت کی اس کا ذمہ دار صرف عربوں کو قرار دینا بھی صحیح نہیں۔ اس کی ذمہ داری ان ترک قوم پرستوں پر بھی عائد ہوتی ہے جنھوں نے اسلام کی بجائے مغربی نظریات کو قبول کیا اور ترک قوم پرستی کی تحریک کو ہوا دی۔ ترک یہ کہہ کر کہ قوم پرستی کے فتنہ کو سب سے پہلے عربوں یا البانوی مسلمانوں نے شروع کیا اپنی اسلامی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترک قوم پرستوں کا ایک گروہ عربوں کو مساوی حیثیت نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ ترکوں کی بالادستی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ ترک قوم پرست اگر اسلام کا نام لیتے تھے تو اس لیے کہ وہ اپنی قومی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے اسلام کو ایک آلے کے طور پر استعمال کریں۔ اسلام کی برتری اور بالادستی نہ حاکم ترکوں کا مقصود تھی اور نہ عرب قوم پرستوں کا۔ حقیقت میں اسلام کا سیاسی شعور کسی قوم میں بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چند لوگ جنھوں نے اسلام کی بنیاد پر کام کرنا چاہا کامیاب نہ ہو سکے۔ اسلام کو بالادستی کا مقام دینے میں ترکوں اور عربوں کی ناکامی اسلامی اتحاد کی شکست کا باعث بنی۔

دسمبر ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالحمید نے ترک حریت پسندوں کے دباؤ کے تحت عثمانی

---

(۱) تین مصلح (انگریزی) از خلدون الحصری ص ۸۹۔

پارلیمنٹ [1] قائم کر کے اتحاد کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا۔ تمام رعایا کو بلا امتیاز مذہب و دولت یکساں حقوق دیے گئے۔ پارلیمنٹ میں تمام اقوام کو نمائندگی دی گئی اور حکومت کے عہدے سب کے لیے یکساں طور پر کھول دیے گئے۔ لیکن ۱۸۷۸ء کے آغاز میں جب دستور منسوخ کر دیا گیا اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی تو بداعتمادی کی فضا پیدا ہوگئی اور اگرچہ اس کے ذمہ دار ترک حریت پسند نہیں تھے اور یہ صرف ایک مستبد حکمران کا اقدام تھا لیکن عربوں نے اس کا مطلب یہی لیا کہ ترک ان کو حقوق نہیں دینا چاہتے۔ اس کے بعد قومی تعصب کا زہر تیزی سے پھیل گیا اور اسلام پسند عناصر جو پہلے ہی کمزور تھے قوم پرستی کے اس سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ سلطان عبدالحمید نے عربوں کو بہت سی مراعات دیں۔ ان کو حکومت میں اعلیٰ عہدے سپرد کیے گئے۔ فوجوں میں بھرتی کیا گیا، عراق، شام اور حجاز کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی۔ عرب صوبوں میں مدرسے قائم کیے گئے۔ دمشق اور مدینہ کے درمیان نوسو میل لمبی حجاز ریلوے تعمیر کی گئی اور بغداد ریلوے کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ حجاز ریلوے کی تعمیر کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ کتنا مشکل کام تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگ عظیم اول میں جب عرب باغیوں نے حجاز ریلوے کی پٹری اکھاڑ دی تو یہ ریلوے لائن ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی اب تک عربوں سے تعمیر نہیں ہو سکی ہے۔

تعمیر و ترقی کے یہ کام بہرحال عربوں کو سلطنت عثمانیہ کا وفادار نہیں بنا سکے کیونکہ حکومت میں سیاسی نمائندگی نہ ہونے کی وجہ سے ان میں احساس محرومی پیدا ہو گیا تھا۔ اگر سلطان عبدالحمید ۱۸۷۶ء کا آئین منسوخ نہ کر دیتے تو شاید ترکوں اور عربوں کے اتحاد کی کوئی راہ نکل آتی۔ آئین کو منسوخ کر کے سلطان نے نہ صرف قوم پرست اور حریت پسند ترکوں کو اپنا مخالف بنا لیا بلکہ عربوں کو بھی مایوس کر دیا۔ عربوں میں اب تشدد کی طرف رجحان بڑھتا جا رہا تھا۔ غیر مسلم عناصر اور مغربی حکومتیں اپنی سازشوں کے ذریعہ اس رجحان کو ہوا دے رہی تھیں۔

۱۹۰۸ء میں جب سلطان عبدالحمید نے تیس سال بعد آئین بحال کیا تو حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ عہد تنظیمات کے ترک رہنما اتحاد اسلام اور اتحاد عثمانی کے جذبہ سے سرشار تھے

---

[1] دسمبر ۱۸۷۶ء میں آئین کا اعلان کیا گیا تھا اور مارچ ۱۸۷۷ء میں اس کے تحت پہلی پارلیمنٹ قائم کی گئی تھی۔

اور ان پر مغربی اثرات اور فری میسن تحریک کے اثرات بھی نسبتاً کم تھے، لیکن نوجوان ترک جو ۱۹۰۸ء کا انقلاب لائے ان کی اکثریت کٹر قوم پرست تھی۔ اسلام کے اثرات ان پر بہت کمزور تھے اور ان کی بیشتر تعداد فری میسن تھی اور ان کی تنظیم اتحاد و ترقی میں یہودی اور دونمہ[1] مسلمان بھرے ہوئے تھے، جو ظاہر ہے کہ عربوں اور ترکوں میں اتحاد پیدا کر کے سلطنت عثمانیہ کو مضبوط نہیں بنا سکتے تھے۔

آئین کی بحالی کا عربوں کی طرف سے پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن دونوں طرف سے قوم پرستانہ رجحانات نے آئین کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ عربوں نے جگہ جگہ خفیہ انجمنیں قائم کر رکھی تھیں جن میں عیسائی ارکان مسلمانوں سے زیادہ سرگرم تھے۔ ۱۹۰۴ء میں ایک لبنانی عیسائی نجیب آزوری نے عراق اور شام کو عثمانی سلطنت سے الگ کرنے کے لیے پیرس میں ایک خفیہ تنظیم قائم کر لی تھی اور جب جنگ عظیم اول چھڑی تو حجاز کے عثمانی والی شریف حسین اور اس کے بیٹے فیصل کی قیادت میں انگریزوں سے مل کر بغاوت کی سازش کی گئی۔ مغربی ملکوں نے اس موقع پر بدترین دھوکہ بازی سے کام لیا۔ ایک طرف تو انگریزوں نے عربوں کو آزادی دینے کا وعدہ کر لیا اور دوسری طرف فرانس اور روس سے مل کر عرب علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے اور اس کو یہودیوں کا وطن بنانے کے لیے صیہونی رہنماؤں سے وعدہ بھی کر لیا۔

اس دوران میں عربوں میں اعتدال پسند اور اسلام پسند عناصر نے آخر وقت تک ترکوں سے تصفیہ کرنے کی کوشش کی اور پیرس میں عربوں اور ترکوں کے نمائندوں کے درمیان تصفیہ بھی ہو گیا، لیکن قوم پرست ترکوں کا اعتماد اب عرب قوم پرستوں پر سے اٹھ چکا تھا اس لیے انھوں نے تصفیہ کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جون ۱۹۱۶ء میں حجاز سے بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ شام کے عثمانی والی جمال پاشا نے بیروت اور دمشق میں سفارت خانوں سے سازش کے کاغذات پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن وہ سازشیوں کی طرف سے چشم پوشی کر گئے، لیکن جب عربوں کی بغاوت کا زور بڑھ گیا اور مصر کی طرف سے انگریزوں نے فلسطین پر حملہ شروع کر دیا تو جمال پاشا نے ان عرب

---

(۱) دونمہ ترکی میں ان مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جو یہودی النسل تھے اور در پردہ اپنے قدیم عقائد پر قائم رہتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اردو دائرہ المعارف لاہور مقالہ دونمہ۔

رہنماؤں کو جو بغاوت میں ملوث پائے گئے بڑی تعداد میں پھانسی دے دی۔ بعض مورخین نے اس واقعہ کو جمال پاشا کا ظالمانہ فعل قرار دیا ہے۔ لیکن ایک ایسے وقت میں جبکہ خلافت عثمانیہ چاروں طرف سے خطرے میں گھری ہوئی تھی اور دشمن اس پر حملہ آور تھا۔ دشمن سے سازش کر کے غداری کرنے والوں کو پھانسی دینا کس طرح ظالمانہ فعل کہا جاسکتا ہے۔ کیا سازشیوں کو معاف کر دینے سے عربوں کی بغاوت ختم ہو جاتی؟ اب معاملہ تصفیہ کی حدود سے باہر نکل چکا تھا۔ اگر عرب قوم پرستوں کے نقطۂ نظر میں بغاوت جائز تھی تو ترک قوم پرستوں کے نقطۂ نظر سے اس کو سختی سے کچلنا جائز اور بجا تھا۔ دراصل قوم پرستی کے تصور اور مغربی افکار نے دو بڑی مسلمان قوموں کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں تصادم ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس تصادم میں حق و باطل اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ کسی ایک فریق پر ساری ذمہ داری ڈالنا یا الزام لگانا صحیح نہیں۔ ایک مسلمان صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ یہ جاہلیت کا تصادم تھا اور افسوس ناک تھا۔ عرب دنیا سے باہر باقی اسلامی دنیا میں اس تصادم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور عربوں کی بغاوت کو غداری ہی تصور کیا گیا۔

عرب سلطنت عثمانیہ سے بغاوت اور اس کے خلاف انگریزوں اور فرانسیسیوں سے سازش کرنے کی سزا ابھی تک بھگت رہے ہیں۔ عرب قوم پرست ایشیا میں ایک متحدہ عرب ریاست قائم کرنا چاہتے تھے، لیکن مغربی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا انگریز اور فرانسیسی دونوں عربوں سے کیے ہوئے وعدوں سے پھر گئے۔ صرف حجاز کو آزادی مل سکی۔ عراق، شام، فلسطین، اردن اور جنوبی یمن پر کئی سال تک فرانس اور برطانیہ کا قبضہ رہا اور جب ان ملکوں کو آزادی دی تو فلسطین کو یہودیوں کے سپرد کر دیا گیا اور اس طرح صیہونیوں کی وہ سازش کامیاب ہوگئی جس کو سلطان عبدالحمید نے اپنے عہد میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ اسرائیل کا وجود دنیائے عرب کے لیے ایک ایسا ناسور بن چکا ہے جس سے نجات پانے کا کوئی راستہ مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا۔

اس وقت عرب دنیا ذیل کی جن بائیس سیاسی وحدتوں میں تقسیم ہے ان میں سوائے مراکش اور موریطانیہ کے تمام ملک کسی نہ کسی زمانے میں سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ تھے۔

(الف) زرخیز ہلال

ملک	رقبہ (مربع میل)	آبادی (۱۹۷۸ء)
۱۔عراق	ایک لاکھ ۶۸ ہزار	ایک کروڑ بیس لاکھ
۲۔شام	۷۱ ہزار	۷۸ لاکھ
۳۔لبنان	۴ ہزار	۳۳ لاکھ
۴۔اردن	۳۵ ہزار	۲۸ لاکھ
۵۔فلسطین	دس ہزار	۳۶ لاکھ
	۲ لاکھ ۸۸ ہزار	۲ کروڑ ۹۵ لاکھ

(ب) جزیرۃ العرب

۶۔سعودی عرب	۹ لاکھ ۷۲ ہزار	۹۷ لاکھ
۷۔یمن (شمالی)	۷۵ ہزار	۷۰ لاکھ
۸۔جنوبی یمن	ایک لاکھ دس ہزار	۱۸ لاکھ
۹۔کویت	۹ ہزار	۱۱ لاکھ
۱۰۔متحدہ عرب امارات	۳۲ ہزار	۷ لاکھ
۱۱۔بحرین	۲۳۱	۳ لاکھ
۱۲۔قطر	چار ہزار	۲ لاکھ
۱۳۔عمان	۸۲ ہزار	ایک کروڑ ۹۸ لاکھ
	۱۲ لاکھ ۹۳ ہزار	ایک کروڑ ۹۸ لاکھ

(ج) افریقہ

ملک	رقبہ (مربع میل)	آبادی (۱۹۷۸ء)
۱۴۔ مصر	۳لاکھ۸۶ہزار	۳ کروڑ۸۹لاکھ
۱۵۔ سوڈان	۹لاکھ۶۷ہزار	ایک کروڑ۶۸لاکھ
۱۶۔ لیبیا	۶لاکھ۹۷ہزار	۲۶لاکھ
۱۷۔ تونس	۶۳ہزار	۶۰لاکھ
۱۸۔ الجزائر	۹لاکھ۱۹ہزار	ایک کروڑ۸۰لاکھ
۱۹۔ مراکش	۲لاکھ۴۷ہزار	ایک کروڑ۸۲لاکھ
۲۰۔ موریطانیہ	۳لاکھ۹۷ہزار	پندرہ لاکھ
۲۱۔ صومالیہ	۲لاکھ۶۴ہزار	۳۴لاکھ
۲۲۔ جیبوتی	۸ہزار	۳لاکھ
	۳۹لاکھ۹۳ہزار	۳لاکھ
(الف)	۲لاکھ۸۸ہزار	دوکروڑ۹۵لاکھ
(ب)	۱۲لاکھ۹۳ہزار	ایک کروڑ۹۸لاکھ
(ج)	۳۹لاکھ۹۳ہزار	دس کروڑ۷۵لاکھ
مجموعی میزان	۵۴لاکھ۶۶ہزار	½15 کروڑ

باب ١٧

دجلہ اور فرات کی وادی کا نیا دور

تاریخی پس منظر

عربوں کے دور عروج میں دجلہ وفرات کی وادی یعنی عراق عرب اسلامی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کے سب سے بڑے مرکزوں میں سے ایک تھا۔ غیر زبانوں سے عربی میں کتابوں کے ترجمے کے کام کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا۔ اسلامی فقہ کی نشوونما یہیں ہوئی، عربی زبان کے قواعد وضوابط یہیں مرتب ہوئے، علم وحکمت کی ہر شاخ پر تخلیقی کتابیں جن علماء نے لکھیں وہ یا تو اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے یا انھوں نے اپنی کتابیں یہاں مکمل کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے دور عروج اور اسلامی تاریخ کے پہلے چھ سو سالوں میں اہل علم، ادیب، مفکر اور مصنف جس کثرت سے عراق میں پیدا ہوئے اس کی مثال صرف اسلامی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی کم ملے گی۔ بغداد، بصرہ اور کوفہ نہ صرف علم وفن کے مرکز تھے بلکہ تہذیب وتمدن، ثقافت اور صنعت و حرفت کے بھی بڑے مرکز تھے اور اپنے زمانے میں دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار ہوتے تھے۔ عراق کی تاریخ کا یہ دور زریں جس کا آغاز اسلام کی آمد سے ہوا تھا ٦٥٦ھ ١٢٥٨ء میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی، عباسی خلافت کے خاتمے اور عراق پر منگولوں کے تسلط کے بعد ختم ہوگیا۔ اندلس، ایران اور ترکستان کی طرح عراق بھی ان ملکوں میں سے ہے جو ابھی تک اپنے ماضی کی عظمت کو حاصل نہیں کر سکے۔

خلافت عباسیہ کے خاتمہ کے بعد عراق کچھ مدت منگولوں کے ایل خانی خاندان کے تسلط میں رہا جس کا مرکز ایران میں تھا۔ ١٣٤٠ء سے ١٤١٠ء تک ایک اور منگول خاندان جو جلائر کہلاتا ہے عراق پر حکمران رہا۔ اس کے بعد دو ترک خاندانوں قراقویونلو (١٤١٠ء تا ١٤٦٩ء) اور آق قویونلو (١٤٦٩ء تا ١٥٠٨ء) نے عراق پر حکومت کی جن کے صدر مقام آذربائیجان اور اناطولیہ میں تھے۔ ١٥٠٨ء سے ١٥٣٤ء تک عراق، ایران کی صفوی سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ ١٥٣٤ء

میں عثمانی ترکوں نے صفویوں کو بیدخل کر دیا اور ۱۶۲۳ء تا ۱۶۳۸ء کے مختصر سے وقفہ کے علاوہ جس میں صفوی دوسری مرتبہ عراق پر قابض ہو گئے تھے۔ عراق تقریباً چار سو سال تک سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ رہا۔ جنگِ عظیم اول کے خاتمہ پر ۱۹۱۸ء میں عراق پر انگریزوں نے قبضہ کر کے عثمانی ترکوں کی حکومت ختم کر دی۔

سقوط بغداد کے بعد منگولوں کے چند ابتدائی حکمرانوں کو چھوڑ کر جو غیر مسلم تھے عراق پر مسلمان قوموں ہی کی حکومت رہی۔ لیکن ان حکومتوں کے زمانے میں عراق کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ دجلہ و فرات کی اس وادی کا بے مثل نظام آبپاشی نظام برباد ہو گیا اور علم و فن کے سوتے خشک ہو گئے۔ ایران کی طرح عراق کے گوشہ چھ سو سال کی تاریخ پر بھی جب ایک مورخ نظر ڈالتا ہے تو یہ دیکھ کر اس کو حیرت ہوتی ہے کہ جس خطے کے عالموں اور مفکروں نے پانچ سو سال تک دنیا کی رہنمائی کی وہ خطہ کس طرح ذہین افراد کے لیے ایک بنجر زمین میں تبدیل ہو گیا۔

عراق کے اس تمدنی زوال کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سقوط بغداد کے بعد یہاں کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی منگول حملے کے دوران سارے شہر کھنڈروں میں تبدیل کر دیے گئے تھے اور نظام آبپاشی برباد ہو گیا تھا۔ علمی ادارے، مسجدیں، کتب خانے اور مدرسے سب تباہ کر دیے گئے تھے۔ پھر ایل خانی منگول حکومت کے بعد یہاں ترکمانوں کی جو حکومتیں قائم ہوئیں ان کی کوئی اعلیٰ تہذیبی روایات نہیں تھیں۔ پھر ان حکومتوں کو صحیح معنوں میں استحکام بھی حاصل نہ ہوا۔ ان کا بیشتر وقت آپس کی خانہ جنگیوں اور تیموریوں کے حملوں کی روک تھام میں صرف ہوا۔ آخر میں جب عثمانی سلطنت کے تحت سیاسی استحکام حاصل ہوا تو تجارت کی وہ بین الاقوامی شاہراہ جو مشرقی بحیرہ روم کو ہندوستان اور مشرق کے دوسرے ملکوں سے ملاتی تھی یورپ سے مشرق کو ملانے والے بحری راستہ کی دریافت کے بعد ویران ہو گئی جس کی وجہ سے مصر، شام اور ایران کی طرح عراق کی خوشحالی بھی متاثر ہوئی۔ ان اسباب کے علاوہ عراق پر عثمانی حکومت کی کمزوری بھی زوال کا ایک بڑا سبب تھی۔ قبائل بے قابو رہے اور نظام آبپاشی بحال نہ ہو سکا۔ اس دور میں عراق کو ایران اور ترکی کی باہمی جنگوں سے بھی نقصان پہنچا جن کا مرکز عراق ہوتا تھا کیونکہ ایران کی صفوی حکومت کربلا اور دوسرے مقدس شیعی مقامات پر ہر صورت میں اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتی تھی دارالخلافہ استنبول سے دور ہونے کی وجہ سے عراق کے عثمانی والی بھی بڑی حد تک مرکز کی گرفت سے آزاد

رہتے تھے۔ انیسویں صدی میں جب عثمانی حکومت نے ان کمزوریوں کی طرف توجہ دی تو عراق کی تاریخ کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ ۱۸۳۱ء میں عراق کو براہ راست استنبول کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ قبائل کی خود مختاری ختم کر دی گئی اور جدید اصلاحات کا آغاز ہوا۔ سلطان عبدالحمید ثانی کے دور میں عراق میں کئی ترقیاتی کام انجام دیے گئے۔ مواصلات کا جدید نظام قائم ہوا۔ بغداد ریلوے کی تعمیر شروع ہوئی اور چھاپے خانے قائم ہوئے۔ مدحت پاشا کا دور ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۲ء تک عراق کے والی رہے۔ اس لحاظ سے اہم ہے۔ کہ اس زمانے میں زرعی اصلاحات بھی کی گئیں۔ مشروطیت کے بعد اصلاحات کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ عثمانی پارلیمنٹ میں عراق کے باشندوں کو نمائندگی ملی، ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان سامرہ اور بغداد کے درمیان ریلوے لائن مکمل ہوئی۔ اصلاح وترقی کا یہ کام جاری تھا کہ جنگ عظیم چھڑ گئی۔

عراق پر برطانوی تسلط

شام کے مقابلہ میں عراق میں عرب قوم پرستی کا اثر کم تھا، لیکن عراقی باشندے عربوں کی قومی تحریک سے بے تعلق بھی نہیں تھے۔ عثمانی دور کے ممتاز عراقی شاعر معروف الرصافی اور جمیل الزہاوی نے ان میں معاشرتی اصلاح اور دستوری حکومت کی خواہش پیدا کی۔ نجف کے مدرسوں نے جو شیعیت کے بڑے دینی مرکز تھے طلبہ کے اندر قوم پرستانہ جذبہ پیدا کیا جس نے بتدریج سلطنت عثمانیہ سے الگ ہونے کی راہ ہموار کی۔ مشروطی یا دستوری نظام قائم ہو جانے کے بعد علیحدگی کی تحریک نے اور زور پکڑ لیا۔ اور ترکی فوج میں جو عراقی افسر تھے وہ ''العہد'' نامی خفیہ انجمن میں شریک ہوئے جو سلطنت عثمانیہ کے عرب علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے استنبول میں قائم کی گئی تھی اور جس کی شاخیں بصرہ، بغداد اور موصل میں تھیں۔ ۱۹۱۶ء میں جب عربوں کی بغاوت شروع ہوئی تو یہ عراقی فوجی افسر اس میں پیش پیش تھے۔ سعید نوری پاشا جو بعد میں عراق کے وزیر اعظم ہوئے عثمانی فوج کے ان ہی عراقی افسروں میں سے ایک تھے۔ انگریزی فوجوں نے ۲۲۔ نومبر ۱۹۱۴ء کو بصرہ پر قبضہ کر لیا اور بغداد کی طرف پیش قدمی شروع کر دی لیکن ۲۹۔ اپریل ۱۹۱۶ء کو ترک فوجوں نے انگریزوں کو کوت العمارہ کی جنگ میں شکست فاش دے کر پسپائی پر مجبور کر دیا۔ لیکن اسی سال کے اختتام تک انگریزوں نے دوسرا بڑا حملہ شروع کر دیا۔ ۱۱۔ مارچ ۱۹۱۷ء کو

بغداد پر قبضہ کرلیا اور ڈیڑھ سال بعد جنگ کے آخری مرحلہ پر ۴۔نومبر ۱۹۱۸ء کو موصل پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح انگریز پورے عراق پر قابض ہو گئے۔

عربوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف انگریزوں کی مدد آزادی کی امید میں کی تھی جس کا انگریزی حکومت نے وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۰ء میں جب دمشق میں شریف حسین کے بیٹے فیصل کو شام کا بادشاہ بنایا گیا تو عراقی رہنماؤں نے اسی موقع پر شریف حسین کے دوسرے بیٹے عبداللہ کو عراق کا حکمران منتخب کرلیا۔ لیکن برطانیہ نے اس انتخاب کو تسلیم نہیں کیا اور عربوں سے وعدہ خلافی کر کے عراق کو براہ راست اپنے انتظام میں لے لیا۔ برطانیہ کی اس وعدہ خلافی پر جون ۱۹۲۰ء میں عراق میں بغاوت ہوگئی، جس میں قبائلی باشندوں نے نمایاں حصہ لیا۔ بغاوت کئی ماہ جاری رہی اور اس میں چار ہزار عرب شہید ہوگئے اگرچہ انگریزوں نے فوجی طاقت کے بل پر بغاوت کچل دی لیکن عربوں کی بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ آخر کار انگریز ۲۳۔ اگست ۱۹۲۱ء کو فیصل کو عراق کا حکمران مقرر کرنے اور عراق کی قومی مجلس قائم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن فیصل کی یہ بادشاہت صرف نام کی تھی عراق کا حقیقی سربراہ اب بھی برطانوی ہائی کمشنر تھا۔ چنانچہ ملک میں مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے تحریکیں چلتی رہیں جن کے دباؤ کے تحت انگریز اپنے اختیارات بتدریج عراقی حکومت کو منتقل کرتے رہے اور ۳۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو انھوں نے اپنے چند مفادات کے تحفظ کے ساتھ عراق کی مکمل آزادی تسلیم کرلی اور عراق جمعیت اقوام[1] کا رکن منتخب ہو گیا۔

آزادی کے بعد

عراق کے پہلے حکمران شاہ فیصل (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۳ء) جنھوں نے ربوں کی تحریک آزادی میں بڑی بیدار مغزی سے حصہ لیا تھا۔ شریف حسین کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مشروطی حکومت قائم ہونے کے بعد وہ جدہ سے عثمانی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران انھوں نے ایک طرف برطانوی

---

(۱) جمعیت اقوام (league of nations) دنیا میں امن قائم رکھنے کی غرض سے پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۰۔ جنوری ۱۹۲۰ء کو قائم کی گئی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کو روکنے میں ناکامی کے بعد ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اقوام متحدہ کے نام سے نئی بین الاقوامی تنظیم قائم کی گئی اور جمعیت اقوام کو ۱۰۔ جنوری ۱۹۴۶ء کو توڑ دیا گیا۔ جمعیت اقوام کا دفتر جنیوا (سوئٹزر لینڈ) میں تھا جبکہ اقوام متحدہ کا دفتر نیویارک میں ہے۔

حکومت سے خفیہ مراسلت جاری رکھی اور دوسری طرف وہ ترکوں کو اپنی وفاداری کا یقین بھی دلاتے رہے۔ انھوں نے عثمانی حکومت کی امداد کے نام پر جو رضا کار دستے منظم کیے تھے وہ بغاوت شروع ہونے پر انگریزوں سے مل گئے اور ایک ایسے نازک موقع پر جب انگریز مصر کی طرف سے فلسطین پر حملہ آور ہوئے ان دستوں نے ترکوں کی پشت پر خنجر گھونپ دیا جس کی وجہ سے ترک فوجوں کے بڑے حصہ کو انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے عرب باغیوں کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور ترکوں کے لیے شام و فلسطین چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔ جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں شاہ فیصل نے پیرس کی امن کانفرنس میں اپنے باپ کی طرف سے نمائندگی کی۔ اس کے بعد وہ لندن چلے گئے تاکہ برطانیہ کو جولائی ۱۹۱۵ء کے عرب برطانوی معاہدے پر عمل درآمد پر آمادہ کریں۔ اس کے بعد وہ دمشق آئے جہاں ان کو شام کا بادشاہ منتخب کیا گیا۔ لیکن فرانسیسیوں نے ان کو جلد ہی دمشق سے بیدخل کر دیا۔ بالآخر انگریزوں نے ان کو ۲۳۔ اگست ۱۹۲۱ء کو عراق کا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ عراق کی مکمل آزادی کے بعد شاہ فیصل صرف ایک سال اور زندہ رہے۔ ۸۔ ستمبر ۱۹۳۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

شاہ فیصل کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شاہ غازی (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۹ء) تخت نشین ہوئے اور جب وہ عین عالم جوانی میں ایک حادثہ میں ہلاک ہو گئے تو ان کے نابالغ بیٹے شاہ فیصل ثانی (۱۹۳۹ء تا ۱۹۵۸ء) کو بادشاہ بنایا گیا۔ فیصل ثانی کی عمر اس وقت صرف چار سال تھی اس لیے ان کی کم سنی کے زمانے میں ان کے چچا عبدالالہ نے سرپرست کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ فیصل ثانی کی باضابطہ تخت نشینی ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ لیکن اس کے بعد بھی عراق کی سب سے بااقتدار شخصیت عبدالالہ (۱۹۱۳ء تا ۱۹۵۸ء) ہی کی تھی۔ عبدالالہ شریف حسین کے سب سے بڑے صاحبزادے علی (۱۸۷۹ء تا ۱۹۳۵ء) کے بیٹے تھے۔ جب حجاز سے سلطان ابن سعود نے شاہ علی کو بیدخل کر دیا تھا تو وہ عراق میں اپنے بھائی فیصل کے پاس آ گئے تھے اور وہیں ۱۹۳۵ء میں انتقال کیا۔

نوری سعید پاشا (۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۸ء)

شاہ فیصل اور عبدالالہ کے بعد عراق کے بادشاہی دور کی سب سے اہم سیاسی شخصیت نوری

سعید پاشا کی تھی۔ نوری سعید پاشا بغداد میں پیدا ہوئے اور عثمانی خلافت کے زمانہ میں ترکی فوج کے ایک افسر تھے۔ لیکن انھوں نے قوم پرست عربوں سے خفیہ تعلقات قائم کر لیے۔ عربوں کی بغاوت شروع ہونے پر انگریزوں نے ان کو حجاز کے محاذ پر بھیجا جہاں نوری سعید نے امیر فیصل کی فوج میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر انھوں نے عراق کی سیاسی زندگی میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ عراق کے پہلے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان چودہ مرتبہ عراق کے وزیر اعظم رہے۔ عراق کو ترکی اور ایران سے قریب لانے میں ان کا اہم حصہ ہے۔ وہ کمیونزم کے سخت مخالف تھے۔ لیکن نوری سعید پاشا ایک جمہوریت پسند انسان نہیں تھے۔ وہ عراق کے مرد آہن تھے۔ عوام کی خواہشات کا انھوں نے کبھی احترام نہیں کیا اور اپنے مخالفوں کو سختی سے دبایا۔ ان کے زمانے میں اخبارات کا گلا گھونٹا گیا اور سیاسی زندگی معطل رہی اور ۱۹۵۴ء میں انھوں نے سیاسی جماعتوں کو بھی ختم کر دیا۔ نوری سعید بہت بڑے برطانیہ نواز تھے اور ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ انگریزوں سے بھی زیادہ انگریزی مفاد کی ترجمانی کرتے تھے۔ عراق ان ہی کی کوششوں سے فروری ۱۹۵۵ء میں معاہدہ بغداد میں شامل ہوا۔

نوری سعید پاشا کی استبدادی حکومت نے عوام کو شاہی خاندان اور نوری سعید کے خلاف کر دیا اور نوری سعید کی وزارت کو معطل کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور جب جمہوری طریقے سے تبدیلی لانا ناممکن ہو گیا تو عراقی فوج کے ایک افسر جنرل عبدالکریم قاسم نے ۱۴۔ جولائی ۱۹۵۸ء کو حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ یہ بغاوت بڑی خونریز تھی اور اس کے دوران نوری سعید پاشا کے ساتھ نوجوان شاہ فیصل ثانی اور شاہی خاندان کے تمام افراد جن میں خواتین بھی شامل تھیں وحشیانہ طریقے پر قتل کر دیے گئے اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ عراق کے اس انقلاب کے ساتھ ملک میں بادشاہت کے دور کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

بادشاہی دور میں عراق (۱۹۲۱ء۔۱۹۵۸ء)

عراق ان ملکوں میں سے ہے جہاں سیاسی استحکام بہت کم حاصل رہا ہے۔ بادشاہی دور کے ابتدائی بیس سالوں میں ۳۳ مرتبہ حکومتیں بدلیں۔ اس زمانے کے بعد بھی صورت حال کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوئی۔ اس دور میں اگر کسی کو استحکام تھا تو وہ بادشاہ کی ذات تھی۔ عراق میں ایک ایسی

دستوری بادشاہت قائم تھی جس میں مجلس قانون ساز کے باوجود اصل اقتدار بادشاہ کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۹۳۲ء تک عراق کا اصل حکمران بادشاہ کی بجائے برطانوی ہائی کمشنر تھا۔ اس کے بعد اگرچہ عراق مکمل طور پر آزاد ہو گیا لیکن برطانوی حکومت اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے عراق کو مختلف قسم کے معاہدوں پر مجبور کرتی رہی۔ یہ بات بھی سیاسی عدم استحکام کا باعث ہوئی۔ عوام کی طرف سے اس قسم کے معاہدوں اور مراعات کی مخالفت کی جاتی تھی اور برطانوی دباؤ کے تحت حکومت ان معاہدوں پر عمل درآمد کرنے پر مجبور ہوتی تھی۔ عراق میں حبانیہ اور شیبہ کے برطانوی اڈے بھی مسلسل کشمکش کا باعث رہے۔ موصل کا مسئلہ کئی سال تک ترکی اور عراق کے درمیان متنازعہ رہا۔ عراقی حکومت کی برطانیہ نواز پالیسی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ بالآخر ۱۹۲۵ء میں جمعیت اقوام نے موصل پر عراق کا حق تسلیم کر لیا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں عراق کو نازک دور سے گزرنا پڑا۔ عراق جنگ میں غیر جانبدار تھا لیکن برطانیہ نے جو مراعات حاصل کر رکھی تھیں ان کا سہارا لے کر عراق کی غیر جانبداری کو مشکوک بنانا چاہا۔ چنانچہ برطانوی طرز عمل کے خلاف ایک فوجی افسر رشید علی گیلانی نے ۱۹۴۱ء کے موسم بہار میں عراقی حکومت پر قبضہ کر لیا اور نائب السلطنت عبدالالہ کو ملک سے فرار ہونا پڑا۔ اس کے بعد برطانیہ نے براہ راست فوجی مداخلت کر کے سابقہ صورت حال بحال کی جس کے بعد رشید علی گیلانی کو سعودی عرب میں پناہ حاصل کرنی پڑی۔

خارجی میدان میں ترکی، عراق، ایران اور افغانستان کے درمیان ۸۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو معاہدہ سعد آباد پر دستخط ہوئے۔ لیکن دو سال بعد جنگ عظیم ثانی چھڑ جانے کی وجہ سے یہ معاہدہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ جنگ کے آخری دور میں عراق نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب برطانیہ نے فلسطین چھوڑا اور عربوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو عراق نے باوجود فاصلے کے اپنی فوجیں بھی فلسطین بھیجیں۔ اس کے بعد سے عراق فلسطینیوں کے حق آزادی کا پرزور حامی رہا ہے۔

۲۴۔ فروری ۱۹۵۵ء کو عراق اور ترکی نے میثاق بغداد پر دستخط کیے۔ بعد میں اسی سال ایران، برطانیہ اور پاکستان بھی اس معاہدے میں شامل ہو گئے لیکن یہ میثاق معاہدہ سعد آباد سے مختلف نوعیت کا تھا۔ اس کا مقصد روس کے خلاف برطانوی امریکی محاذ کو مضبوط بنانا تھا۔ ترکی اور

روس نے اس میثاق میں شرکت اپنے خلاف روسی جارحانہ عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے کی تھی۔ پاکستان کی شرکت کی بھی معقول وجہ تھی، کیونکہ پاکستان بھارت کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی فوجی قوت کو مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ لیکن عراق کا جس کی سرحدیں روس سے دور تھیں میثاق میں شرکت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ علاوہ ازیں معاہدۂ بغداد میں عراق کی شرکت سے اسرائیل اور امریکہ کے خلاف عربوں کے متحدہ محاذ میں کمزوری پیدا ہوسکتی تھی چنانچہ دنیائے عرب نے میثاق بغداد کو برطانوی امریکی سامراج کا ایک حربہ قرار دے کر اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور عرب دنیا میں عراق کی شدید مخالفت شروع ہوگئی۔

خلافت عثمانیہ کے آخری دور میں عراق میں تعمیر و ترقی کے جس کام کا آغاز ہوا تھا مملکت عراق کے وجود میں آنے کے بعد اس کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ ۱۹۲۷ء میں تیل کی دریافت نے ملک میں خوشحالی کے راستے کھول دیے۔ ۱۹۵۸ء تک عراق میں تیل کی پیداوار چار کروڑ ٹن تک پہنچ گئی تھی اور عراق کا شمار دنیا میں تیل پیدا کرنے والے سب سے بڑے ملکوں میں ہونے لگا۔ ۱۹۵۰ء میں ایک ترقیاتی بورڈ قائم کیا گیا تاکہ تیل کی برآمد سے ہونے والی آمدنی کو ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کیا جاسکے۔ چنانچہ اس وقت سے تیل کی آمدنی کا ۷۵ فیصد حصہ ترقیاتی کاموں پر صرف ہونے لگا۔ زرعی ترقی کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی۔ عہد عباسی کے نہری نظام کو بحال کیا گیا۔ دریائے دجلہ، فرات اور ان کے معاونوں پر کئی بند تعمیر کیے گئے۔ سیلاب کی روک تھام کے منصوبے تیار کیے گئے اور اس مقصد سے حبانیہ اور ثرثر کے نشیبی علاقوں کو ایسی مصنوعی جھیلوں میں تبدیل کردیا گیا جن میں دجلہ اور فرات کا فاضل پانی جمع ہوسکے۔ نہری آبپاشی کے فروغ سیلاب کی روک تھام اور دلدلوں کو خشک کرکے لاکھوں ایکڑ اراضی زیر کاشت لائی گئی۔ دارالحکومت بغداد، بصرہ اور موصل میں کارخانے قائم کیے گئے اور اس طرح صنعت و حرفت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ تعلیم بھی اس دور میں عام ہوئی اور بغداد یونیورسٹی قائم ہوئی جو جدید دور میں عراق کی پہلی یونیورسٹی ہے۔

عبدالکریم قاسم

عبدالکریم قاسم ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۳ء تک عراق کے صدر اور وزیراعظم رہے نئی حکومت نے ۲۷ جولائی ۱۹۵۸ء کو عراق کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا لیکن یہ تبدیلی صرف نام کی تھی اور

جمہوریت نے ایک نئی آمریت کا نقاب اوڑھ لیا تھا۔عراق کے باشندے جو آزادی اور اظہار رائے چھن جانے کی وجہ سے نوری سعید پاشا سے نفرت کرتے تھے۔قاسم کے دور میں زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم ہو گئے۔

انقلابی کئی جماعتوں میں تقسیم تھے کچھ قوم پرست تھے کچھ بعث پارٹی کے طرفدار تھے کچھ صرف آمر جمال ناصر کے طرفدار تھے اور کچھ کمیونسٹ تھے۔ان انقلابیوں کے درمیان سازشیں ہوتی رہیں۔کبھی ناصر کے حامی غالب آ جاتے تو کبھی کمیونسٹ غلبہ حاصل کر لیتے ۔آخر میں ناصر کے حامیوں کو کچلنے کے لیے عبدالکریم قاسم نے کمیونسٹوں کا سہارا لیا۔کمیونسٹوں کے غلبہ کے اس دور میں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ہوئے۔عوامی عدالتیں قائم ہوئیں اور موصل اور کرکوک کے علاقے میں پانچ ہزار مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔فوج کے اسلام پسند افسروں نجیب ربیعی اور رفعت سری کو بغاوت کے الزام میں سزائے موت دی گئی، اسلامی کتب خانوں کو نذرِ آتش کیا گیا۔حکومت کے اس اسلام دشمن طرز عمل نے خصوصاً موصل اور کرکوک کے قتل عام نے ملک میں آگ لگا دی اور عوام ہر جگہ کمیونسٹوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔اس دارو گیر میں موصل اور کرکوک میں بہت سے کمیونسٹ مارے گئے۔باقی بغداد بھاگ گئے۔عبدالکریم قاسم نے جب یہ صورت حال دیکھی تو کمیونسٹوں کی سرپرستی ختم کر دی۔

فروری ۱۹۶۰ء میں اہل عراق کو سیاسی آزادی ملی۔نئے اخبار نکلے اور سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں۔اسی زمانہ میں اسلام پسندوں نے ''الحزب الاسلامی'' قائم کی۔شروع میں حکومت نے الحزب الاسلامی یعنی جماعت اسلامی کے قیام کی اجازت نہیں دی، لیکن عدالت نے حکومت کے فیصلہ کو مسترد کر دیا، اور اس اسلامی جماعت نے کام شروع کر دیا۔اس دوران قاسم کے مخالف عناصر اور بعث پارٹی کے حامی قاسم کے خلاف خفیہ سازشوں میں لگے رہے۔

۸۔فروری ۱۹۶۳ء کو فوج کے ان عناصر نے عبدالسلام عارف کی قیادت میں بغاوت کر دی اور قاسم کی حکومت کا تختہ پلٹ کر دوسرے دن ان کو گولی مار دی۔

عبدالسلام عارف

عبدالسلام عارف ۱۹۵۸ء کے انقلاب میں عبدالکریم قاسم کے دست راست تھے لیکن

عارف چونکہ صدر ناصر کے حامی تھے، اس لیے عبدالکریم قاسم سے اختلاف ہوگیا، اور قاسم کی حکومت نے بغاوت کی سازش کے الزام میں عبدالسلام عارف کو سزائے موت دی تھی۔ جو بعد میں نظر بندی میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ عبدالسلام عارف اپریل ۱۹۶۶ء میں ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوگئے۔ وہ ایک شریف مزاج، اعتدال پسند اور مذہبی آدمی تھے۔ ان کے عہد میں ۳۔ مئی ۱۹۶۴ء کو عراق میں عارضی آئین نافذ کیا گیا بعث پارٹی جو عراق میں برابر زور پکڑتی جا رہی تھی، اس نے نئے انقلاب کے نو ماہ بعد وزیراعظم احمد حسن البکر کی قیادت میں بغاوت کی جو کچل دی گئی۔ عبدالسلام عارف کے دور میں کویت کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا جس پر عبدالکریم قاسم کے زمانہ سے تنازعہ تھا۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو عراق اور مصر کو متحدہ کرنے کے لیے ایک معاہدہ ہوا لیکن عبدالسلام کی اچانک موت کی وجہ سے یہ اتحاد عملی جامہ نہیں پہن سکا۔

عبدالسلام کے بعد ان کے بھائی عبدالرحمن عارف ۱۷۔ اپریل کو صدر منتخب ہوئے، ۳۰۔ جون ۱۹۶۶ء کو ناصر کے حامیوں کی طرف سے پھر انقلاب لانے کی کوشش کی گئی لیکن ناکام رہی۔ عبدالرحمن عارف کے زمانے میں زرعی اصلاحات کی گئیں۔ جون ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل اور عربوں کے درمیان جنگ ہوئی تو عبدالرحمن عارف ہی عراق کے صدر تھے۔ اس جنگ کے بعد روس سے عراق کے تعلقات میں اضافہ ہوا اور غیر عرب اسلامی ملکوں سے اتحاد کا جذبہ بڑھا۔ لیکن دسمبر ۱۹۶۷ء میں عبدالرحمن عارف نے ہونے والے انتخابات ملتوی کرا دیے اور عراق میں نجی اخبارات بھی بند کر دیے گئے۔ اس سے اعتدال پسندوں اور اسلام پسندوں کو سب سے زیادہ مایوسی ہوئی۔ بعث پارٹی کے حامی خفیہ سازشوں کے ذریعے اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ ۱۷۔ جولائی ۱۹۶۸ء کو میجر جنرل احمد حسن البکر کی قیادت میں انھوں نے کامیاب بغاوت کی اور عبدالرحمن عارف کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ عبدالرحمن عارف کی خدمات کی وجہ سے ان کی جان بخشی کی گئی اور ان کو ملک سے نکل جانے کا موقع دے دیا گیا۔

بعث پارٹی کی حکومت

۱۹۶۸ء سے اب تک عراق پر بعث پارٹی کی حکومت ہے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد عراق میں جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں سب سے مستحکم حکومت یہی ہے۔ لیکن بعث پارٹی کے استحکام کی بنیاد

جبر و استبداد پر ہے۔ اس جبر کے خلاف گزشتہ دس سال میں کئی بار جوابی انقلاب کی کوششیں ہوئیں لیکن ناکامی ہوئی۔ بعث پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے فوراً بعد یعنی ۳۰۔ جولائی ۱۹۶۸ء کو وزیر اعظم لیفٹیننٹ جنرل عبدالرزاق النائف کو گرفتار کر کے مراکش جلاوطن کر دیا۔ ان پر جوابی انقلاب لانے اور سوشلسٹ اقتدار پر نظرثانی کرنے کا الزام تھا۔ ۱۹۶۹ء میں پچاس افراد کو جاسوسی کے مبینہ الزام میں سزائے موت دی گئی۔ مذہبی عناصر خاص طور پر اس دور میں نشانہ بنائے گئے۔ ۳۰۔ جون ۱۹۷۳ء کو عراق کے ڈائرکٹر جنرل سکیورٹی کرنل ناظم قزار نے بغاوت کی ناکام کوشش کی۔ اس کے بعد انقلابی کمانڈ کونسل نے صدر احمد حسن البکر کو آمرانہ اختیارات دے دیے۔ اس وقت سے عراق اندرونی ہنگاموں، بغاوتوں، بعث پارٹی کے مخالف عناصر کی ایذا رسانی اور جبر و ظلم کا مرکز بنا ہوا ہے۔

عراق میں برسر اقتدار بعث پارٹی کا یہ گروپ اگرچہ سوشلزم کا علمبردار ہے لیکن شام کی بعث پارٹی کے مقابلہ میں اعتدال پسند ہے۔ آئین کے تحت جو ۲۲۔ ستمبر ۱۹۶۸ء کو نافذ کیا گیا تھا اور جس میں کئی مرتبہ ترمیمیں کی جا چکی ہیں اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔ اس آئین کے تحت عراق ایک پاپولر ڈیموکریٹک ریاست ہے۔ یہ اصطلاح خالص اشتراکی نوعیت کی ہے۔ موجودہ حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کو پہلی مرتبہ قانونی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ جولائی ۱۹۷۳ء میں بعث پارٹی کو پہلی مرتبہ قانونی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ جولائی ۱۹۷۳ء میں بعث پارٹی اور عراق کمیونسٹ پارٹی کے تعاون سے قومی ترقی پسند محاذ بنا لیا گیا۔ ملک کی تیسری سیاسی پارٹی کردستان ڈیموکریٹک لیگ ہے۔

فلسطین کے معاملہ میں عراق کی بعثی حکومت کئی سال تک روسی نقطۂ نظر کی ترجمان رہی، لیکن اب اس معاملہ میں دونوں ملکوں میں شدید اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا اظہار اس وقت ہوا جب حکومت عراق نے اپریل ۱۹۷۸ء میں عراق کمیونسٹ پارٹی کے چودہ ممبروں کو پھانسی دے دی جو عراق میں روسی پالیسی کے حامی تھے اس موقع پر پہلی مرتبہ عراق نے اعتراف کیا کہ عراق پورے فلسطین کو آزاد کرانا چاہتا ہے جبکہ روس اسرائیلی ریاست کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد سے عراق اور روس کے درمیان تعلقات میں سرد مہری پیدا ہو گئی ہے۔ اگرچہ ۱۹۷۲ء میں روس سے دوستی کا جو معاہدہ کیا گیا تھا وہ ابھی قائم ہے۔

عراق کے صدر احمد حسن البکر (پیدائش ۱۹۱۲ء) پورے گیارہ سال اقتدار میں رہنے کے بعد ۱۶۔ جولائی ۱۹۷۹ء کو صدارت سے مستعفی ہو گئے اور ان کے نائب جنرل صدام حسین اب ان کی جگہ انقلابی کمانڈ کونسل کے صدر، عراق کے وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف اور بعث پارٹی کے سکرٹری جنرل ہو گئے۔ عراق میں خود بعث پارٹی کے مختلف گروپ آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ ایک مضبوط گروپ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو شام کی بعث پارٹی سے قریب تر ہے۔ اور جس میں شیعہ عناصر کو غلبہ ہے۔ ۸۔ اگست ۱۹۷۹ء کو حکومت عراق نے ایسے اکیس لوگوں کو پھانسی دے دی۔ ان میں کمانڈ کونسل کے پانچ ارکان بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ ۳۳ افراد کو ایک سے پندرہ سال تک سزائے قید دی گئی۔ ان لوگوں پر شام کے صدر حافظ اسد سے سازش کرنے کا الزام تھا۔

کردستان

عراق کے اندرونی مسائل میں سب سے اہم مسئلہ کردوں کا ہے۔ عراق کی بیس فیصد آبادی کردوں پر مشتمل ہے۔ شمال مغرب کا خوبصورت پہاڑی علاقہ جس میں سلیمانیہ، اربیل اور دُہوک کے شہر واقع ہیں کردوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے عراقی کرد اس علاقہ کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۸ء کے بعد انھوں نے کئی بار بغاوتیں بھی کیں۔ ان بغاوتوں میں روس کے علاوہ ایران کا ہاتھ بھی شامل رہا ہے۔ بعث حکومت کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے مارچ ۱۹۷۰ء میں کردوں سے تصفیہ کرلیا کہ مارچ ۱۹۷۴ء تک ان کو اندرونی خودمختاری دے دی جائے گی۔ جب یہ خودمختاری دے دی گئی تو کردوں کے ایک حصے نے اس لیے رد کر دیا کہ خودمختاری کردستان میں کرکوک کو شامل نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں اس گروہ سے جس کی رہنمائی مصطفیٰ برزانی کر رہے تھے عراقی حکومت کی لڑائیاں جاری ہیں۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں جب ایران اور عراق میں معاہدہ ہو گیا اور مصطفیٰ برزانی ایران چلے گئے تو باقی کردوں نے بھی جنگ ختم کر دی اور عراقی حکومت نے ان سب کردوں کو معافی دے دی۔ عراقی کردستان کا صدر مقام اربیل کا شہر ہے جو دنیا کا قدیم ترین شہر کہلاتا ہے۔ عراقی حکومت نے کردی زبان کو بھی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے اور اب کردستان میں عربی کے ساتھ کردی زبان بھی استعمال کی جا سکے گی۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء سے کردستان میں مجلس مشاورت قائم ہے۔

شط العرب

پڑوسی ملکوں میں کویت اور ایران سے عراق کے تعلقات شروع ہی سے خراب رہے۔ کویت پر عراق اپنا حق سمجھتا تھا اس لیے جب کویت نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی تو عراق نے کویت کی آزاد حیثیت تسلیم نہیں کی۔ لیکن عبدالسلام عارف کی حکومت نے کویت کی آزادی کو تسلیم کر کے یہ تنازعہ ختم کر دیا۔ ۱۹۶۹ء میں شط العرب کے مسئلہ پر ایران سے تنازعہ شروع ہو گیا۔ دریائے دجلہ اور فرات جب ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں تو یہ مشترکہ دھارا شط العرب کہلاتا ہے۔ سمندر میں گرنے سے پہلے شط العرب ایران اور عراق کی حد بندی کرتا ہے۔ اس طرح شط العرب کا یہ حصہ دونوں ملکوں کی جہاز رانی کے لیے مشترکہ حیثیت رکھتا ہے۔ شط العرب پر ایران کا دعویٰ دونوں ملکوں کے لیے تنازعہ کا باعث بن گیا۔ یہ تنازعہ اتنا بڑھا کہ ۱۹۷۱ء میں دونوں ملکوں نے سفارتی تعلقات بھی ختم کر دیے۔ کردستان کا مسئلہ طے ہو جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے قریب آنا شروع ہوئے اور اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ فلسطین کے بعد سفارتی تعلقات بحال ہو گئے۔ مارچ ۱۹۷۵ء میں دونوں ملکوں نے شط العرب کے مسئلہ پر معاہدہ کر لیا۔

دریائے فرات کے پانی کے مسئلہ پر شام سے بھی عراق کے تعلقات خراب ہیں۔ عراق کا دعویٰ ہے کہ شام دریائے فرات کا پانی زیادہ مقدار میں حاصل کر رہا ہے جس کی وجہ سے عراق میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ یہ تنازعہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعث پارٹی کے دونوں بازوؤں کا اختلاف بھی اس تنازعہ کے حل میں رکاوٹ ہے۔

عراق کی آبادی میں شیعہ اور سنی تناسب تقریباً برابر ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک تخمینہ کے مطابق سنیوں کی تعداد اکیس لاکھ اور شیعوں کی تعداد بیس لاکھ تھی شمال کے سات صوبوں میں سنیوں کی اکثریت ہے اور جنوب کے سات صوبوں میں شیعہ اکثریت ہے۔ بغداد اور بصرہ کی شہری آبادی میں بھی سنیوں کی اکثریت ہے۔ کرد آبادی تمام کی تمام سنی ہے لیکن عربوں کی اکثریت شیعہ ہے۔ عربوں میں شیعہ اور سنی تناسب آٹھ اور پانچ کا ہے۔ اقتدار شروع سے سنیوں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ نجف اور کربلا حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے مقبروں کی وجہ سے شیعی دنیا کی مقدس ترین زیارت گاہیں ہیں۔ بغداد اور سامرہ میں بھی شیعی ائمہ کی زیارت گاہیں ہیں۔ سنیوں کی سب سے

بڑی زیارت گاہ بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا مقبرہ بھی اہم سنی زیارت گاہ ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے مقبرے عثمانی ترکوں کے زمانے میں تعمیر کیے گئے تھے۔ شیعی ائمہ کے مقبرے جن پر بڑی عالی شان عمارتیں بنی ہوئی ہیں ایرانی بادشاہوں کی عقیدت کا نتیجہ ہیں۔

شیخ امجد زہاوی

بعث پارٹی ایک سوشلسٹ پارٹی ہے اور اس لحاظ سے اس کا طرزِ عمل مذہب دشمن ہے۔ بعث پارٹی کے اقتدار کے زمانے میں عراق میں اسلامی عناصر کو سختی سے کچل دیا گیا ہے۔ عراق میں مصر اور شام کی طرح مضبوط اسلامی تحریکیں کبھی بھی موجود نہیں رہیں۔ اخوان المسلمون اگرچہ عراق میں تھے۔ لیکن وہ طاقت حاصل نہ کرسکے ہاں انفرادی طور پر کچھ رہنما اسلامی اقدار کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ان میں شیخ امجد زہاوی (۱۸۸۲ء تا ۱۹۶۷ء) کا نام سب سے نمایاں ہے۔

شیخ امجد زہاوی بغداد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء میں استنبول کے کلیۃ القضاۃ سے سند حاصل کی تھی۔ وہ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک عراق کے قاضی القضاۃ رہے۔ پورے عراق میں اسلامی قانون کا آپ سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب عراق میں سیاسی جماعتیں قائم کرنے کی اجازت ملی تو آپ نے جمعیۃ ال آداب الاسلامیہ قائم کی۔ ۱۹۴۹ء میں جمعیۃ الزبید الاسلامیہ کے نام سے ایک اور جماعت قائم کی۔ ان جماعتوں کا مقصد نوجوان نسل کو اسلامی نظامِ زندگی سے روشناس کرانا تھا۔ اسی زمانے میں مصری مدرسوں سے آنے والے عراقی طلبہ نے اخوان سے اہلِ عراق کو روشناس کرایا۔ عدن کے نامور اسلامی رہنما شیخ محمود الصواف بھی اخوان کی دعوت سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں عراق میں جمعیت الاخوۃ الاسلامیہ قائم کی گئی تو امجد زہاوی اس کے صدر منتخب ہوئے۔ شیخ زہاوی نے الاخوۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا جو مصر میں محب الدین الخطیب کے ہفت روزہ الفتح کی طرح اسلام کا پرجوش داعی پرچہ تھا۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ زہاوی نے علماء کی تنظیم ''رابطہ العلماء'' قائم کی۔ زہاوی حنفی تھے جبکہ عراق کی نصف آبادی شیعہ ہے۔ علماء کی اس تنظیم نے، جس کے صدر شیخ امجد زہاوی تھے۔ عراق کے مذہبی حلقوں کو انتشار سے بچایا اور شیعہ علماء کا تعاون حاصل کیا۔ شیخ امجد زہاوی نے فلسطین اور الجزائر کی جدوجہد آزادی میں مالی امداد اور اسلحہ فراہم کرکے عملی حصہ لیا اور مسئلہ کشمیر میں پاکستان کے موقف

کی پر جوش حمایت کی۔[1]

عراق کے جدید دور کے شاعروں میں جمیل صدقی الزہاوی (۱۸۶۳ء تا ۱۹۳۶ء) اور معروف اُصافی (۱۸۷۵ء تا ۱۹۴۵ء) کے نام ممتاز ہیں۔ لیکن یہ دونوں شاعر تجدد اور بے قید آزادی کے داعی تھے۔ ان کے برخلاف محمد رضا شبیبی اسلامی قدروں کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے انگریزوں کے دور میں اپنی پر جوش نظموں کے ذریعہ آزادی اور جہاد کی روح پھونکی۔ وہ عراقی سینٹ کے صدر بھی رہے اور کئی مرتبہ عراق میں وزیر علیم رہے۔ محمد رضا شبیبی، عراق کی علمی اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں اور مصر وشام کی علمی وادبی اکیڈمیوں کے اعزازی رکن ہیں۔

معیشت

عراق بیشتر اسلامی ملکوں کی طرح ایک زرعی ملک ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ مزروعہ زمین کا بڑا حصہ دریائے دجلہ اور فرات اور دجلہ کے معاونوں سے سیراب ہوتا ہے۔ شمالی حصہ میں بارشیں بھی کافی ہوتی ہیں۔ گزشتہ پچاس سال میں قدیم نظام آبپاشی بحال ہو چکا ہے۔ گیہوں، جَو اور چاول خاص فصلیں ہیں۔ مکئی بھی بڑی مقدار میں ہوتی ہے۔ شمال کے پہاڑی علاقوں میں مباکو کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ پھلوں میں انار، آڑو، خوبانی، سیب، ناشپاتی اور انگور کافی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ بصرہ کی کھجور عہد قدیم سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ تقریباً ایک سو ستر قسم کی کھجوریں ہوتی ہیں۔ کھجوروں کے درختوں کی تعداد تین کروڑ ہے جن سے ہر سال ساڑھے تین لاکھ ٹن کھجوریں حاصل ہوتی ہیں۔ دنیا میں برآمد ہونے والی کھجوروں کی اسی فیصد مقدار عراق سے برآمد ہو رہی ہے۔ کھجور کے علاوہ اون بھی عراق کی اہم برآمد ہے۔ ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد وسیع پیمانے پر زرعی اصلاحات کی گئیں جن کے تحت زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔

صنعتیں زیادہ تر زرعی پیداوار پر مبنی ہیں۔ اونی کپڑا، شکر، سگرٹ دوا سازی اور کیمیاوی کھاد کی صنعت اہم صنعتیں ہیں۔ ابھی تک بھاری صنعتیں قائم نہیں ہوئی ہیں۔

عراق کی خوشحالی میں پٹرول کی پیداوار کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ پہلے صرف کرکوک اور موصل کے قریب تیل نکلتا تھا۔ ۱۹۵۱ء سے بصرہ کے قریب بھی تیل نکلنا شروع ہو گیا۔ اس وقت

---

(۱) ترجمان القرآن، لاہور مارچ ۱۹۶۸ء مضمون "امجد زہاوی" از خلیل احمد حامدی۔

عراق تیل کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا کا چھٹا اور اسلامی دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ اسلامی دنیا میں صرف سعودی عرب اور ایران میں عراق سے زیادہ تیل پیدا ہوتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ½۷ کروڑ ٹن تیل پیدا ہوتا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں یہ مقدار گیارہ کروڑ ٹن ہوگئی۔ تیل کی بیشتر مقدار کرکوک سے پائپ لائنوں کے ذریعہ براہ شام بحیرہ روم کے بندرگاہوں میں بھیجی جاتی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں کرکوک سے ترکی کے راستے ایک نئی پائپ لائن بحیرہ روم تک ڈالی گئی ہے۔ پہلے تیل نکالنے کا کام مختلف بیرونی کمپنیاں کرتی تھیں۔ جون ۱۹۷۲ء سے ان تمام کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے۔ بغداد، بصرہ، خانقین میں تیل صاف کرنے کے کارخانے ہیں۔

تیل کی آمدنی سے عراق میں تعمیر و ترقی کا کام وسیع پیمانہ پر انجام دیا جارہا ہے۔ اس کے لیے ایک مخصوص ترقیاتی فنڈ قائم ہے۔ علاوہ ازیں عراق حکومت نے دوسرے عرب ملکوں اور افریقی ملکوں کی ترقی کے لیے بھی مخصوص فنڈ قائم کیے۔ اس طرح تیل سے ہونے والی آمدنی کو بہتر طور پر صرف کیا جارہا ہے۔ تیل سے آمدنی کی ایک بہت بڑی رقم فوجی اخراجات پر بھی صرف ہو رہی ہے۔ اسلحہ زیادہ تر روس سے درآمد کیا جاتا ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں عراق نے تعلیمی میدان میں نمایاں ترقی کی ہے۔ اس وقت ملک میں خواندگی کا تناسب پچاس فیصد کے قریب ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے پانچ یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ ان میں دو بغداد میں ہیں یعنی جامعہ بغداد اور جامعہ مستنصریہ اور ایک ایک یونیورسٹی بصرہ، سلیمانیہ اور موصل میں ہے۔ عراق اگرچہ تیزی سے ترقی کی طرف گامزن ہے اور قدیم نظام آبپاشی بھی بڑی حد تک بحال ہوگیا ہے، لیکن علم و ادب کے میدان میں عراق ابھی تک سابقہ عظمت حاصل نہیں کرسکا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مقام عرب دنیا میں شام، لبنان، مصر اور مراکش کے بعد آتا ہے عراق کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ ''الشورہ'' ہے جو بعث پارٹی کا ترجمان ہے اور ستر ہزار چھپتا ہے۔ ''طریق الشعب'' کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ہے اور (Al-Taakhi) کردستان ڈیموکریٹک پارٹی کا ترجمان ہے اور سولہ ہزار چھپتا ہے۔

عراق شمال مشرقی شام میں تل کوچک کے راستے بذریعہ ریل ترکی اور شام سے ملا ہوا ہے۔ اس طرح بصرہ اور بغداد سے براہ ترکی حلب اور دمشق تک سفر کرنا ممکن ہوگیا ہے۔

باب ۱۸

سرزمین شام

شام کی تاریخ بھی عراق سے کم پرشکوہ نہیں۔ اسلامی خلافت کا مدینہ کے بعد دوسرا دارالخلافہ شام ہی کا شہر دمشق تھا۔ اگرچہ یہ حقیقت کہ دمشق میں اسلامی خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کی دمشق کے مرتبہ کو کم کرتی ہے لیکن دوسری طرف دمشق اس فخر کا حقدار بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت کا دارالخلافہ رہا اور جب تک اس کو یہ اعزاز حاصل رہا مسلمانوں کی سیاسی وحدت قائم رہی اور جب یہ اعزاز اس شہر سے چھن گیا تو مسلمانوں کی سیاسی وحدت بھی پارہ پارہ ہوگئی۔

عباسی دور میں شام کی حیثیت ایک صوبے کی تھی، لیکن ایک ایسے صوبے کی جو علم وادب، تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت میں عباسی خلافت کے کسی بھی صوبے سے کم تر نہیں تھا۔ دمشق کے علاوہ حلب، حمص اور حماۃ کے شہروں کو عروج حاصل ہوا۔ فلسطین اور یروشلم صوبہ شام ہی کا ایک حصہ تھے۔ عباسیوں کو زوال ہوا تو سیف الدولہ اور پھر زنگی خاندان اور ایوبی خاندان کا دور آیا۔ اس زمانے میں شام کو اسلامی دنیا کے بازوئے شمشیر زن کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ صلیبی حملہ آوروں کے خلاف مدافعت کا مرکز یہی خطہ تھا اور پھر یہیں کے ایک مجاہد صلاح الدین ایوبی کو بیت المقدس اور فلسطین کو آزاد کرانے کا شرف حاصل ہوا۔ ایوبیوں کے بعد مملوکوں کا دور آیا جن کے زمانے میں شام کو مصری مملکت کا ایک حصہ بنالیا گیا، لیکن اس مملکت میں شام برابر کا حصہ دار تھا۔ مملوکوں کے بعد عثمانی ترکوں کا دور آیا جو چار سو سال پر مشتمل سب سے طویل دور تھا۔

اسلامی دور کے آغاز سے مملوکوں کے دور تک شام ایک عظیم تمدن کا مالک رہا۔ یہاں کے ریشمی کپڑے، شیشے کے برتن، گھڑیاں اور دوسری مصنوعات ساری دنیا میں شہرت رکھتی تھیں۔ یہاں کے مدرسے اور شفاخانے دور دور مشہور تھے اور اسلامی دنیا میں دارالحدیث کے نام سے پہلی عمارت شام میں تعمیر کی گئی۔ جہاں تک علم وادب کا تعلق ہے تو فارابی اور متنبی کی یہاں سرپرستی کی گئی۔ المعری اسی خطے سے تعلق رکھتا تھا۔ ابن عربی اور ابن بیطار اسی سرزمین میں دفن ہیں۔ عظیم

مفکر اور مجتہد ابن تیمیہ اور ان کے مایہ ناز شاگرد ابن قیم شام ہی میں پیدا ہوئے اور ابن کثیر نے اپنی عظیم تفسیر اور ابن عساکر نے اپنی دیو پیکر تاریخ دمشق اسی خطہ میں مکمل کی۔ شام کی خاک میں عراق کی طرح کئی جلیل القدر صحابہ دفن ہیں۔ مثلاً حضرت بلال ؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراح ؓ، حضرت خالد بن ولید ؓ اور حضرت امیر معاویہ ؓ۔

عثمانی دور

عثمانی ترکوں کے قبضہ میں جب شام آیا تو اسلامی دنیا کا علمی اور فکری زوال شروع ہو چکا تھا۔ شام کئی بار منگولوں کی پھیلائی ہوئی تباہی کا نشانہ بھی بنا اگرچہ عراق سے کم۔ پندرھویں صدی کے آخر میں مشرق کے بحری راستے کی دریافت کے بعد مصر اور عراق کی طرح شام کی خوشحالی بھی بری طرح متاثر ہوئی اس لیے اگر عثمانی ترکوں کے دور میں شام کے علم و ادب اور تمدن و ثقافت پر زوال آ گیا تو عثمانی ترک اس کے اتنے ذمہ دار نہیں جتنے دوسرے معاشی اور سیاسی اسباب ذمہ دار ہیں۔ عثمانی ترکوں نے اپنے چار سو سالہ دور میں کئی تمدنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ حلب کا ایک بازار جو ۴۴ دکانوں پر مشتمل ہے ۱۵۷۴ء میں وزیر اعظم محمد صوقوللی نے بنوایا تھا۔ اسی طرح شہر میں خسرو پاشا اور ابراہیم پاشا کی جامع مساجد اور احمدیہ اور شعبانیہ نامی مدرسے عثمانی دور کی یادگار ہیں۔ دمشق میں جامع سلطان سلیم، جامع سلطان سلیمان (۱۵۵۴ء) جسے تکیہ سلیمانیہ بھی کہا جاتا ہے اور اٹھارھویں صدی کے ایک عثمانی گورنر اسد العزم کا محل قصر العزم (۱۷۵۰ء) عثمانی دور کی قابل ذکر عمارتیں ہیں۔ حمص میں حضرت خالد بن ولید کی مسجد سلطان عبدالحمید خاں ثانی کے دور کی یادگار ہے۔ جامع سلیمانیہ اور قصر العزم فن تعمیر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

عثمانی دور کے کئی بلند پایہ اہل علم شام سے تعلق رکھتے تھے۔ سترھویں صدی کے ممتاز فقیہ ابراہیم حلبی متوفی ۱۵۴۹ء ۹۵۶ھ حلب کے رہنے والے تھے۔ مشہور ترک مورخ مصطفیٰ نعیما (۱۶۶۳ء، ۱۰۷۳ھ تا ۱۷۱۶ء، ۱۱۲۸ھ) حلب میں پیدا ہوئے تھے۔ مورخ المقری متوفی ۱۶۳۲ء نے اندلس کی بے مثل تاریخ نفح الطیب دمشق میں مکمل کی۔ اسی شہر میں محمد المحبی (۱۶۵۱ء تا ۱۶۹۹ء) نے گیارہویں صدی ہجری کے ایک ہزار دو سو نوے مشاہیر کے حالات پر مشتمل سوانح عمریوں کا مجموعہ مرتب کیا۔

عثمانی دور میں لبنان ریشم کی اور فلسطین روئی، اون اور تیل کی منڈی تھا لیکن تجارت یورپ والوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانہ میں دمشق علوم وفنون کا اور حلب تجارت کا مرکز تھا۔ حلب سترہویں صدی تک پورے مشرق قریب کی سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا اور قسطنطنیہ اور قاہرہ کے بعد سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا، سب سے دولت مند اور خوبصورت شہر تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں حلب کی آبادی دو لاکھ سے چار لاکھ تک شمار کی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب یہ شہر زوال پذیر تھا اس کی آبادی ایک لاکھ تھی۔ (۱)

سلطان عبدالحمید کے زمانے میں شام کی ترقی پر خاص طور پر توجہ دی گئی۔ اردن سے دمشق تک ریلوے لائن تعمیر کی گئی اور اس کے بعد دمشق سے مدینہ منورہ تک اس ریلوے لائن کو توسیع دی گئی جسے حجاز ریلوے کہا جاتا ہے۔ یہ ریلوے لائن آٹھ سال کی مدت میں مکمل ہوئی اور ستمبر ۱۹۰۸ء میں اس کا افتتاح ہوا۔ اسی زمانے میں دمشق سے بیروت تک اور درعہ سے حیفہ تک ذیلی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ مارچ ۱۸۷۷ء میں عثمانی پارلیمنٹ قائم کی گئی اور اگرچہ سلطان نے یہ پارلیمنٹ اگلے سال توڑ دی لیکن ۱۹۰۸ء کے مشروطی انقلاب کے بعد پھر بحال کر دی گئی۔ دونوں مرتبہ اس پارلیمنٹ میں عربوں کو معقول نمائندگی دی گئی۔

عربوں کی بغاوت

لیکن سلطنت عثمانیہ کی یہ تمام کوششیں عربوں کو اپنانے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ قوم پرستی کے وہ جراثیم جو مغربی تصورات کی درآمد اور مسیحی عربوں اور یہودیوں کی فری میسن تحریک کی کوششوں سے مسلمانوں میں پھیلا دیے گئے تھے اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہے۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ ترکوں اور عربوں کے تعلقات خراب کرنے کی ذمہ داری صرف عرب قوم پرستوں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ نوجوان ترک بھی اس معاملے میں برابر کے ذمہ دار تھے۔ وہ ترک قومیت کے نشے میں سرشار ہو چکے تھے اور سلطنت عثمانیہ میں ہر صورت میں ترکوں کی برتری قائم رکھنا چاہتے تھے۔ شام کا ملک عرب قوم پرستی کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ عبدالرحمن کو اکبی جنھوں نے ترکوں کے خلاف زہریلی تحریریں لکھیں شام ہی کے تھے۔ مشہور مسیحی عرب

(۱) فلپ کے حتی، تاریخ شام

ناصیف یازجی، ابراہیم یازجی اور پطرس بستانی جنھوں نے عربوں میں قوم پرستی کا بیج بویا[1] شام اور لبنان ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ عربوں کی خفیہ تنظیمیں سب سے زیادہ شام ہی میں سرگرم تھیں۔ جنگ چھڑنے پر شامی عربوں کا ایک گروہ جس کے سرخیل امیر شکیب ارسلان تھے۔ عثمانی سلطنت کا وفادار رہ کر اصلاحات کے ذریعہ حقوق حاصل کرنے کا طرفدار تھا، لیکن دوسرا گروہ جو زیادہ طاقتور تھا جنگ کو آزادی حاصل کرنے کا ایک نادر موقع تصور کرتا تھا۔ عیسائی عرب بہرصورت ترکوں کے مقابلے میں فرانس کے تحفظ میں جانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ جب جنگ عظیم کے دوران عربوں نے بغاوت کی تو اس کا سب سے بڑا مرکز شام ہی تھا اور ترکوں نے جب عربوں کے خلاف انتظامی کاروائی کی تو جو رہنما سب سے زیادہ تختہ دار پر چڑھائے گئے وہ شام ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

ترکوں کی شکست کے بعد ۱۹۱۹ء میں یہاں اتحادی فوجیں داخل ہوئیں تو عرب رہنماؤں نے دمشق میں ایک اجتماع کیا جس میں ۸۔ مارچ ۱۹۲۰ء کو شام کی آزادی کا اعلان کیا گیا اور ۱۱۔ مارچ کو شریف حسین کے لڑکے شاہ فیصل کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا لیکن اتحادی اس اعلان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ برطانیہ اور فرانس نے پہلے ہی عرب ملکوں کا بٹوارہ کر دیا تھا۔ عراق اور فلسطین انگریزوں کو اور شام فرانس کو دیا جا چکا تھا۔ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ ان فیصلوں نے سارے عرب میں آگ لگا دی۔ عرب نوجوان اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ سے کم کسی بات پر تیار نہیں تھے، فیصل ذاتی طور پر کھلا کھلا مقابلے کے خلاف تھا۔ اس دوران میں فرانس نے الٹی میٹم دے دیا، اور شام کی نئی عرب حکومت سے فرانسیسی انتداب (mandate) کے قبول کرنے، جبری فوجی بھرتی ختم کر دینے اور فرانسیسی سکہ قبول کرنے کا فوری مطالبہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسی ہزار فرانسیسی فوج نے دمشق کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ۱۵۔ جون ۱۹۲۰ء کو فرانسیسی سپہ سالار نے دمشق خالی کرنے کا حکم دیا۔ شاہ فیصل فرانسیسی مطالبات منظور کرنے کے لیے تیار تھا، لیکن نئی قومی حکومت کے وزیر جنگ یوسف بک

(۱) ڈاکٹر فلپ حتی نے تاریخ شام میں لکھا ہے کہ پہلا عرب مصنف جس نے آزادی اور مساوات کو موضوع بحث بنایا حلب کا ایک مسیحی فرانسس المراش (۱۸۳۶ء تا ۱۸۷۳ء) تھا۔ وہ غابۃ الحق اور شہادۃ الطبیعۃ نامی دو کتابوں کا مصنف تھا۔ (المنجد)

العظم نے دو ہزار نیم مسلح نوجوانوں کے ساتھ بڑھ کر فرانسیسی فوج سے ٹکر لے لی۔ نتیجہ ظاہر تھا ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے۔ امیر فیصل نے صحرائے شام کی راہ لی اور دمشق پر فرانس کا قبضہ ہو گیا۔

فرانس کا تسلط

عراق میں تو جلد ہی برطانیہ کے زیر اثر عرب حکومت قائم ہو گئی لیکن شام میں عربوں کی آزادی کے لیے بہت زیادہ جدوجہد کرنی پڑی۔ فرانس نے شام کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا، طرابلس، شام اور جبل کو ملا کر ایک مستقل حکومت لبنان قائم کر دی گئی۔ اس نئی ریاست میں مسلم اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو گئی کیونکہ لبنان کے جنوبی اور ساحلی علاقوں میں مسیحی آبادی کی اکثریت تھی۔ لبنان کے علاوہ شام کے دوسرے حصوں میں جبل الدروز لاذقیہ اور بلاد العلوئین کے نام سے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کی گئیں اور باقی جو حصہ بچا، اس کو سوریہ کا نام دیا گیا۔

شام پر فرانسیسی تسلط کے بعد اہل شام نے حصول آزادی کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کیں۔ جلاوطن رہنماؤں اور ان شامیوں نے جو پہلے سے مصر اور امریکہ میں آباد تھے قاہرہ، پیرس، نیو یارک اور جنیوا میں نشر و اشاعت کے مرکز قائم کیے، جن سے تحریک آزادی کے لیے لٹریچر شائع ہوتا تھا۔ ان رہنماؤں میں جو ملک سے باہر آزادی کے لیے کام کر رہے تھے، سید رشید رضا، امیر شکیب ارسلان اور ریاض بک صلح کے نام نمایاں ہیں، اس دوران میں حریت پسندوں نے اندرون ملک بھی آئینی اور غیر آئینی طریقوں سے جدوجہد جاری رکھی، ۱۹۲۵ء میں جبل الدروز میں زبردست بغاوت ہوئی اور آن کی آن میں شام کا سارا علاقہ میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ امیر شکیب ارسلان کے چھوٹے بھائی امیر عادل ارسلان نے خود مجاہدین کی قیادت کی، دروزیوں کے سردار سلطان پاشا اطرش تھے۔ اس جنگ کے دوران جو تقریباً ایک سال جاری رہی فرانس نے ۱۸۔ اکتوبر تا ۲۰۔ اکتوبر مسلسل ۵۶ گھنٹے دمشق پر گولہ باری کی۔ شہری باشندوں کو محض اس وجہ سے گولہ باری کا نشانہ بنایا گیا کہ دمشق کے باشندے مجاہدین آزادی کی بار بار مدد کرتے رہے تھے۔

آخر میں فرانس نے اس بغاوت کو کچل دیا۔ سلطان پاشا اطرش اور دوسرے رہنماؤں نے صحرائے عرب میں سکونت اختیار کر لی۔

اس کے بعد آئینی جنگ شروع ہوئی، فرانس نے کئی نامکمل اور محدود قسم کے دستور نافذ کیے لیکن حکومت کو قوم پرستوں کا تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ شامیوں کا مطالبہ تھا کہ شام کے منتشر حصوں کو یک جا کر دیا جائے اور عراق کے نمونے پر شام کے ساتھ بھی مساویانہ معاہدہ کیا جائے۔ لیکن حکومت فرانس اس پر راضی نہ ہوئی۔ جب وطن پروروں نے دیکھا کہ فرانس کی حکومت کسی طرح مطالبات ماننے پر آمادہ نہیں تو انھوں نے آخری حربہ کے طور پر عام ہڑتال کر دی، تمام کاروبار بند کر دیے گئے۔ اسکول، مدرسے، بازار سب ویران ہو گئے۔ حکومت نے بہت کوشش کی کہ ایک دکان ہی کھل جائے لیکن وہ ناکام رہی۔ یہ ہڑتال پچاس دن تک جاری رہی، یہاں تک کہ فرانس کو قوم پرستوں کے سامنے جھکنا پڑا۔ جلاوطن رہنما پیرس بلائے گئے اور کئی ماہ کی بات چیت کے بعد آخر ستمبر ۱۹۳۶ء میں ایک معاہدہ ہوا جو ۱۹۳۰ء کے عراق برطانوی معاہدے سے ملتا جلتا تھا۔ اس کی رُو سے شام کے دو حصوں جبل الدروز اور لاذقیہ کو شامی حکومت میں شامل کرنے کا وعدہ کیا گیا اور یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ تین سال بعد فرانسیسی اقتدارِ اعلیٰ ختم کر دیا جائے گا۔ اب نئے انتخابات ہوئے قومی حکومت قائم ہوئی، ہاشم اناسی صدر جمہوریہ مقرر ہوئے جمیل مردم بک وزیر اعظم بنائے گئے۔ امیر شکیب ارسلان، ریاض صلح اور دوسرے جلاوطن رہنما وطن واپس آ گئے امیر عادل ارسلان انقرہ میں شامی سفیر مقرر ہوئے۔

شام نے اگرچہ اندرونی خود مختاری حاصل کر لی تھی لیکن فرانس کی بالادستی اب بھی قائم تھی۔ چنانچہ مکمل آزادی کی جنگ جاری رہی اس دوران میں جنگ چھڑ گئی اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۴ء تک شام پر فرانس اور برطانیہ کا فوجی قبضہ دیا۔ اتحادیوں نے جرمنوں کے خلاف شامی عوام کا تعاون حاصل کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۴۱ء میں شام کو آزادی دینے کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس اعلان کو عملی جامہ پہنانے میں فرانس نے تین سال تک لیت و لعل سے کام لیا۔ بالآخر یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو جمہوریہ شام کو مکمل اختیارات منتقل ہو گئے اور ۱۵۔ اپریل ۱۹۴۶ء کو آخری فرانسیسی فوجوں نے ملک چھوڑ دیا۔

شُکری القُوتلی

شام کی آزادی کی جدوجہد میں جن رہنماؤں نے غیر معمولی کردار ادا کیا ان میں جمہوریہ

شام کے پہلے صدر شکری القوتلی (۱۸۹۱ء تا ۱۹۶۷ء) کا نام سرفہرست[1] ہے۔ قوت لی ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی قوت والا ہیں۔ شکری القوتلی ۱۸۹۱ء میں دمشق میں پیدا ہوئے تھے۔ اعلیٰ تعلیم استنبول یونیورسٹی میں حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آ گئے۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں استنبول میں جب عرب نوجوانوں کی خفیہ تنظیم 'جمعیۃ الفتاۃ'' کے قیام میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ دمشق واپس آ کر انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۶ء میں عربوں کی بغاوت کے بعد جن شامی رہنماؤں کو جمال پاشا نے سازش کے الزام میں گرفتار کیا تھا ان میں شکری القوتلی بھی شامل تھے۔ اعترافِ جرم کرانے کے لیے ان کو مسلسل کوڑے مارے گئے۔ شکری القوتلی کو اس وقت رہا کیا گیا جب فیصل بن حسین نے جمال پاشا کو دھمکی دی کہ اگر شامی حریت پسندوں کو رہا نہ کیا گیا تو مکہ اور طائف میں گرفتار کیے جانے والے ترک افسر قتل کر دیے جائیں گے۔ ۱۹۲۰ء میں جب فرانس نے شاہ فیصل کو دمشق سے بیدخل کیا تو شام کے حریت پسند رہنماؤں کو بھی گرفتار کر لیا۔ ان میں شکری القوتلی بھی شامل تھے جن کو سزائے موت سنائی گئی۔ لیکن شکری القوتلی کسی طرح جیل سے نکل بھاگے اور یورپ ہوتے ہوئے مصر پہنچ گئے۔ سیاسی قیدیوں کی عام معافی کے بعد وہ پھر شام واپس آ گئے اور آزادی کی تحریک میں پھر سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ شکری القوتلی شام کی ممتاز سیاسی جماعت حزب استقلال کے بانی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں ان کو پھر سزائے موت سنائی گئی، لیکن وہ روپوش ہو گئے اور مصر، فلسطین اور حجاز میں رہ کر شام کی آزادی کے لیے کام کیا۔ عام معافی کے بعد وہ پھر شام واپس آ گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب شامی رہنماؤں نے شام کی آزادی کا اعلان کیا تو شکری القوتلی کو آپ کی خدمات کی وجہ سے ۱۱۔ مارچ ۱۹۴۳ء کو جمہوریہ شام کا پہلا صدر منتخب کیا۔ وہ اس عہدے پر ۹ مارچ ۱۹۴۹ء کے فوجی انقلاب تک فائز رہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب فرانس نے شام کی نو آزاد جمہوریہ کو ختم کرنے کے لیے دمشق پر شدید گولہ باری کی اور شہر پر قبضہ کر لیا اس وقت شکری القوتلی سخت بیمار تھے۔ برطانوی سفیر نے اسی حالت میں ان سے

---

(۱) دوسرے رہنماؤں میں ہاشم الاتاشی (۱۸۷۵ء تا ۱۹۶۰ء) اور فارس الخوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہاشم الاتاشی فرانسیسی دور میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک شام کے صدر رہے۔ فارس الخوری مسیحی محب وطن تھے۔

ملاقات کی اور کہا کہ فرانسیسی فوجیں دمشق میں داخل ہوگئی ہیں اور اب واپس نہیں جائیں گی اس لیے آپ فرانس کے ساتھ صلحنامہ پر دستخط کردیں یا کسی محفوظ مقام پر منتقل ہوجائیں۔ شکری القوتلی نے برطانوی سفیر کی تجویز رد کرتے ہوئے جواب دیا کہ:

"یا تو آپ جارحیت کو روکیں یا پھر میں اپنا پلنگ اٹھوا کر سڑک پر جاتا ہوں تاکہ میں اپنی فوج کے جانبازوں کے ساتھ جان قربان کردوں"

شکری القوتلی کا یہ عزم اور حوصلہ تھا جس نے فرانس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا اور فرانسیسی فوجوں کو اگلے سال شام خالی کرنا پڑا۔

اسرائیل اور عربوں کی پہلی جنگ (۱۹۴۸ء) شکری القوتلی کے دور صدارت میں ہوئی۔ شام کی سرحد چونکہ فلسطین سے ملتی ہے اس لیے شام کا اسرائیل سے براہ راست تصادم ہوا۔ لیکن جنگ میں شام کی فوجیں کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکیں۔ شام کی اس ناکامی نے عوام میں بے چینی پیدا کردی جس سے شام کے فوجی افسروں نے فائدہ اٹھایا اور مارچ ۱۹۴۹ء میں شکری القوتلی کی جمہوری حکومت کا خاتمہ کرکے شام میں فوجی آمریت قائم کردی۔

فوجی آمریت

شام میں فوجی آمریت کا قیام شام کی بدقسمتی کا نقطۂ آغاز ہے۔ شام کے اس پہلے فوجی انقلاب کے بانی شامی فوجی کے کمانڈر انچیف حسنی الزعیم تھے ان کے دور حکومت میں جنگ آزادی کے تمام ہیرو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے کردیے گئے۔ شکری القوتلی ۱۸۔ اپریل ۱۹۴۸ء کو دوسری بار شام کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ کرنل حسنی زعیم نے ایک سال بعد ہی ۳۰۔ مارچ ۱۹۴۹ء کو ان کا تختہ پلٹ دیا اور ۳۔ جون کو خود صدر بن گئے۔ لیکن دو ماہ بعد ہی ۱۴۔ اگست کو ایک اور فوجی افسر سامی الحناوی نے کرنل زعیم کو قتل کردیا۔ اور خود آمر مطلق بن گئے۔ ان کے زمانہ میں ہاشم الاتاسی کو ۱۴۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو صدر منتخب کیا گیا، لیکن ۱۹۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ایک تیسرے فوجی افسر کرنل ادیب ششکلی نے حناوی کو قتل کردیا اور ۱۹۵۴ء تک استبدادی انداز میں حکومت کی۔ ادیب ششکلی نے شام میں پھر انتخابات کرائے لیکن تمام سیاسی جماعتوں نے مل کر انتخابات کا مقاطعہ کیا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۵۴ء میں بغاوت پھوٹ نکلی اور

کرنل ششکلی کو سعودی عرب میں پناہ حاصل کرنا پڑی۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں شام میں ایک بار پھر جمہوری اور آئینی حکومت قائم ہوئی۔ ملک میں عام انتخابات کرائے گئے جن کے بعد اگست ۱۹۵۵ء میں تیسری بار شکری القوتلی کو صدر منتخب کر لیا گیا اور مسیحی رہنما فارس الخوری کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

صدر شکری القوتلی نے ایک پر آشوب دور میں حکومت سنبھالی تھی۔ فوج اگرچہ سیاست سے بظاہر بے دخل ہوگئی تھی لیکن اس کی مداخلت اور اندرونی سازشیں جاری تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو جب اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا تو شام کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکا۔ شام میں قوم پرست بعث پارٹی اور کمیونسٹ عناصر نے زور پکڑ لیا تھا اور انھوں نے فوج کے ان عناصر کو بھی غلط راستے پر ڈال دیا جو نصیری اور دروزی فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ فوجی عناصر شام کو خالص کمیونسٹ ریاست میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں شام کے مخالف اشتراکیت حلقوں نے جن میں اخوان بھی شامل تھے اس کو مناسب سمجھا کہ شام کا مصر سے الحاق کر لیا جائے۔

مصر سے الحاق اور علیحدگی

مصر سے شام کے الحاق کی تحریک میں شکری القوتلی کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔ ستمبر ۱۹۵۷ء میں ان کی کوششوں سے شام اور مصر کے درمیان ایک فوجی معاہدہ ہوا اور یکم فروری ۱۹۵۸ء کو شام اور مصر میں اتحاد قائم ہوگیا۔ شامی حکومت ختم کر دی گئی۔ صدر قوتلی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ نئی مملکت کو متحدہ عرب جمہوریہ کا نام دیا گیا اور شام اس کا شمالی صوبہ اور مصر جنوبی صوبہ بنا دیا گیا۔

شام اور مصر کا یہ اتحاد ستمبر ۱۹۶۱ء تک قائم رہا۔ لیکن مصر اس اتحاد سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اس دوران شام کی حکومت پر بعث پارٹی قابض ہوگئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مصر نے شام کو ایک نو آبادی بنا لیا تھا اور شام میں پولیس راج قائم ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں مصر نے ان فوجی عناصر کی پشت پناہی شروع کر دی جن سے نجات پانے کے لیے شامی عوام نے یہ اتحاد قائم کیا تھا۔ بعثی اور اشتراکی عناصر کی دھاندلیوں اور قاہرہ کی بے تدبیریوں کی وجہ سے مصر اور شام کا اتحاد تین سال سات ماہ کے اندر ختم ہوگیا۔ ایک شامی فوجی افسر حیدر الکزبری نے شام کا مصر سے الحاق ختم کر دیا اور مصریوں کو ملک سے نکال دیا۔ شام کی اس علیحدگی کی وجہ صدر ناصر نے یہ بتائی کہ بعث پارٹی کی

حکومت ہرگز قائم نہیں ہوسکتی تھی لیکن اس پارٹی نے تباہ کن وسائل کے ساتھ تشدد کا راستہ اختیار کیا اور خونریزی کو مشغلہ بنایا۔ انھوں نے کہا کہ:

''بعث کا نظام خطائی نظام ہے۔ یہ عوام کی نمائندگی سے محروم ہے۔ بعث حکومت کی بنیاد خونریزی، تشدد، ورجیل خانوں پر قائم ہے''

لیکن جمال ناصر کا یہ بیان نصف صداقت ہے۔ شام کی علیحدگی کی اصل وجہ وہ ہے جو شکری القوتلی نے ایک بیان میں بتائی۔ انھوں نے کہا کہ:

''مصرف سیاست نے شام کے ان لوگوں کی کثیر تعداد پر غداری، رجعت پسندی اور استعمار پسندی کے الزام لگائے جنھوں نے چالیس سال تک وطن کی مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ شامی باشندوں کو اپنی زندگی اور روزی بھی خطرے میں گھری ہوئی نظر آنے لگی اور ہم پر ہمارے دین، ہمارے تہذیب و تاریخ اور ہماری روایات کے خلاف باہر سے درآمد کردہ نظریات ٹھونسنے شروع کیے''

مختصر یہ کہ صدر ناصر کی حکمت عملی نے اہل شام کو مصر سے ایسا متنفر کردیا کہ ان ہی لوگوں نے جو اپنی مرضی سے مصر اور شام کی یونین میں شامل ہوئے تھے اتحاد کے خاتمے کے بعد پورے ملک میں علیحدگی پر مسرت کا اظہار کیا۔

جمہوریت کی بحالی

شام کی علیحدگی کے بعد شامی پارلیمنٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس انتخاب میں غیر اشتراکی عناصر زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ بعث پارٹی کو بھی سخت ناکامی ہوئی۔ ان انتخابات نے ثابت کردیا کہ قوم پرستی اور سوشلزم کے جن نعروں کو عوام کی آواز بتایا جارہا تھا، ان کو عوام میں قطعی پسند نہیں کیا جاتا۔ انتخابات کے نتائج بعث پارٹی کے حامیوں اور سوشلسٹوں کے لیے بڑے مایوس کن ثابت ہوئے، اس لیے اب پھر فوج نے سازش شروع کردی اور ۲۸۔ مارچ ۱۹۶۲ء کو ایک فوجی دستے نے دمشق پر قبضہ کرلیا۔ ملک کی کشتی کو پھر بھنور میں دیکھ کر سابقہ پارلیمنٹ کے ارکان نے ہمت سے کام لیا اور خالد العظم کی قیادت میں نئی حکومت تشکیل کردی۔ نئے دستور پر وقت صرف کرنے کی بجائے ۱۹۵۰ء کا دستور نافذ کردیا گیا۔ بنیادی آزادیاں بحال کردی گئیں،

شام کے تمام اہل علم ارباب سیاست اور مذہبی اور سماجی تنظیموں کے رہنما اس پر متفق تھے کہ ملک کو کسی نہ کسی طرح آمریت سے بچایا جائے، چنانچہ ایک نیشنل چارٹر وضع کیا گیا جس میں ملک کے ہر طبقے کی نمائندگی تھی، ۸۔ مارچ ۱۹۶۳ء کو شامی ریڈیو سے اس چارٹر کا اعلان ہونے والا تھا کہ اسی دن صبح ایک اور فوجی انقلاب آ گیا۔ یہ بعث پارٹی کا لایا ہوا انقلاب تھا جو ناصر کی طرف سے شام میں اسلامی عناصر کو کمزور کرنے کی کوششوں اور سازشوں کے نتیجے میں ظہور میں آیا۔

بعث پارٹی کی حکومت

شام کے اس نئے انقلاب کا منصوبہ جمال ناصر کے حامیوں نے تیار کیا تھا، لیکن بعث پارٹی کے حامیوں نے غلبہ حاصل کر لیا۔ انقلابی حکومت نے شروع میں ناصر کے حامیوں کو بھی حکومت میں شامل کیا۔ مگر رفتہ رفتہ خالص بعثی گروہوں نے جو دروزیوں اور علویوں پر مشتمل تھے اور جن کی فوج میں اکثریت تھی ناصر کے حامیوں کو نکال باہر کیا اور اس طرح شام میں بعث پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔

شام کی بعث پارٹی ۱۹۴۰ء میں وجود میں آئی۔ اس کا بانی ایک عیسائی مائیکل عفلق جس کو عربی میں میشل عفلق لکھا جاتا ہے۔ یہ شخص ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک فرانس میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ وہاں سے واپسی پر اسے دمشق میں مدرسۃ التجہیز الاولیٰ میں اسلامی تاریخ کا مدرس مقرر کیا گیا۔ یہاں اس نے طلبہ کے سامنے اس نظریے کی اشاعت کی کہ اسلام خالص عربوں کی تحریک تھی اور غیر عربوں نے اس میں شامل ہو کر اسے بگاڑ دیا اور یہ کہ مشرکین عرب محض حزب اختلاف کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں جب کرنل حسنی الزعیم برسر اقتدار آئے تو مائیکل عفلق کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ مائیکل عفلق نے اپنے اس عہدے سے فائدہ اٹھایا اور شام کے مدرسوں میں اپنے ہم خیالوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو ہر جگہ بھر دیا۔ نُصیری اور دروزی باشندوں میں جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے سواد اعظم کے مخالف رہے ہیں، مائیکل عفلق کے نظریات نے زیادہ مقبولیت حاصل کی اور مائیکل عفلق نے ان ہی نُصیری اور دروزی حامیوں کے ذریعے شامی فوج کے اندر اپنے خفیہ حلقے قائم کر لیے۔ عیسائیوں میں بھی عفلق کے نظریات کو پسند کیا گیا۔ اس طرح

بعث پارٹی نصیریوں، دروزیوں [1] اور عیسائیوں اور فوج کی مدد سے جس میں فرانسیسی دور سے بھی نصیریوں اور دروزیوں کی اکثریت چلی آرہی ہے ۱۹۶۳ء میں شام پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جہاں تک شام کے عام مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں کا تعلق ہے وہ بعث پارٹی سے ہمیشہ بے تعلق رہے ہیں۔

۸۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں جب بعث پارٹی اقتدار میں آئی تو جنرل امین الحافظ شام کے صدر مقرر کیے گئے۔ لیکن دسمبر ۱۹۶۵ء میں بعث پارٹی دائیں اور بائیں دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ صدر امین الحافظ کا تعلق دائیں بازو سے تھا۔ ۲۳۔ فروری ۱۹۶۶ء کو بعث پارٹی کے انتہا پسند بائیں بازو نے صدر امین الحافظ کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور ڈاکٹر نور الدین الاتاسی شام کے صدر بن گئے۔ امین الحافظ اور عفلق کو شام سے جلاوطن کر دیا۔ ان عناصر کو پارٹی اور حکومت سے خارج کرنے کے بعد نصیری گروپ نے دروزی گروپ کو بھی حکومت سے بیدخل کر دیا اور اب صرف نصیری رہ گئے ہیں اور شام اس وقت ان ہی کے قبضے میں ہے۔ ایسی کمزور حکومت کے لیے جس نے پورے ملک کو اپنا دشمن بنالیا ہو تنہا حکمرانی کرنا مشکل تھا۔ اس لیے شام کی بعثی حکومت نے خود کو غیر مشروط طور پر روس کی گود میں ڈال دیا۔

بعث پارٹی کے بائیں گروپ نے شام میں جو متحدہ محاذ بنایا تھا اس کا نام ''عوامی محاذ'' رکھا گیا۔ یہ محاذ بعثی اور کمیونسٹوں پر مشتمل تھا جبکہ اصل میں کمیونسٹ ہی اس کے روح رواں تھے۔ ویسے بھی بعث پارٹی کے نظریات اور کمیونزم میں بہت کم فرق ہے اور اشتراکیت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے روس اور چین نے جو طریقہ اختیار کیا ہے بعث پارٹی بھی اسی طریقے کی علمبردار ہے۔ چنانچہ بعثی وزیر اعظم صلاح الدین بیطار نے پارٹی کے نظریات کی ایک بیان میں اس طرح وضاحت کی:

''سب سے پہلے میں بعث کے شعار سے ابہام دور کرنا چاہتا ہوں عرب اشتراکیت کے لفظ سے یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم اشتراکیت (سوشلزم) کی کوئی نئی قسم ایجاد کر رہے ہیں۔ میں یہ

(۱) صلیبی جنگوں کے زمانے میں دروزیوں نے کھل کر صلیبیوں کی مدد کی تھی اور منگول ان ہی کی مدد سے شام میں داخل ہوئے۔ قرامطہ جنھوں نے عباسی دور میں خانہ کعبہ کی توہین کی اور حجر اسود اٹھا کر الحساء لے گئے تھے ان نصیریوں اور دروزیوں سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔

واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ہماری نگاہ میں اشتراکیت کی ایک ہی قسم ہے اور وہ ہے سائنٹفک سوشلزم۔ چنانچہ مارکسزم ہمارے نزدیک اشتراکی نظریہ کا اساسی ماخذ ہے"

فروری ۱۹۶۶ء میں جب بعث پارٹی کے بائیں بازو نے انقلاب برپا کیا۔ تو نئے صدر ڈاکٹر نورالدین اتاسی نے ایک بیان میں واضح کیا کہ ہمارا مشن سائینٹفک سوشلزم یعنی مارکسزم کا نفاذ ہے۔ عفلق نے اشتراکیت کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ ہم مارکسزم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے ہم مارکسزم سے بہت کچھ مواد اخذ کریں گے۔

بعث پارٹی نے اپنے نظریات کو طبقاتی جنگ اور تشدد کے ذریعہ نافذ کیا۔ سب سے پہلے حکومت سے مخالف عناصر کو ختم کیا گیا پھر فوج سے نومبر ۱۹۶۶ء میں انقلابی مزدوروں کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی گئی۔ اس کے بعد شام کے عام لوگوں کو غیر مسلح کردیا گیا اور انقلابی مزدوروں کو اسلحہ فراہم کردیے گئے۔ یہ تنظیم ان ہی خطوط پر قائم کی گئی ہے جن خطوط پر چین میں ریڈ گارڈز تنظیم قائم ہے۔ ان مزدوروں کو اجازت تھی کہ جس جگہ قدامت پسندی کی آواز اٹھے اسے وہیں دبا دیں۔ بعث پارٹی کے اس دور میں صنعتوں اور زرعی املاک کو بغیر کسی معاوضہ کے قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ شام میں بعث پارٹی کے بائیں بازو کا یہ دور بدترین جبر و استبداد کا دور تھا۔ اس میں اسلامی عناصر کو خاص طور پر چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔ مئی ۱۹۶۷ء میں جب بعثی حکومت کے ایک سرکاری ہفت روزہ "جیش الشعب" نے اسلام پر کھلم کھلا حملے شروع کیے تو مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا اور ملک گیر ہڑتال کی۔ لیکن حکومت نے عوام کو پرامن طریقے سے مطمئن کرنے کے بجائے انھیں تشدد کا نشانہ بنایا۔ مسلح مزدوروں نے دوکانوں کے تالے توڑے، احتجاج کرنے والوں کو جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ ابھی مظاہرے اور ہڑتالیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے حملہ کردیا۔ مسلمانوں نے اقلیتی فرقہ کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا اور مسجدوں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ مگر حکومت نے انتقامی کاروائی میں مسجدوں کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا۔ دمشق کی جامع مسجد پر گولہ باری کی اور عین حالت نماز میں نمازیوں کو شہید کیا گیا۔ لوگوں کی ڈاڑھیاں نوچی گئیں اور ناخن اکھاڑے گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اسرائیل کا کس طرح مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ شامی فوجیں میدان جنگ میں آگے بڑھنے کی بجائے دمشق میں یعنی حکومت کی حفاظت کررہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسرائیل نے مصر اور اردن کی فوجوں کو شکست دینے کے بعد

شام کا رخ کیا اور جبل جولان کے علاقے میں کئی سو مربع میل کے رقبہ پر قبضہ کرلیا۔

بعث پارٹی کے اس دور میں شام کی معیشت کو بھی زبردست دھکا لگا۔ یعنی انقلاب سے پہلے شام مشرق وسطیٰ کے عرب ملکوں میں سب سے زیادہ خوشحال تھا لیکن بعث پارٹی کے ابتدائی سات سالہ دور میں حالات اس کے برعکس ہوگئے صحافی، صنعت کار، تاجر، سرکاری ملازمین بڑی تعداد میں ملک چھوڑ کر جانے لگے، شام کا سرمایہ لبنان منتقل ہوگیا، کارخانے اور فیکٹریاں بند ہوگئیں۔

شام کے تمام محب وطن رہنما جنھوں نے شام کی آزادی اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا بعثی انقلاب آنے کے بعد ہی بیروت میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ ان رہنماؤں میں شکری القوتلی، ناظم القدسی، مصطفیٰ سباعی اور معروف دوالیبی کے نام قابل ذکر ہیں۔ شکری القوتلی اپنے کردار کی بلندی اور قربانیوں کی وجہ سے جن کا پیچھے صفحات میں ذکر کیا جاچکا ہے اہل شام میں نہایت ہردلعزیز تھے۔ انھوں نے اپنی ساری جائیداد شام کی آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کر دی تھی۔ لیکن شام و مصر کے سوشلسٹ اور بعثی عناصر نے ان کو بھی دل کھول کر بدنام کیا۔ آخر آزادی کے اس سپاہی نے یکم جولائی ۱۹۶۷ء کو بیروت کے ہوٹل میں انتقال کیا۔ وہ پچھلے ماہ کی عرب اسرائیلی جنگ کے نتیجے سے جس کے دوران مسلمان بیت المقدس سے محروم ہوگئے تھے بہت متاثر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جب ٹیلیویژن کھولا تو ایک عرب مغنی ایک مرثیہ گا رہا تھا ''ہائے پرانا بیت المقدس'' اس گیت کو سن کر شکری القوتلی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ انھوں نے اپنی بیوی کو آواز دی:

''سنا تم نے بیت المقدس اب ایک مرثیہ بن گیا ہے''

شکری القوتلی پر رنج وغم کا ایسا غلبہ ہوا کہ ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی نعش دمشق پہنچائی گئی جہاں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ان کو دفن کیا گیا۔

تیسرا بعثی انقلاب

فلسطین کی جنگ میں ناکامی، اقتصادی بدحالی اور حکومت کی اسلام کش پالیسی نے بعث کی حکومت کو شام میں غیر ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ لیکن عوام فوج کے ہاتھوں بے بس تھے۔ خود بعث پارٹی کے اندر اختلافات بڑھتے جا رہے تھے اور پارٹی کے دائیں اور بائیں بازو کی کشمکش بڑھتی چلی

جارہی تھی۔ یہ حالات تھے کہ پارٹی کے دائیں بازو نے جو اعتدال پسند تھا ۱۳۔نومبر ۱۹۷۰ء کو بائیں بازو کی انتہا پسند حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور ڈاکٹر نورالدین اتاسی کو ہٹا کر جنرل حافظ الاسد شام کے صدر ہو گئے۔

حافظ اسد شام کے صوبے لاذقیہ کے ایک قصبہ میں ۱۹۲۸ء یا ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ بھی بعث پارٹی کے دوسرے حکمرانوں کی طرح نُصیری ہیں جن کو شام میں علوی بھی کہا جاتا ہے اور جو لاذقیہ کے علاقے میں آباد ہیں۔ حافظ اسد نے ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد حمص کے فوجی کالج میں ۱۹۵۲ء میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۵ء میں وہ پائلٹ افسر ہو گئے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کو تعلیم کے لیے روس بھیجا گیا۔ مصر اور شام کے الحاق کے بعد حافظ اسد کا ۱۹۵۹ء میں قاہرہ میں اسکواڈرن لیڈر کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔ وہ تعلیم کے فوراً بعد ہی ''حزب البعث العربی اشتراکی'' کے ممبر ہو گئے تھے۔ وہ شام کی مصر سے علیحدگی کے خلاف تھے، اس لیے جب ستمبر ۱۹۶۱ء میں شام نے متحدہ عرب اتحاد سے علیحدگی اختیار کی تو حافظ اسد کو فوج سے الگ کر دیا گیا۔ ۸۔مارچ ۱۹۶۳ء کو جب بعث پارٹی کی خفیہ فوجی کمیٹی نے شامی حکومت پر قبضہ کیا اور بعث پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو حافظ اسد شامی فضائیہ کے کمانڈر مقرر کیے گئے۔ ۲۳۔فروری ۱۹۶۶ء کو جب پارٹی کے انتہا پسند بائیں بازو نے حکومت پر قبضہ کیا تو وہ وزیر دفاع تھے۔

حافظ اسد نہ صرف بعث پارٹی کے اعتدال پسند گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ خود بھی متوازن اور اعتدال پسند انسان ہیں۔ ان کو اقتدار میں آئے ہوئے آٹھ سال ہو چکے ہیں۔ اس مدت میں شہری آزادیوں پر پابندیاں نرم کی گئیں اور چھوٹے پیمانے پر نجی کاروبار کی اجازت ملی۔ صدر اسد روس کے ساتھ ساتھ مغربی ملکوں اور ان عرب ملکوں سے بھی جن کو وہ قدامت پسند سمجھتے ہیں تعلق قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ حافظ اسد نے مارچ ۱۹۷۲ء میں شام کی پانچ سوشلسٹ پارٹیوں پر مشتمل ایک ''قومی ترقی پسند محاذ'' بنایا ہے جس کے وہ خود صدر ہیں۔ یہ محاذ حسب ذیل پانچ پارٹیوں پر مشتمل ہے۔ بعث پارٹی، شامی عرب سوشلسٹ یونین، عرب سوشلسٹ پارٹی، سوشلسٹ یونین اور کمیونسٹ پارٹی شام جس کے رہنما ایک کرد خالد بغداش ہیں۔ قومی محاذ میں نصف نشستیں غیر بعثی سوشلسٹوں کو دی گئی ہیں۔

شام فلسطینی چھاپہ ماروں کا سرگرم سرپرست تھا۔ ان چھاپہ ماروں کا ایک گروپ جو صاعقہ

کہلاتا ہے براہ راست شامی فوج کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ لیکن اپریل ۱۹۷۱ء میں شام نے اسرائیل کے خلاف چھاپہ ماروں کو کاروائی کرنے سے روک دیا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں جب مصر نے اپنے علاقوں کی واپسی کے لیے اسرائیل پر حملہ کیا تو شام نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا اور شام اگرچہ جولان کے علاقے سے اسرائیلیوں کو بیدخل نہیں کر سکا لیکن ۱۹۷۴ء میں اسرائیل کے ساتھ ایک تصفیہ ہو گیا جس کے تحت جولان کے علاقے سے شام اور اسرائیل دونوں نے اپنی فوجیں واپس بلالیں اور ایک غیر فوجی علاقہ قائم کر کے اس میں اقوام متحدہ کی فوجیں تعینات کر دی گئیں۔ جولان کے کچھ حصے شام کو واپس بھی مل گئے۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں مصر اور اسرائیل کے درمیان فوجوں کی علیحدگی سے متعلق جو معاہدہ ہوا شام نے اس کو منظور نہیں کیا۔ امریکہ سے شام کے تعلقات ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد ختم ہو گئے تھے لیکن ۱۹۷۴ء سے پھر بحال ہو گئے۔

صدر اسد کے دور میں پڑوسی ملکوں سے بھی شام کے تعلق بہتر ہو گئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں شام نے اردن سے تعلقات توڑ لیے تھے، لیکن ۱۹۷۳ء میں شام اور اردن میں تصفیہ ہو گیا۔ ۱۹۷۵ء میں اردن کے شاہ حسین اور شام کے حافظ اسد نے ایک مستقل مشترکہ کمانڈ کونسل قائم کرنے کا اعلان کیا تاکہ دونوں ملکوں کی سیاسی معاشی اور ثقافتی پالیسیوں میں ربط پیدا کیا جا سکے۔ عراق سے ۱۹۷۵ء سے فرات کے پانی کے تنازعہ کی وجہ سے تعلقات خراب ہو گئے تھے لیکن اسی سال اگست میں سعودی عرب کی مداخلت سے تعلقات بہتر ہو گئے۔ لبنان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی خانہ جنگی میں شام کا کردار کسی قدر مسلمانوں کے خلاف رہا لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ شام کی فوجی مداخلت کی وجہ سے فریقین نے جنگ بندی کو تسلیم کر لیا۔

صدر اسد کے زمانہ میں مصر سے بھی قریبی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں دونوں ملکوں کی مشترکہ کمان بنانے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ لیکن ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد یہ تعلقات برقرار نہ رہ سکے اور جب مصر نے اسرائیل سے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر دستخط کر دیے تو بیشتر عرب ملکوں کی طرح شام نے بھی ستمبر ۱۹۷۸ء میں مصر سے سیاسی اور معاشی تعلقات ختم کر دیے۔

شام کے روس سے بہت گہرے فوجی اور اقتصادی تعلقات قائم ہیں اور شام خود کو ابھی تک روسی اثرات سے آزاد نہیں کرا سکا ہے۔ حافظ اسد نے جولائی ۱۹۷۲ء میں روس جا کر ستر کروڑ ڈالر کی فوجی اور معاشی امداد حاصل کی۔ شام میں ایک ہزار سے زیادہ روسی مشیر موجود ہیں اور شام کی نصف

تجارت روس سے ہوتی ہے۔ بعثی انقلاب سے پہلے اس تجارت کا تناسب صرف دس فیصد تھا۔

اب کچھ مدت سے روس کے ساتھ تعلقات میں بھی سرد مہری آ گئی ہے۔ جون ۱۹۷۸ء میں شام نے تو صحافیوں کو جن کا شام کے سرکاری اخبارات شرین، البعث اور الشورہ سے تعلق تھا روس نواز طرز عمل کی وجہ سے لکھنے سے منع کر دیا ہے۔ لیکن جنوری ۱۹۸۰ء میں شام اور جنوبی یمن نے جنرل اسمبلی میں افغانستان میں روسی مداخلت کے خلاف قرارداد کی مخالفت میں رائے دی تھی۔

شامی فوجیں زیادہ تر روسی اسلحہ سے آراستہ ہیں۔ شام فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے اور فضائیہ ۲۵ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ شام کی نصف فوج علویوں پر مشتمل ہے اور فوج کے اعلیٰ افسروں اور بعث پارٹی کے عہدیداروں کی اکثریت علوی ہے۔

شام میں اسلامی تحریک

شام عرب ملکوں میں خصوصاً العرب الشرقی میں مصر کے بعد سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ عربوں کی بیداری میں شام کے رہنماؤں اور اہل قلم حضرات کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ان رہنماؤں اور مصنفوں میں کئی اپنے اسلامی رجحانات کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں مثلاً امیر شکیب ارسلان، رشید رضا مصری، مصطفیٰ حسن سباعی اور محمد معروف دوالیبی۔ رشید رضا مصری کے حالات ہم نے مصر والے باب میں لکھے ہیں۔ باقی تین رہنماؤں کے حالات ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

امیر شکیب ارسلان: ان کا لبنان کے ایک اعلیٰ دروزی [1] گھرانے سے تعلق تھا۔ ان کا سلسلۂ نسل قبل از اسلام کے ملوک حیرہ کے تنوخی خاندان سے ملتا ہے۔ وہ لبنان کی بستی شویفات میں ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بیروت کے مدرسہ دارالحکمت میں تعلیم پائی اور طالب علمی ہی کے زمانے میں مفتی محمد عبدہ اور رشید رضا مصری سے متاثر ہو گئے تھے جو اس زمانے میں بیروت میں جلاوطنی کا زمانہ گزار رہے تھے۔ بعد میں وہ رشید رضا مصری سے بھی متاثر ہوئے۔ شکیب ارسلان ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۸ء تک حوران (شام) سے عثمانی پارلیمنٹ کے ممبر بھی

---

(۱) جبل دروز کے لوگ دروزی کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی اکثریت فرقہ دروزی سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن سب لوگ دروزی فرقہ کے پیرو نہیں۔ شکیب ارسلان بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

رہے۔ وہ ترکوں اور عربوں کے اتحاد کے سرگرم حامی تھے۔ وہ عثمانی خلافت کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور عربوں کی مکمل آزادی کی بجائے عثمانی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے عربوں کی خودمختاری کے حامی تھے۔ جنگ عظیم اول کے دوران وہ دمشق میں رہے۔ اس کے بعد وہ جنیوا چلے گئے لیکن جب شام کے قوم پرستوں نے ۱۹۲۰ء میں دمشق میں کانگریس طلب کی جس میں شاہ فیصل کو شام کا حکمران منتخب کیا گیا تو امیر شکیب ارسلان ہی نے اس کی صدارت کی۔

امیر شکیب ارسلان ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۶ء تک زیادہ تر سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں رہے جہاں انھوں نے اپنا مرکز قائم کرلیا تھا۔ چونکہ جمعیت اقوام کا مرکز بھی اسی شہر میں تھا اس لیے وہ یہاں سے اسلامی دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہوسکتے تھے۔ جنیوا سے وہ (la nation arabe) کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک رسالہ نکالتے تھے جو عربوں کی آزادی اور اسلامی دنیا کے مسلمانوں کے حقوق کا پرزور علمبردار تھا۔ امیر شکیب ارسلان نے بارہا جمعیت اقوام میں عربوں کی ترجمانی کی اور عرب ملکوں کے نمائندے کی حیثیت سے فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں سے مذاکرات کیے۔ انھوں نے جمعیت اقوام میں اسکندرونہ اور انطاکیہ کو شام میں شامل کرنے کی حمایت کی۔ ۱۹۳۰ء میں جب فرانسیسیوں نے مراکش کے قبائل پر فرانسیسی قانون فوجداری کے اطلاق کا فیصلہ کیا تو امیر شکیب ارسلان نے پوری اسلامی دنیا میں اس کے خلاف اور اسلامی قانون کے حق میں پرزور مہم چلائی۔ جنیوا میں ان کا دفتر یورپ میں عرب قوم پرستوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ شمالی افریقہ کی تحریک آزادی میں بھی امیر شکیب ارسلان کا کردار اہم رہا ہے۔ مراکش کے ممتاز ترین سیاسی رہنما علال الفاسی اور محمد حسن وزانی نے ان سے تعاون کیا اور احمد بالافرج نے ان کے دفتر میں پناہ حاصل کی۔ شمالی افریقہ کے عربوں اور المشرق العربی کے درمیان وہ ایک واسطہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

امیر شکیب ارسلان عربوں کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ ساری اسلامی دنیا کے مسائل سے گہری دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اسلام کو عرب قومیت پر ترجیح دیتے تھے اور اتحاد اسلامی کے زبردست علمبردار تھے اور غیر عرب مسلمانوں کے حقوق کے لیے بھی انھوں نے مسلسل جنگ لڑی۔ دنیا کے ہر حصے کے مسلمان ان سے اپنے مسائل کے حل میں مدد لیتے تھے۔ وہ حبش میں مسلمانوں پر مظالم کی وجہ سے نجاشی کے سخت خلاف تھے اور جب نجاشی نے حبشی مسلمانوں کو حقوق دینے سے متعلق

ان کے مطالبات پر عمل نہیں کیا تو انھوں نے حبش پر اطالوی تسلط کی حمایت کی کیونکہ اٹلی نے حبشی مسلمانوں کو وسیع حقوق دینے کا اعلان کر دیا تھا۔

امیر شکیب ارسلان عربی زبان کے مورخ اور بڑے انشا پرداز تھے اور اعلیٰ درجہ کے مقرر اور امیر البیان کے لقب سے مشہور تھے۔ عربی کے علاوہ فرانسیسی پر ان کو مکمل عبور تھا۔ جرمن اور انگریزی زبان بھی کسی قدر جانتے تھے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) الحلل السیاسیہ فی الرحلۃ الاندلسیہ: یہ تین جلدوں میں اندلس کی تاریخ ہے اور ۱۹۳۰ء میں اندلس کے سفر کے بعد لکھی۔

(۲) غزوات العرب فی فرنسہ وشمالی اطالیہ۔ وفی سویسرہ: اس کتاب کا ''جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے'' کے نام سے اردو میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

(۳) تاریخ ترک والدولۃ العثمانیہ: یہ ۱۹۱۴ء تک سلطنت عثمانیہ کی مفصل تاریخ ہے۔

(۴) تاریخ لبنان۔

(۵) حاضر العالم الاسلامی: یہ ایک انگریز مصنف (Lothrop Btaddard) کی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن امیر شکیب ارسلان نے اپنے حواشی کے ذریعہ اس کو پوری اسلامی دنیا کی تاریخ میں تبدیل کر دیا۔ اس میں بیشتر اسلامی ممالک کے حالات و مسائل تاریخی پس منظر کے ساتھ چار جلدوں میں پیش کیے گئے ہیں۔

(۶) لماذا تاخر المسلمون: اس کتاب کا ''مسلمانوں کے زوال کے اسباب'' کے نام سے اردو میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

(۷) السید رشید رضا۔

(۸) اناطول فرانس۔

(۹) رحلۃ الی الحجاز (سفر نامہ حجاز)

(۱۰) رحلۃ الی المانیہ (سفر نامہ جرمنی)

(۱۱) شوقی اوصداقۃ اربعین سنہ۔

امیر شکیب ارسلان شاعر بھی تھے اور ان کا کلام دیوان کی شکل میں موجود ہے۔ وفات سے کچھ قبل بیروت آ گئے تھے اور وہیں ۱۳۶۶ھ، ۱۹۴۶ء میں انتقال کیا۔ قبر آبائی گاؤں شویفات میں ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی سباعی

حمص میں آل سباع کے ایک علم دوست اور دینی گھرانے میں ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں قرآن حفظ کیا۔ ۱۹۴۱ء میں جامع ازہر سے سند حاصل کی۔ حمص اور دمشق میں معلم کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ شام کے شہروں میں "المعہد العربی الاسلامی" کے نام سے مدرسے قائم کیے جن میں دینی اور اخلاقی تربیت کا انتظام تھا۔ دمشق کے لا کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں خود ایک شریعت کالج قائم کیا۔ پھر شام یونیورسٹی میں شعبہ فقہ اسلامی کے صدر ہو گئے۔ جب شام یونیورسٹی نے ایک فقہی انسائیکلوپیڈیا کی تدوین شروع کی تو سباعی اس کی مجلس ادارت کے صدر مقرر کیے گئے۔ مصر سے الحاق کے بعد وہ متحدہ عرب جمہوریہ کی وزارت اوقاف کے تحت تدوین حدیث بورڈ کے رکن بھی ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ قید و بند کے مرحلوں سے گزرے۔ شام کی آزادی کی جدوجہد میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ وہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۱ء میں گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں گرفتار ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں وہ جامعہ ازہر میں داخل ہوئے لیکن اگلے سال ہی برطانوی حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا اور وہ ۱۹۴۰ء تک نظر بند رہے۔ ۱۹۴۱ء میں جب وہ شام واپس آئے تو فرانسیسیوں نے گرفتار کر لیا اور ڈھائی سال تک ان کو قید رکھا۔ ۱۹۴۳ء میں جب وہ رہا ہوئے تو شام میں آزادی کی جنگ پورے شباب پر تھی۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے ایک سپاہی کی حیثیت سے فرانسیسیوں سے جنگ کی۔ اسی سال ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے جو حسن البنا سے مصر کے قیام کے دوران متاثر ہو چکے تھے شام میں اخوان المسلمون کی تنظیم قائم کی اور اس کے مراقب عام یعنی سربراہ منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین کے لیے انھوں نے شباب المومن کے نام سے رضا کار دستے منظم کیے اور جہاد فلسطین میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں مصطفیٰ سباعی دمشق سے شامی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں وہ پارلیمنٹ کے نائب اسپیکر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر سباعی کو کئی مرتبہ وزارت کی بھی پیشکش ہوئی لیکن انھوں نے منظور نہیں کی۔ اور قانون ساز اسمبلی کے ایک رکن کی حیثیت سے کام کرنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے مزدوروں کے حقوق سے متعلق

قوانین بنوائے اور دیہات کے لوگوں کے مسائل حل کیے۔ مصطفیٰ سباعی دوسری مرتبہ شامی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب نہیں ہو سکے کیونکہ ایک عالم دین ان کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے جس کی وجہ سے اسلام پسندوں کے ووٹ تقسیم ہو گئے اور ایک سوشلسٹ کامیاب ہو گیا۔ ایک قانون داں اور عالم کی حیثیت سے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور یورپی ملکوں کا دورہ کیا۔ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے ماسکو یونیورسٹی کی دعوت پر سوویٹ یونین کا طویل علمی سفر کیا۔ مصطفیٰ سباعی ایک صاحب فکر مصنف تھے۔ انھوں نے اپنے افکار کا اظہار سب سے پہلے معروف اسلام پسند ادیب محب الدین خطیب کے رسالے ''الفتح'' میں مضمون نگاری سے کیا۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے دمشق سے روزنامہ ''المنار'' جاری کیا جسے ۱۹۴۹ء میں حسنی زعیم کی فوجی حکومت نے بند کر دیا ۱۹۵۵ء میں جب شام میں دستور سازی کی مہم چلی تو ہفت روزہ ''الشہاب'' جاری کیا جو ۱۹۵۸ء میں شام اور مصر کے الحاق تک جاری رہا۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے ''حضارۃ الاسلام'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو بعثی انقلاب تک جاری رہا۔ ان تمام اخباروں نے عرب دنیا میں اسلامی افکار کی اشاعت میں اہم حصہ لیا۔ مصطفیٰ سباعی نے ۳۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء، ۱۳۸۴ھ کو دمشق میں وفات پائی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی سباعی ایک بلند پایہ اور صاحب فکر مصنف تھے۔ ان کی وفات کے وقت تک اکیس کتابیں چھپ چکی تھیں اور سات زیر طبع تھیں۔ ان کے علاوہ کئی کتابیں زیر تکمیل تھیں۔ ان کی کتابوں کے موضوع فقہ، قانون، اور معاشرتی علوم تھے۔ اہم تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱) المراۃ بین الفقہ والقانون۔

(۲) ھکذا علمتنی الحیاۃ۔

(۳) القلائد۔

(۴) قانون اسلامی میں سنت کا مقام: اس کتاب پر مصطفیٰ سباعی کو ڈاکٹریٹ کی سند ملی اور اس کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

(۵) اشتراکیۃ الاسلام: اس فکر انگریز کتاب پر متحدہ عرب جمہوریہ کی سپریم کونسل آف اسلامک کلچر نے ڈاکٹر سباعی کو اول انعام دیا۔ ترکی میں اس کتاب کا ترجمہ اسلامی سوشلزم کے نام سے ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر سباعی نے بھی ترکی کے پروفیسر نور الدین توپچو کی طرح اسلام کے معاشی

نظام کے لیے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ لیکن یہ محض اصطلاح کی حد تک ہے ورنہ سوشلزم کے نظریات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مصطفیٰ سباعی خالص اسلامی مفکر ہیں۔

(۶) شرح قانون الاصول الشخصیہ۔

(۷) الوصایا والفرائض۔

(۸) الدین والدولۃ فی الاسلام یعنی اسلام میں دین اور ریاست۔

(۹) نظام السلم والحرب فی الاسلام۔

(۱۰) مشروعیۃ الارث۔

(۱۱) المرونہ والتطور۔

ان کے علاوہ مصطفیٰ سباعی کی نشری تقریریں بھی بڑی پسند کی جاتی تھیں اور ان کے دو مجموعے من روائع حضارتنا اور اخلاقنا الاجتماعیہ بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی

ڈاکٹر دوالیبی نے حلب کے شریعت کالج میں علوم شریعیہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد پیرس یونیورسٹی کے لا کالج سے رومن قانون میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ دمشق یونیورسٹی کے لا کالج میں اصول قانون اور رومن قانون کے پروفیسر ہو گئے۔ ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی حزب الشعب کے رہنما تھے۔ وہ کئی سال شامی پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ اور کئی مرتبہ شام کے وزیراعظم بھی رہے۔ ڈاکٹر دوالیبی بڑے متوازن خیالات رکھتے ہیں اور انھوں نے شام میں ہمیشہ اسلام پسند عناصر کا ساتھ دیا۔ اخوان المسلمون اور پاکستان کی اسلامی تحریکوں خصوصاً جماعت اسلامی سے ان کو گہری دلچسپی رہی۔ مصروشام کے اتحاد سے پہلے شام میں جو دستور رائج تھا اس کی تدوین میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس دستور میں کتاب وسنت کو قانون کا مآخذ تسلیم کیا گیا تھا اور یہ دستور ڈاکٹر دوالیبی اور ڈاکٹر سباعی وغیرہ کی کوششوں کا رہین منت تھا۔ ڈاکٹر دوالیبی ۱۹۶۲ء کے فوجی انقلاب کے وقت شام کے وزیراعظم تھے۔ اس کے بعد وہ نظربند کر دیے گئے۔ رہائی کے بعد بیروت چلے گئے اور پھر بعثی انقلاب کے بعد شاہ فیصل کی دعوت پر سعودی عرب چلے گئے جہاں شاہ فیصل نے ان کو اپنا خصوصی مشیر مقرر کیا۔ وہ اس وقت شاہ خالد کے خصوصی مشیر

ہیں۔ مفتی اعظم فلسطین کے انتقال کے بعد ڈاکٹر دوالیبی ان کی قائم کردہ تنظیم موتمر عالم اسلامی کے صدر منتخب کیے گئے۔ وہ کئی مرتبہ پاکستان آچکے ہیں۔ غالباً پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں پاکستان آئے تھے۔ فروری ۱۹۷۸ء میں بھی آئے تھے اور ۱۹۷۹ء میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں حکومت پاکستان کی دعوت پر دو مرتبہ پاکستان آئے۔ ڈاکٹر دوالیبی کی تمام تصانیف فقہ اور قانون کے موضوع پر ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ الوجیز فی الحقوق الرومانیہ۔ رومی قانون سے متعلق ہے اور اس پر دوالیبی کو پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند ملی۔

۲۔ المدخل الیٰ الحقوق الرومانیہ (مقدمہ قانون روما)۔

۳۔ المدخل الی السنۃ وعلومہا۔

۴۔ الاجتہاد فی الحقوق الاسلامیہ (فرانسیسی زبان میں اجتہاد کے موضوع پر ہے)

۵۔ المدخل الی علم اصول فقہ۔

ان کے علاوہ قومیت عرب اور عربوں کے ماضی اور مستقبل پر لیکچروں کا مجموعہ بھی کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔

شام کے دوسرے ممتاز مصنف حسب ذیل ہیں:

محمد کرد علی (۱۸۷۶ء تا ۱۹۵۳ء)

ممتاز مورخ اور محقق تھے۔ شام کے وزیر تعلیم رہ چکے تھے اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک شام کے مشہور تحقیقی ادارے مجمع العلمی کے رئیس رہے۔ المکی فی مصر، خطط شام، تاریخ ابن طولون، فلاسفۃ الاسلام اور الاسلام والحضارۃ العربیہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ خطط شام میں انھوں نے کئی جلدوں میں شام کی تاریخ لکھی ہے۔ الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ اسلام اور عربی تمدن کے نام سے ۱۹۵۲ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ (ہندوستان) سے شائع ہو چکا ہے۔

محمد راغب الطباخ (۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء)

حلب کے شریعت کالج کے شعبۂ حدیث و تاریخ کے استاد تھے۔ انھوں نے العالم النبلا بتاریخ حلب کے نام سے سات جلدوں میں حلب کی ضخیم تاریخ لکھی ہے جس میں ان تمام مشاہیر

کے حالات تفصیل سے دیے ہیں جو عہد قدیم سے موجودہ دور تک حلب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کتاب ''الثقافۃ الاسلامیہ'' کا دو حصوں میں ''تاریخ افکار و علوم اسلامی'' کے نام سے اردو ترجمہ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ شام میں مولانا مودودی کی تصانیف کی نشر و اشاعت کا آغاز محمد راغب طباخ نے ہی کیا تھا۔

مصطفیٰ احمد زرقا

شام کے موجودہ علماء میں بہت ممتاز ہیں۔ ازہر اور مصری یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ شام کے مدرسہ قانون اور شریعت کالج میں اسلامی قانون اور سول لا کے پروفیسر ہیں۔ شامی پارلیمنٹ کے رکن بھی رہے۔ متعدد بین الاقوامی مذاکروں میں شام کی نمائندگی کی۔ قانون کے موضوع پر کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔

اقلیتی اقتدار

آزادی کے بعد شام کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کی جو کوششیں کی گئیں ان میں مذکورہ بالا تین رہنماؤں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان رہنماؤں کی بدولت شام عرب دنیا میں اسلامی تحریک کا دوسرا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ لیکن بعث انقلاب کے بعد شام میں اسلامی تحریک کو شدید دھکا پہنچا۔ صدر اسد اگرچہ سابق بعث رہنماؤں کے مقابلہ میں اعتدال پسند ہیں لیکن وہ اور ان کی ہم خیال دوسری سوشلسٹ جماعتیں اسلام کو بحیثیت ایک قوت ابھرنے کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ ہندوستان کے ایک ممتاز عالم اور رابطۂ عالم اسلامی کے رہنما مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۳ء کے درمیان چار مرتبہ شام کا سفر کیا تھا۔ ان میں سے پہلے دو سفر بعثی انقلاب سے پہلے کیے تھے اور دو بعثی انقلاب کے بعد۔ بعثی انقلاب کے بعد شام کی زندگی میں جو نمایاں تبدیلیاں انھوں نے محسوس کیں وہ یہ تھیں:

۱۔ ہر جگہ جاسوس پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں بھی آپ کا قیام ہوگا، کچھ آنکھیں آپ کی نگرانی میں اور کچھ کان آپ کی گفتگو سننے میں مصروف ہوں گے۔

۲۔ وسیع پیمانے پر بے پردگی، عجیب و غریب قسم کا جنسی اختلاط راستوں اور سڑکوں پر ہر طرف فحش تصاویر اور جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اشتہارات لگے ہوئے تھے۔

اور ہم کو اندازہ ہوا کہ جو شہر اپنی قدامت پسندی اور وضعداری کے لیے مشہور تھا اب آزادی بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط میں بہت آگے جا چکا ہے۔

۳۔ ملک اقتصادی پس ماندگی اور کسی قدر بدحالی کا شکار ہے۔ آمدنی کے ذرائع تقریباً مفقود ہیں اور شام اس خوشحالی سے محروم ہو چکا ہے۔ جس میں گزشتہ عہد میں اسے امتیاز حاصل تھا۔[1]

شام کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۸۷ فیصدی ہے اور عیسائیوں کا تناسب تیرہ فیصد۔ مسلمانوں میں سنی تقریباً اسی فیصد ہیں، تیرہ فیصدی نُصیری ہیں اور باقی دروزی اور دوسرے فرقے۔ نُصیری زیادہ تر بندرگاہ لاذقیہ (latakia) اور اس کے نواحی علاقوں میں آباد ہیں اور دروزی جنوب میں جبل دروز کے علاقے میں آباد ہیں۔ یہ دونوں مسلمانوں کے ان گمراہ فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے تاریخ میں ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ نُصیری حضرت علی کی الوہیت کے قائل ہیں اور دروزی اسماعیلیوں کی ایک شاخ ہیں۔[2] شام کی نصف فوج نصیریوں اور دروزیوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۳ء میں تیس ہزار فوج صدر اسد کے بھائی لفٹیننٹ کرنل رفعت اسد کی کمان میں تھی اور بیس ہزار فوج صدر اسد کے برادر نسبتی کی کمان میں اور چھاتہ بردار فوج صدر اسد کے چچیرے بھائی کی کمان میں تھی۔[3]

نصیریوں اور دروزیوں نے عیسائیوں اور سنی آبادی کے مغرب زدہ اور اشتراکیت پسند عناصر سے مل کر بعث پارٹی کی ایک ایسی آمریت مسلط کر دی ہے جو شام میں اسلامی تحریک کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور جب تک فوجوں پر سے یہ اقلیتی اقتدار ختم نہیں ہوتا اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بہتری کی توقع نہیں۔ شام میں جہاں اسلامی عقائد اور اسلامی تحریک کی بنیادیں گہری ہیں غیر اسلامی ثقافتی اثرات اور اقلیتی غلبہ کے خلاف شدید بے چینی پائی جاتی ہے جس کا اظہار جمہوری آزادیوں پر پابندی کی وجہ سے کھل کر نہیں ہو سکتا، لیکن کبھی کبھی مناسب موقعوں پر چھپے ہوئے جذبات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جب فروری ۱۹۷۳ء میں مجوزہ آئین میں اسلام کو

---

(۱) ابوالحسن علی ندوی: دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔

(۲) دروزیوں اور نصیریوں کے عقائد کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیے حتی کی تاریخ شام کا اردو ترجمہ ص ۶۷۲۔۶۷۵۔

(۳) کرنٹ بایوگرافی (انگریزی) ۱۹۷۵ء۔

سرکاری مذہب قرار نہیں دیا گیا تو شام میں وسیع پیمانے پر ہنگامے ہوئے جس کے بعد صدر اسد کو آئین میں یہ دفعہ بڑھانی پڑی کہ شام کا سربراہ مسلمان ہوگا۔ لیکن مسلمان اس سے بھی مطمئن نہیں ہوئے اور مارچ ۱۹۷۳ء میں حلب اور دمشق میں نئے ہنگامے ہوئے۔ بعث حکومت کے خلاف مسلمانوں کی بے چینی کا بھرپور اظہار اس وقت ہوا جب جون ۱۹۷۹ء میں حلب میں ساٹھ نصیری فوجی کیڈٹوں کو مسلمانوں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد نصیریوں اور سنیوں میں تصادم شروع ہو گئے۔ اگست ۱۹۷۹ء میں لاذقیہ کے ایک ایسے ہی تصادم میں چالیس افراد مارے گئے۔ حکومت ان ہنگاموں کا ذمہ دار اخوان المسلمون کو قرار دے رہی ہے لیکن درحقیقت یہ ہنگامے اقلیتی اجارہ داری اور جبر کے خلاف عام مسلمانوں کے جذبات کا اظہار ہیں۔ بعث پارٹی کی حکومت کے جبر و استبداد کی صدائے بازگشت اب بیرونی ملکوں میں بھی سنی جانے لگی ہے جہاں شامی مسلمانوں نے بعث حکومت کے خلاف تنظیمیں قائم کر لی ہیں۔ حال ہی میں ایمنیسٹی انٹرنیشنل کی ایک رپورٹ میں بھی بتایا گیا ہے کہ:

''شام میں اخوان المسلمون کے سینکڑوں کارکن گزشتہ آٹھ سال سے قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں اور جیلوں میں ان کو اذیت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں نو افراد اذیت رسانی سے جاں بحق ہوئے۔ گزشتہ دو برس میں (۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء) میں تیس سے زیادہ افراد کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی ہے جن میں بارہ کو سرِ عام پھانسی دی جا چکی ہے۔''

معاشی ترقی

مشرقی معیار کے لحاظ سے شام خوشحال ملکوں میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ عرب دنیا میں شام ان دو تین خوش قسمت ملکوں میں سے ہے جو زرعی پیداوار میں خود کفیل ہیں۔ گیہوں اور روئی یہاں کی سب سے بڑی زرعی پیداوار ہیں۔ بحیرۂ روم کے ملکوں میں ہونے والے ہر قسم کے پھل سیب، انگور وغیرہ افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ سوتی، اونی اور ریشمی پارچہ بافی اور سیمنٹ سازی خاص صنعتیں ہیں۔ شام کے ساحلی علاقوں میں کافی بارش ہوتی ہے اور ملک میں چھوٹی چھوٹی ندیوں اور چشموں کی بھی کثرت ہے جن سے کافی زمین سیراب ہوتی ہے۔ ۱۹۷۹ء کے اوائل میں روس کی مدد سے دریائے فرات پر ایک بہت بڑے بند کی تعمیر مکمل ہو گئی ہے جس سے سولہ لاکھ چالیس ہزار

ایکڑ زمین سیراب ہو سکے گی۔ شام کی معیشت کو ۱۹۷۳ء کی جنگ اور لبنان کی علیحدگی کی وجہ سے سخت نقصان پہنچا تھا لیکن اب سیاسی استحکام، پٹرولیم کی پیداوار میں اضافے اور نجی سرمایہ کاری کے ایک بار پھر فروغ سے معیشت تیزی سے بحال ہو رہی ہے۔ شام میں جون ۱۹۶۸ء میں پٹرول نکلنا شروع ہوا ۱۹۷۳ء میں پیداوار ۵۴ لاکھ ٹن اور ۱۹۷۵ء میں نوے لاکھ ٹن پہنچ گئی اور اب پٹرول شام کی اہم برآمد ہے۔ اس کے علاوہ عراقی تیل کی تین پائپ لائنیں بھی شام سے گزرتی ہیں۔ ان میں سے دو لبنان میں ختم ہوتی ہیں اور ایک شامی بندرگاہ طرطوس پر ختم ہوتی ہے۔ یہ پائپ لائنیں بھی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ پہلے شام کی درآمد اور برآمد کا انحصار بیروت کی بندرگاہ پر تھا۔ اب شام میں لاذقیہ کا بندرگاہ تعمیر ہو چکا ہے۔ اور طرطوس میں نیا بندرگاہ تعمیر ہو رہا ہے۔ ملک میں سڑکوں اور ریلوے لائنوں کی توسیع جاری ہے۔ لاذقیہ اور حلب کے درمیان ریلوے لائن مکمل ہو چکی ہے۔ اور لاذقیہ سے صوبہ جزیرہ تک زیر تکمیل ہے۔ حمص اور دمشق کے درمیان بھی ریلوے پٹڑی بچھائی جا رہی ہے۔

بعثی انقلاب کے بعد شام میں اشتراکی اصولوں کے تحت زمینوں کو کسانوں میں تقسیم کرنے اور سرکاری ملکیت میں لینے کے جو تجربے کیے گئے وہ کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔ اور زرعی پیداوار کم ہوگئی اب پروگرام بدل دیا گیا ہے۔ اور بہت سی زمینیں بھی ان کے مالکوں کو واپس کر دی گئی ہیں۔

۱۹۷۴ء میں شام میں دس لاکھ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ دمشق حلب اور لاذقیہ میں یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ شام میں صحافت کا معیار مصر اور لبنان کے مقابلہ میں پست ہے۔ سب سے کثیر التعداد روزنامے البعث اور الشورہ صرف بیس بیس ہزار شائع ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف اشاعت کتب کے لحاظ سے دمشق مشرقی عرب دنیا میں قاہرہ اور بیروت کے بعد سب سے بڑا مرکز ہے۔

۱۹۷۴ء میں شام کی آبادی ۷۳ لاکھ تھی۔ دمشق کی آبادی آٹھ لاکھ، حلب کی چھ لاکھ، حمص کی دو لاکھ، حماۃ اور لاذقیہ کی تقریباً سوا سوا لاکھ تھی۔

باب ۱۹

لبنان: عرب دنیا کی تفریح گاہ

لبنان بڑی حد تک وہی علاقہ ہے جسے عہد قدیم میں فنیقیا (phoenicia) کہا جاتا تھا اور جہاں کے باشندے جہاز رانی اور تجارت کی وجہ سے مشہور تھے۔ اہل فنیقیا کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ حروف تہجی سب سے پہلے انھوں نے ہی ایجاد کیے۔ اہل فنیقیا کے بعد لبنان کی تاریخ زیادہ تر شام کی تاریخ کا ایک حصہ رہی۔ بازنطینیوں کے دور میں اہل شام کی طرح یہاں کے باشندوں نے بھی مسیحیت قبول کر لی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں لبنان اسلامی دنیا کا ایک حصہ بن گیا۔ ساحلی علاقوں میں بتدریج اسلام پھیل گیا لیکن جبل لبنان کے پہاڑی علاقوں میں مسیحیت بدستور قائم رہی۔ یہاں کے مسیحی مارونی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کا بانی پانچویں صدی عیسوی کا ایک راہب مارو (maro) تھا۔ ۱۶۳۶ء میں اس فرقہ نے اٹلی کے رومن کیتھولک کلیسا سے تعلق قائم کر لیا۔ ابتدائی دور کے مسلمان علماء میں امام اوزاعی (۸۸ھ، ۷۰۷ء تا ۱۵۷ھ ۷۷۳ء) کا نام بہت ممتاز ہے جو اپنے زمانے کے بہت بڑے محدث، ادیب اور صاحب اجتہاد فقیہ تھے۔ وہ عرصے تک شام کے قاضی رہے اور ایک زمانے میں شام اور اندلس کے مسلمان ان ہی کے فقہی مسلک پر عمل کرتے تھے۔ امام اوزاعی بعلبک میں پیدا ہوئے تھے اور بیروت میں وفات پائی جہاں ان کا مزار موجود ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران لبنان ۱۱۰۹ء سے ۱۲۹۰ء تک ایک لاطینی مسیحی ریاست کا حصہ رہا جس کا مرکز طرابلس الشام تھا۔ اس زمانے میں یورپ کے لوگ بڑی تعداد میں لبنان میں آباد ہو گئے اور اس طرح لبنان میں عیسائی باشندوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

عثمانی دور میں لبنان کا علاقہ شام کا ایک حصہ تھا جس کا انتظام والی شام مقامی جاگیرداروں کی مدد سے کرتا تھا۔ یہ جاگیردار دُروزی ہوتے تھے۔ یا مارونی عیسائی اور تاریخ میں امرائے لبنان کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان میں دو امیروں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ پہلا امیر فخر الدین ثانی ہے جس نے ۱۵۹۰ء سے ۱۶۱۳ء تک اور پھر ۱۶۱۸ء سے ۱۶۳۵ء تک حکومت کی۔

دوسرا امیر بشیر شہابی ثانی ہے جس نے ۱۷۸۸ء سے ۱۸۴۰ء تک حکومت کی۔ ان میں پہلا دروزی مذہب کا پیرو تھا اور دوسرا نسلاً دروزی تھا لیکن مذہباً عیسائی تھا۔ ان امراء کی یہ کوشش رہی کہ سلطنت عثمانیہ سے تعلق ختم کر کے یورپ سے تعلق ہموار کیا جائے۔ امیر بشیر شہابی جدید لبنان کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے زمانے میں لبنان کی حدود تقریباً وہی تھیں جو اب ہیں۔ اس نے مغربی ممالک سے ماہرین بلوائے اور زراعت اور صنعت و حرفت کو فروغ دیا۔ بیروت نے لبنان کے مرکزی شہر کی حیثیت سے اہمیت پہلی مرتبہ اسی کے زمانے میں حاصل کی۔ اور امریکیوں نے ۱۸۳۴ء میں پہلا چھاپہ خانہ اسی دور میں بیروت میں قائم کیا۔ امیر بشیر نے جب ابراہیم پاشا مصری کی بغاوت میں اس کا ساتھ دیا تو عثمانی حکومت نے اس کو معزول کر کے استنبول بلا لیا جہاں ۱۸۵۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔ لبنان میں بیت الدین کے مقام پر اس کا بنایا ہوا شاندار محل مسیحی لبنان کی سب سے بڑی تعمیری یادگار ہے۔

مغربی ممالک لبنان کے عیسائیوں کی مدد سے سلطنت عثمانیہ کو کمزور کرنے کے لیے لبنان کو اپنا اڈہ بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ امیر بشیر کی معزولی کے بعد وہ ایک ایسے موقع کی تلاش میں تھے جو انھیں سلطنت عثمانیہ میں مداخلت کا موقع فراہم کر دے۔ یہ موقع ان کو جلد ہی فراہم ہوگیا۔ ۱۸۶۰ء میں دروزیوں اور مسیحی باشندوں میں زبردست تصادم ہوگیا جو بڑھتے بڑھتے شام تک پہنچ گیا۔ اس فساد میں کئی ہزار عیسائی مارے گئے اور بے گھر ہوگئے۔ اس فساد کو مغربی ملکوں نے عیسائیوں کے قتل عام کا نام دیا اور ان کے تحفظ کے لیے فرانسی فوج لبنان میں اتار دی گئی جو ایک سال تک لبنان پر قابض رہی۔ عثمانی سلطنت پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ لبنان کو شام سے الگ کر کے ایک مستقل ملک کی حیثیت دے۔ سلطنت عثمانیہ کو سر جھکا دینا پڑا اور اس طرح ۱۸۶۴ء میں لبنان کو ایک مستقل ملک کی حیثیت حاصل ہوگئی جس کا والی اگرچہ استنبول سے نامزد کیا جاتا تھا لیکن اس کا عیسائی ہونا لازمی تھا۔ لبنان کی یہ خصوصی حیثیت ۱۹۱۴ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد جمال پاشا نے پہلی جنگ عظیم چھڑنے پر لبنان کو حسب سابق شام کی ولایت کا ایک حصہ بنا دیا۔

۱۸۶۴ء سے ۱۹۱۴ء تک کا دور لبنان میں مسیحی اداروں کی تبلیغی سرگرمیوں فری میسن سرگرمیوں اور مغربی افکار و نظریات کے نفوذ کا دور شباب ہے۔ بشیر ثانی کے زمانے میں لبنان قومیت کے جو بیج بوئے گئے تھے وہ اب اپنی فصل لے آئے تھے۔ لبنانی مسیحی رہنماؤں نے

عرب قومیت کا لبادہ اوڑھ کر عربوں کی بھی تائید حاصل کر لی اور عربوں کے ذہن کو بھی اسلامی تصور قومیت سے ہٹا کر وطنی، لسانی اور ملّی قومیت کی طرف موڑ دیا۔ لبنان کا یہ دور جدید عربی قوم پرستی اور جدید عربی ادب کی نشو و نما کا دور ہے۔ مشہور لبنانی قوم پرست اور جدید عربی ادب کے پیشرو ناصیف یازجی (۱۸۰۰ء تا ۱۸۷۱ء) بطرس بستانی (۱۸۱۹ء تا ۱۸۸۳ء) اور ابراہیم یازجی (۱۸۴۷ء تا ۱۹۰۶ء) اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی زمانے میں ۱۸۶۶ء میں بیروت میں امریکن یونیورسٹی اور ۱۸۷۴ء میں سینٹ جوزف کی فرانسیسی یونیورسٹی کی بنیاد پڑی۔ اس دور میں فرانسیسی اور انگریزی سے بڑی تعداد میں کتابوں کے عربی میں ترجمے ہوئے۔ مغرب کے ان تعلیمی اداروں نے لبنان میں ایک ایسی نئی نسل پیدا کر دی جو عثمانی ترکوں کی بالادستی کو کسی صورت میں تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی اور جس کو خلافت کے نظریے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ نئی نسل اپنی رہنمائی کے لیے مغرب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لبنان کے مسیحی باشندوں کی ہمدردیاں واضح طور پر فرانس کے ساتھ تھیں۔ مغربی نظریات کے تحت پرورش پانے والی یہی نئی نسل تھی جس نے جنگ عظیم چھڑنے کے بعد ترکوں کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا۔ ۶ مئی ۱۹۱۶ء کو والی شام جمال شاہ نے بغاوت کی سازش کے جرم میں سات افراد کو دمشق میں اور چودہ افراد کو بیروت میں پھانسی دی تو ان میں مسلمان اور عیسائی دونوں شامل تھے۔ جن چوکوں پر ان عرب قوم پرستوں کو پھانسی دی گئی انہیں اب شہدا چوک کہا جاتا ہے اور ہر سال ۶ مئی کو ان کی یاد منائی جاتی ہے۔

فرانسیسی دور

جنگ کے خاتمہ پر شام اور لبنان پر فرانس قابض ہو گیا۔ فرانس پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں شام کو مذہبی بنیاد پر چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں ایک جمہوریہ لبنان تھی۔ بعد میں شامی مسلمانوں کے زبردست احتجاج کی وجہ سے ۱۹۳۶ء میں فرانس نے یہ تقسیم منسوخ کر دی لیکن جمہوریہ لبنان کو برقرار رکھا۔

فرانس نے اپنے دور میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان امتیاز برتا۔ مسلمانوں کے خلاف مارونی عیسائیوں کی سرپرستی کی گئی۔ لبنان کا آئین بھی جس کے بڑے حصے پر اب تک عمل کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں فرانسیسی سرپرستی میں بنا اور اس کے ذریعے سے لبنان میں عیسائیوں

کے غلبہ کا تحفظ کیا گیا۔ یہ دستور مسلمانوں کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کرتا۔ اس کے ذریعے سارے اختیارات صدر کو دیے گئے ہیں اور صدر کا عیسائی ہونا لازمی ہے۔ دستور کے تحت وزیراعظم سنی مسلمانوں میں سے اور اسپیکر شیعہ مسلمانوں میں سے لیا جاتا ہے۔ لیکن وزیراعظم کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں کیونکہ وہ اختیارات میں بے بس ہوتا ہے۔ لبنان میں پارلیمنٹ کی نشستوں کا تعین بھی فرانسیسی دور میں کی گئی مردم شماری کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس مردم شماری کے مطابق لبنان میں عیسائیوں کی تعداد ۵۳ فیصد اور مسلمانوں کی ۴۷ فیصد تھی۔ مردم شماری کے ان اعداد وشمار پر مسلمانوں نے ہمیشہ اعتراض کیا ہے۔ لیکن لبنان کے تمام منصوبے اور تخمینے آج تک اسی تناسب کی بنیاد پر تیار کیے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف فرانس اور لبنانی عیسائیوں کی سازش کا حال ہی میں ایک دستاویزی ثبوت ملا ہے۔ یہ ایک ہدایت نامہ ہے جو حکومت فرانس کی طرف سے لبنان کے عیسائیوں میں ۱۹۱۹ء میں خفیہ طور پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں منجملہ اور باتوں کے کہا گیا تھا کہ:

''اے یسوع مسیح کے بیٹو! یہ وطن آپ ہی کے لیے وجود میں آیا ہے تاکہ آپ اپنا شیرازہ اکٹھا کر سکیں اور تاریخی جنگ کے بعد اپنی آزادی سے متمتع ہو سکیں۔ آپ کو یقین کرنا چاہیے کہ عیسائی کے معنی لبنانی ہیں اور صحرا سے آنے والے عربوں کو صحرا میں واپس جانا چاہیے۔

''ہم نے آپ کے لیے وہ تمام انتظامات کر دیے ہیں جو اس علاقہ میں آپ کی خوشحال زندگی کے ضامن ہیں۔ مثلاً ملکیت اراضی، غیر ملکی ایجنسیاں، سیاسی صورت حال، امور زر وغیرہ۔ اب آپ کا کام یہ ہے کہ ان مفادات کا تحفظ کریں اور ان میں روز افزوں اضافہ کریں۔

''تفریح گاہوں اور سیاحتی انتظامات پر قبضہ کرنے کی کوشش کیجیے اور جب آپ اکثریت میں ہو جائیں تو عربوں کو ان کی بستیوں سے نکال دیجیے۔ بیروت کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں جہاں مسلمان نہ ہوں ایک محفوظ بندرگاہ کی تعمیر ہرگز نہ بھولیے۔ جس وقت بھی موقع ملے اور حالات سازگار ہوں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کیجیے۔ طاقت کے تمام ذرائع استعمال کیجیے۔ مثلاً جسمانی ورزش، اسلحہ اور نوجوانوں کی تنظیموں اور فوج سے دلچسپی لیجیے۔

''ادبی قیادت کی زمام اپنے ہاتھ میں لیجیے۔ مثلاً کتابوں کی اشاعت اور تمام انجمنوں اور

اکیڈمیوں پر آپ کا قبضہ ہو۔ ہرگز یہ تسلیم نہ کیجیے کہ آپ کی زبان کا سرمایہ تنہا مسلمانوں کی ملکیت ہے وغیرہ وغیرہ۔ (۱)

آزادی

لبنان کی آزادی کی جدوجہد شام کی جدوجہد آزادی ہی کا ایک حصہ ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران ۲۶۔نومبر ۱۹۴۱ء کو لبنان کی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۴۴ء کو فرانس نے بیشتر اختیارات جمہوریہ لبنان کو منتقل کر دیے اور دسمبر ۱۹۴۶ء میں فرانسیسی فوجوں نے لبنان چھوڑ دیا۔

لبنان میں صدر کا انتخاب بڑی پابندی سے ہوتا رہا ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک حسب ذیل صدر ہو چکے ہیں:

۱۔ شیخ بشارۃ الخوری (۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۲ء)
۲۔ کمیل شمعون (۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۸ء)
۳۔ فواد شہاب (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۴ء)
۴۔ چارلس حیلو (۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۰ء)
۵۔ سلیمان فرنجیہ (۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۶ء)
۶۔ الیاس سارکس جو ۲۳۔ستمبر ۱۹۷۶ء سے صدر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

لبنان میں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کی زبان چونکہ عربی ہے اس لیے لبنان لسانی اعتبار سے ایک عرب ملک ہے۔ چنانچہ لبنان ۱۹۴۵ء ہی میں عرب لیگ کا رکن بن گیا تھا۔ لیکن چونکہ ملک کی نصف کے قریب آبادی عیسائی ہے اس لیے لبنان حتی الامکان عرب ملکوں کے تنازعوں اور مسائل میں غیر جانبدار رہتا ہے۔ بہرحال مسلمان آبادی کے دباؤ کی وجہ سے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے خلاف جنگ میں لبنان نے بھی حصہ لیا اور اسرائیل کے بائیکاٹ میں اس نے عربوں کا ساتھ دیا۔ لبنان نے جس کا جھکاؤ ہمیشہ مغربی ممالک کی طرف رہا ہے ۱۹۵۸ء

(۱) اس دستاویز کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' ص ۱۵۰ تا ۱۵۲ (شائع کردہ مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی ۱۹۷۶ء)۔

میں آئزن ہاور نظریہ قبول کرلیا جس کے تحت امریکہ نے مشرق وسطیٰ کے ان ملکوں میں جو کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کا نشانہ بنیں۔ فوج بھیجنے اور معاشی امداد کرنے کی ذمہ داری قبول کرلی تھی۔ حکومت لبنان کے اس فیصلہ کے خلاف مئی ۱۹۵۸ء میں مسلمانوں نے عام بغاوت کر دی۔ بیروت، طرابلس، صیدا اور بقاع کے مسلمان محلوں میں پانچ ماہ تک باغیوں کا راج رہا۔ صدر شمعون نے صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکہ سے مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ ۱۵۔ جولائی کو امریکی فوجیں لبنان میں اتار دی گئیں جنھوں نے صدر شمعون کی حکومت کو سہارا دیا۔ اس دوران صدر شمعون کی صدارت کی مدت ختم ہوگئی اور نئے صدر جنرل فواد شہاب نے ''نظریہ آئزن ہاور'' کو مسترد کر دیا۔ ملک میں امن قائم ہوگیا اور امریکی فوجیں واپس چلی گئیں۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں لبنان نے خود کو الگ رکھا لیکن امریکہ اور برطانیہ کے طرز عمل کے خلاف دونوں ملکوں سے سفارتی تعلقات توڑ لیے جو چند ماہ بعد بحال ہوگئے۔

لبنان کی سیاست میں ایک اہم مسئلہ فلسطینی مہاجرین کا ہے۔ لبنان میں فلسطینی مہاجرین کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے۔ فلسطینی چھاپہ مار لبنان کے اڈوں سے اسرائیل پر حملے کرتے رہتے ہیں جن کی وجہ سے اسرائیل ان کے خلاف جوابی کارروائیاں کرتا رہتا ہے جن سے لبنان کے شہروں اور بستیوں میں تباہی پھیلتی رہتی ہے۔ یہ مسئلہ ۱۹۶۸ء کے بعد سے لبنانی فوجوں اور فلسطینی فدائین کے درمیان مستقل تصادم کا باعث بنا ہوا ہے۔

۱۹۷۵ء سے لبنان ایک نئے بحران میں مبتلا ہوگیا ہے۔ یہ ہے مسلمانوں اور عیسائیوں کا تصادم۔ پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا ہے کہ فرانسیسی دور کے بعد سے لبنان میں مردم شماری نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اول تو فرانسیسی دور میں جو مردم شماری ہوئی تھی اس میں مسلمانوں کی تعداد کم بتائی گئی تھی۔ پھر گزشتہ پچیس تیس سال میں مسلمانوں کی آبادی میں عیسائیوں کے مقابلے میں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس دوران ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ لبنانی امریکہ اور دوسرے ملکوں میں منتقل ہوگئے ہیں جن کی اکثریت عیسائی ہے۔ ان تبدیلیوں کے بعد اب لبنان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوچکی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ملازمتیں اور پارلیمنٹ میں نشستیں ملنی چاہییں اور آئین میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جن سے مسلمانوں کے جائز حقوق کا تحفظ ہو۔ لیکن عیسائی آبادی نہ تو نئی مردم شماری کرانے پر تیار ہے اور نہ آئین میں کوئی ایسی ترمیم

کرنے کے لیے تیار ہے جس سے عیسائیوں کی اجارہ داری ختم ہو اور مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق ملیں۔[1] مسلمانوں اور عیسائیوں کے اس تنازعہ نے بالآخر انتہائی شدید شکل اختیار کر لی کہ اپریل ۱۹۷۵ء سے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مسلح تصادم شروع ہو گئے جو جنوری ۱۹۷۶ء تک پوری شدت سے جاری رہے۔ ان فسادات میں جن کو دائیں اور بائیں بازو کا تصادم کہا جاتا ہے بیروت کا شہر تباہ ہو گیا اور لبنان کی معیشت کو سخت دھکا لگا۔ جنوری ۱۹۷۶ء میں شام کی مداخلت سے جنگ بندی ہوگئی اور اب عرب ملکوں کی ایک مشترکہ فوج امن قائم رکھنے میں مدد کر رہی ہے۔ لیکن مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تصادم اب بھی ہوتے رہتے ہیں، جن میں کبھی کبھی فلسطینی مہاجر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اس مسلح تصادم میں جنوبی لبنان کے دروزی رہنما کمال جنبلاط[2] کا نمایاں ہاتھ ہے۔ اس وقت لبنان عملاً مسلمان اور عیسائی حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے، اگرچہ بظاہر حکومت کا ڈھانچہ ایک ہے۔ اسرائیل اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور وہ دائیں بازو کے عیسائیوں کی مدد کر رہا ہے۔ اس کشمکش میں یہ بات قابل غور ہے کہ پوری عیسائی دنیا لبنان کے عیسائیوں کی مدد کر رہی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو عرب یا اسلامی دنیا سے کوئی مدد نہیں مل رہی ہے۔

تعمیر و ترقی

لبنان آزادی کے بعد سے مسلم عیسائی فسادات تک اپنی ترقی خوشحالی، تعلیم اور خواندگی کے بلند معیار اور علم و ادب کی ترقی کے لحاظ سے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے لیے ایک معیار بنا رہا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہو جو اتنا مختصر اور کم آباد ہونے کے باوجود دنیا کے لیے لبنان کی طرح دلکشی کا باعث ہو۔ زراعت اور باغبانی کو معیشت میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ سیب، انگور،

---

(۱) اب مغربی ذرائع بھی مسلمانوں کی اکثریت تو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ ڈیلی نیوز کی ورلڈ المینک ۱۹۷۸ء میں لبنان میں مسلمانوں کا تناسب ۵۷ فیصد اور ہیمنڈ المینک ۱۹۷۹ء میں ساٹھ فیصد بتایا گیا ہے۔

(۲) کمال جنبلاط کو جنوری ۱۹۷۷ء میں عیسائیوں نے قتل کر دیا اور اب ان کے بیٹے ولید جنبلاط دروزیوں کی قیادت کر رہے ہیں۔ تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۷۹ء کے وسط میں فلسطینیوں، عیسائیوں اور دروزیوں کے درمیان مفاہمت ہوگئی ہے۔ ولید جنبلاط نے پروگریسو سوشلسٹ پارٹی کے دفاتر بند کر دیے ہیں اور یاسر عرفات نے جنوبی لبنان سے فلسطینی چھاپہ ماروں کو واپس بلا لیا ہے۔ توقع یہ ہے کہ اس تصفیہ کے بعد شامی فوجیں واپس چلی جائیں گی اور عیسائی، اسرائیل سے تعلق ختم کر دیں گے۔

نارنگی، کیلے اور رسدار کھٹ مٹھے پھل بڑی مقدار میں ہوتے ہیں۔ ملک کی خوشحالی کی دوسری بنیاد سیر و سیاحت ہے۔ لبنان کے خوبصورت ساحل اور سرسبز و شاداب پہاڑوں نے لبنان کو عرب دنیا کی سب سے بڑی تفریح گاہ بنا دیا ہے۔ یہاں کا ساحل معتدل آب و ہوا اور موسم کی وجہ سے گرمیوں اور سردیوں دونوں میں سیاحوں کے لیے کشش رکھتا ہے۔ اس وقت لبنان اسلامی دنیا میں سیاحت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ جہاں ۱۹۷۴ء میں سیاحوں کی تعداد تیس لاکھ تک یعنی آبادی سے بھی زیادہ پہنچ گئی تھی۔ سیاحوں کی اس آمد نے اگرچہ لبنان کی آبادی میں بہت اضافہ کیا ہے لیکن عرب دنیا میں بداخلاقی، بدکرداری اور عیاشی پھیلانے میں بھی برابر کا حصہ لیا ہے۔ بیروت عرب دنیا کے دولت مندوں اور عیاشوں کا مرکز بن گیا ہے۔ لبنان کے ایک ادیب امین الریحانی نے لکھا ہے:

> ''بیروت تمدن کی ایک نعمت بھی ہے اور تمدن کی ایک لعنت بھی۔ یہ ایک ایسا ماہتاب ہے جس سے مغرب کی روشنی منعکس ہوتی ہے تو مغرب کی روشنی کے ساتھ مغرب کی تاریکی بھی ساتھ آتی ہے''

ہندوستان کے ممتاز عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> ''اگر کوئی شخص اس کا مشاہدہ کرنا چاہے کہ مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں نے کس طرح عربوں کی فطرت کو مسخ کر دیا ہے۔ اور عیش پسند عرب کس طرح مذہب و شریعت کے قیود سے آزاد ہو گئے ہیں تو اسے کچھ ایام بیروت میں اور لبنان کے موسم گرما گزارنے کے مقامات پر گزارنے چاہئیں''۔[۱]

انیسویں صدی کے آغاز میں بیروت ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی آبادی صرف پانچ ہزار تھی۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ایک ترک مصنف نیازی برکس نے لکھا ہے کہ:

> ''استنبول کے مقابلے میں بیروت بہت چھوٹا ہے لیکن خوشحالی اور ترقی کے لحاظ سے استنبول سے بڑھا ہوا ہے''۔[۲]

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ص ۱۳۵۔

(۲) نیازی برکس: اسلامی تحریک، قومیت اور سوشلزم (ترکی زبان) ص ۲۵۔

بیروت مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا مالیاتی مرکز ہے۔ یہاں ۱۹۶۶ء میں ۸۸ بنک تھے۔ ان بنکوں میں تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں کے دولت مندوں نے بڑی بڑی رقم جمع کر رکھی ہیں۔ امریکیوں نے بھی مختلف ترقیاتی منصوبوں کے لیے بیروت کو مرکز بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے بیروت کی خوشحالی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ لبنان کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تیل کی وہ دو پائپ لائنیں بھی ہیں جو عراق اور سعودی عرب سے بالترتیب طرابلس اور صیدا میں ختم ہوتی ہیں۔ ان دونوں مقامات پر تیل صاف کرنے کے دو کارخانے بھی ہیں۔ ان باتوں نے لبنان کو مشرق وسطیٰ کا خوشحال ترین ملک بنا دیا ہے۔ لیکن لبنان کی اس خوشحالی میں مسلمانوں کا حصہ بہت کم ہے۔ ملک کے تمام کلیدی عہدوں پر غیر مسلموں کی اجارہ داری ہے۔ اور ترقیاتی پروگراموں سے غیر مسلم ادارے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ (۱)

لبنان میں تین یونیورسٹیاں ہیں، امریکن یونیورسٹی، فرانسیسی یونیورسٹی اور لبنان یونیورسٹی۔ خواندگی کا تناسب ۸۵ فیصد ہے۔ یعنی اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ۔ اسی طرح عربی کتابوں کی نشر و اشاعت کا قاہرہ کے بعد سب سے بڑا مرکز بیروت ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

> ''متعدد عرب ملکوں میں فوجی اور سیاسی انقلابات رونما ہوئے اور بہت سے زعماء اور مصلحین پر زمین تنگ ہوگئی تو انھوں نے لبنان میں پناہ لی۔ اس لحاظ سے لبنان کو عالم عربی کا سوئٹزر لینڈ کہہ سکتے ہیں جہاں سیاسی پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد مقیم ہے اور انھیں تصنیف و تالیف اور اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کی مکمل آزادی ہے جو بہت سے عرب ملکوں میں اور خود ان کے اپنے وطن میں ناپید ہے۔ انھوں نے اپنی جائیدادیں بیروت منتقل کر لیں، کتب خانے اور اشاعت گھر قائم کیے۔ قاہرہ میں (ناصر کے استبدادی دور میں) نشر و اشاعت کا بازار سرد پڑا تو بیروت نشر و اشاعت کتب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ (۲)

لبنان نے جو ممتاز مسیحی ادیب پیدا کیے ان میں چند کے نام پچھلے صفحات میں دیے جا چکے ہیں۔ موجودہ صدی کے ممتاز لبنانی عیسائی ادیبوں میں جرجی زیدان ۱۸۶۱ء تا ۱۹۱۴ء) کا نام

(۱) المسلمون فی لبنان، بحوالہ ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک'' ص ۱۴۹۔

(۲) ابوالحسن علی ندوی: دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔

نمایاں ہے جو مصر منتقل ہو گئے تھے جہاں انھوں نے مصر کے مشہور ہفت روزہ ''الہلال'' کی بنیاد ڈالی۔ جرجی زیدان کی تصانیف میں تاریخ تمدن اسلامی، تاریخ آداب اللغۃ اور تراجم مشاہیر شرق مشہور ہیں۔ ان میں تاریخ تمدن اسلامی کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ جرجی زیدان کا نقطہ نظر مغرب کے مستشرقین کا نقطہ نظر ہے۔ ان کی تصانیف معلومات سے پُر ہیں لیکن اسلام کی روح کو سمجھنے میں وہ مستشرقین کی طرح ناکام رہے۔ لبنان کے مسلمان ادیبوں میں امین الریحانی (۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۰ء) کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ملوک العرب تاریخ بخد الحدیث (جدید نجد کی تاریخ) قلب لبنان اور قلب عراق کے مصنف ہیں۔ دوسرے ممتاز مسلمان لبنانی مصنف سید محسن امین (۱۸۶۵ء تا ۱۹۵۲ء) مصنف اعیان الشیعہ ہیں۔

لبنان کی آبادی اکتیس لاکھ (۱۹۷۴ء) ہے۔ بیروت کی آبادی دس لاکھ اور طرابلس الشام کی ڈیڑھ لاکھ ہے۔ لیکن حالیہ خانہ جنگیوں میں بیروت کا بڑا حصہ کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ سیاحوں کی تعداد میں کمی آ گئی ہے اور ملکی معیشت اتنی بری طرح متاثر ہوئی ہے کہ اگر موجودہ صورت حال برقرار رہی تو لبنان اپنی خوشحالی برقرار نہیں رکھ سکے گا۔

لبنان کے مسلمان رہنماؤں میں ریاض الصلح، صائب سالم، رشید کرامی، تقی الدین اور مفتی شیخ حسن خالد کے نام اہم ہیں۔

باب ۲۰

اُردن کی ہاشمی مملکت

اردن کی مملکت شام کے جنوب اور فلسطین کے مشرق میں واقع ہے فلسطین اور اردن کے درمیان دریائے اردن حد بندی کرتا ہے اور چونکہ اردن اس دریا کے مشرق میں واقع ہے اس لیے اس مملکت کو پہلے شرق اُردن کہا جاتا تھا۔ تاریخی طور پر اردن بھی لبنان کی طرح شام ہی کا ایک حصہ ہے۔ بُصریٰ کی قدیم بستی جہاں حضور نے نبوت سے قبل شام کے تجارتی سفر کے دوران قیام کیا تھا اور موتہ کا میدان جنگ جہاں حضرت خالدؓ بن ولید نے بے مثل عسکری ذہانت کا اظہار کیا تھا اردن ہی میں واقع ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران اردن کو خاصی اہمیت حاصل تھی اور عمان سے ۷۸ میل جنوب میں کرک کے مقام پر حلبیوں کا قلعہ اور عجلون کے چار ہزار فٹ بلند پہاڑ پر عربوں کا بنایا ہوا قلعہ اب تک موجود ہے۔

عرب کے دوسرے حصوں کی طرح اردن کا علاقہ بھی پہلی جنگ عظیم تک عثمانی سلطنت میں شامل تھا، لیکن انتظامی لحاظ سے شام کی بجائے فلسطین کی سنجق سے وابستہ تھا۔ جنگ کے بعد جب اتحادی فوجوں نے شام پر قبضہ کرلیا اور قوم پرست عربوں نے ۱۹۲۰ء میں دمشق میں شاہ فیصل بن حسین کو شام کے بادشاہ کی حیثیت سے تخت نشین کیا تو اردن شام کی اس نئی مملکت میں شامل تھا۔ شاہ فیصل کو تو فرانسیسیوں نے شام سے بیدخل کر دیا، لیکن فیصل کے بھائی عبداللہ بن حسین کو جو اردن پر قابض تھے برطانیہ نے شریف حسین اور ان کی اولاد کی دل جوئی کی خاطر اردن میں برقرار رکھا۔ اور ان کو اردن کا امیر تسلیم کرلیا۔

عبداللہ بن حسین (۱۸۸۲ء تا ۱۹۵۱ء)

امیر عبداللہ حجاز کے شریف حسین کے دوسرے لڑکے تھے وہ مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے اور ترکی میں تعلیم پائی وہ عثمانی پارلیمنٹ میں مکہ سے رکن منتخب ہوئے تھے جب عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تو انھوں نے اس جنگ میں عربوں کی طرف سے نمایاں حصہ لیا۔

امیر عبداللہ کی پالیسی شروع سے انگریز نواز رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اردن کا علاقہ انگریزوں کے زیر اثر تھا اور برطانیہ نے اردن کو مکمل آزادی نہیں دی تھی۔ شاہ عبداللہ سارا انتظام برطانوی مشیروں کی مدد سے انجام دیتے تھے۔ اردن کی فوجوں کی تنظیم بھی ایک انگریز گلب پاشا نے کی اور اردن کی فوج کا یہ دستہ عرب لیجن کہلاتا ہے اور اپنی اعلیٰ تنظیم و تربیت کی وجہ سے دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ تک یہ دستہ تمام عرب ملکوں کی فوجوں پر برتری رکھتا تھا۔ انگریزوں سے تعاون کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اردن کا بیشتر حصہ ریگستانی ہے اور آمدنی کے وسائل کم ہیں۔ برطانوی حکومت نے اردن کے اخراجات پورے کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ میں عبداللہ نے انگریزوں سے پورا تعاون کیا اور برطانیہ کی مدد کے لیے عراق اور شام میں عرب لیجن کے دستے بھیجے۔ امیر عبداللہ کی ان خدمات کے معاوضہ میں اور کچھ اردن کے عوام کے دباؤ کی وجہ سے برطانیہ نے دوسرے ملکوں کی طرح اردن کو بھی آہستہ آہستہ اختیارات منتقل کیے۔ آخر میں ۲۲۔ مارچ ۱۹۴۶ء کو اردن کو مکمل آزادی دے دی گئی۔ اور امیر عبداللہ نے ۲۵۔ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنے لیے امیر کی بجائے بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا۔ برطانیہ نے دفاعی تحفظ اور مالی امداد کی ذمہ داری قبول کرلی۔

شاہ عبداللہ کی حکمت عملیاں اور پالیسیاں عام طور پر دوسری عرب حکومتوں کے خلاف ہوتی تھیں وہ برطانیہ کے زیر اثر ہی نہیں تھے بلکہ برطانیہ نواز بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب اقوام متحدہ نے فلسطین کو تقسیم کیا تو عبداللہ واحد حکمران تھے جنھوں نے تقسیم کا منصوبہ منظور کرلیا۔ لیکن جب عرب ملکوں نے برطانوی فوجوں کی فلسطین سے واپسی کے بعد فلسطین کو یہودیوں کے تسلط میں جانے سے روکنے کے لیے جنگ کی تو شاہ عبداللہ نے اس جنگ میں شرکت کی اور عرب لیجن کے منظم دستوں کی مدد سے بیت المقدس اور فلسطین کے وسطی حصہ پر قبضہ کرلیا جبکہ شام اور مصر کی فوجیں یہودیوں کے مقابلے میں ناکام رہیں، اس وقت تک عبداللہ کی مملکت کا نام شرق اردن تھا، کیونکہ یہ علاقہ دریائے اردن کے مشرق میں واقع تھا۔ فلسطین کے وسطی حصہ پر قبضہ کے بعد نئی وسیع تر مملکت کا نام ۲۶۔ اپریل ۱۹۴۹ء کو شرق اردن سے بدل کر اردن کردیا گیا۔ فلسطین سے متعلق سعودی عرب شام اور مصر کی حکومتوں کا موقف یہ تھا کہ فلسطین کو ایک علیحدہ ریاست ہونا چاہیے۔ جس کے سربراہ عظیم فلسطینی راہنما امین الحسینی ہوں۔ لیکن عبداللہ نے اس موقف کے

خلاف ۱۹۵۰ء میں مقبوضہ علاقوں کو باضابطہ طور پر اردن کا حصہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ فلسطینیوں کو وزارت اور پارلیمنٹ میں نمائندگی بھی دی گئی۔

شاہ عبداللہ کا ایک اور منصوبہ جس کی دوسرے عرب ملکوں نے مخالفت کی زرخیز ہلال (fertile crescent) کہلاتا ہے۔ شاہ عبداللہ چاہتے تھے کہ اردن، لبنان، شام اور عراق ایک مشترکہ وفاق کی شکل میں متحدہ ہو جائیں۔ یہ وفاق چونکہ صحرائے عرب کے گرد ہلال کی شکل میں ہے اور زمین بھی زرخیز ہے اس لیے اسے زرخیز ہلال کا نام دیا گیا۔ یہ منصوبہ بڑا مفید تھا اور اگر عملی جامہ پہنا لیتا تو ایک مضبوط عرب حکومت وجود میں آ سکتی تھی لیکن اس منصوبہ پر برطانوی سازش کا شبہ کیا گیا جس کی وجہ سے مقبول نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ سعودی عرب نے بھی اس منصوبہ کی مخالفت کی کیونکہ اس طرح سعودی عرب کی شمالی سرحدوں کے ساتھ ایک ایسی حکومت وجود میں آ جاتی جس پر ہاشمی خاندان کا غلبہ ہوتا جو شروع سے سعودی حکومت کا رقیب رہا ہے۔

فلسطین کی پہلی جنگ میں ناکامی اور وہاں کے بیشتر حصہ پر یہودیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد لاکھوں کی تعداد میں فلسطینی مسلمان بے گھر ہو گئے اور ان مہاجروں کی بیشتر تعداد نے اردن ہی میں پناہ لی۔ مملکت اردن کی مختصر حکومت کو جس کے وسائل پہلے ہی کم تھے، مہاجروں کی آبادکاری کے مسئلہ نے ایک نئی مشکل سے دوچار کر دیا۔ فلسطین کے یہ مہاجر برطانوی عہد میں جمہوری اور آئینی سیاست کے عادی ہو چکے تھے، اس لیے ان کی وجہ سے اُردن میں بھی آئینی حکومت اور جمہوری اقدار کو فروغ ملا جس نے اردن کی حکومت کو ایک نئی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ شاہ عبداللہ کی مطلق العنان حکومت اور ان کی پالیسیوں نے ملک میں عام بے چینی پیدا کر دی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰۔ جولائی ۱۹۵۱ء کو ایک فلسطینی نوجوان نے شاہ عبداللہ کو جب کہ وہ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے گئے تھے گولی مار کر قتل کر دیا۔

شاہ حسین

شاہ عبداللہ کے بعد ان کے سب سے بڑے لڑکے طلال کو ۵۔ ستمبر ۱۹۵۱ء کو شاہ اردن قرار دے دیا گیا لیکن اردن کی پارلیمنٹ نے ان کے دماغ میں خلل ہونے کی وجہ سے ان کو معزول کر دیا اور ۱۱۔ مئی ۱۹۵۲ء کو طلال کے بیٹے حسین کو بادشاہ بنا دیا۔

شاہ حسین ۱۹۳۵ء میں عمان میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہاں کے مشہور سینڈھرسٹ کالج میں فوجی تربیت حاصل کی، وہ جب بادشاہ ہوئے تو ان کی عمر صرف سترہ سال تھی لیکن انھوں نے ملک کے نئے اور پیچیدہ مسائل کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کیا، ان کے دور میں اردن نے زیادہ جمہوری رنگ اختیار کیا اور خارجہ پالیسی بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ آزاد ہوگئی۔ ۱۹۵۶ء میں جب نہر سوئز کے علاقہ میں برطانیہ نے مصر کے خلاف جارحانہ کاروائی کی تو شاہ حسین نے اردن کی فوجوں کے انگریز کمانڈر انچیف گلب پاشا کو علیحدہ کردیا اور برطانیہ سے کیا ہوا وہ معاہدہ ختم کردیا جس کے تحت اردن کو سالانہ امداد ملتی تھی۔ اس معاہدہ کی تنسیخ سے اردن کو مالی نقصان ضرور ہوا لیکن اردن پر سے برطانیہ کا دباؤ کم ہوگیا۔ لیکن اُردن کے قریب واقع عرب ملکوں میں خصوصاً مصر میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں ان کی وجہ سے اردن کے لیے نئے مسائل پیدا ہوگئے۔ مصر میں جمال عبدالناصر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد دوسرے عرب ملکوں کی طرح اردن میں ناصر کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوگئی اور مصر نے ان کی مدد سے شاہ حسین کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کئی بار کوشش کی۔ ۱۹۵۸ء میں جب شام اور مصر میں متحدہ عرب جمہوریہ قائم ہوئی تو شاہ حسین نے عراق کے ساتھ مل کر جہاں ان کے چچا کی اولاد حکمران تھی، ایک نیا وفاق بنالیا، لیکن چند ماہ بعد ۱۴۔ جولائی کو عراق میں فوجی انقلاب آجانے سے نہ صرف یہ کہ وفاق ناکام ہوگیا بلکہ اردن میں بھی انقلاب کا خطرہ پیدا ہوگیا جس سے بچنے کے لیے شاہ حسین کو برطانیہ سے مدد طلب کرنی پڑی۔ اس نئے خطرے کی روک تھام کرنے کے لیے اور مصر کے حامی عناصر کی طرف سے انقلاب کے خطرے سے بچنے کے لیے اردن کو سعودی عرب کی طرف جھکنا پڑا۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان قریبی تعاون پیدا ہوگیا۔

جون ۱۹۶۷ء میں جب عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو اردن کے ہاتھ سے فلسطین کا سارا علاقہ نکل گیا اور اب اردن صرف ان ہی علاقوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۴۸ء سے پہلے شرق اردن میں شامل تھے۔

فلسطینی مہاجر

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی ناکامی نے اردن کے لیے بڑے مسائل

پیدا کر دیے۔ فلسطین کا حصہ ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے اردن کے لیے مالی مسائل بھی پیدا ہو گئے اور فلسطینی مہاجرین کا مسئلہ اور سنگین ہو گیا۔ اردن میں ان مہاجرین کے کیمپ چھاپہ ماروں کا مرکز بن گئے جہاں سے وہ اسرائیل پر حملے کرنے لگے۔ مصر و شام میں فلسطینی مہاجرین کی تعداد بہت کم تھی اس لیے مصر و شام کی حکومتوں کے لیے وہ کبھی مسئلہ نہیں بنے۔ لیکن اردن کا معاملہ دوسرا تھا۔ یہاں حکومت کمزور اور چھوٹی تھی اور مہاجرین طاقتور۔ مصر و شام کی حکومتیں بھی فلسطینی چھاپہ ماروں کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اسرائیل اگر ان کے خلاف جوابی کارروائی کرے گا تو مصر و شام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا صرف اردن ہی ان کی زد میں آئے گا جہاں شاہ حسین کی حکومت کا تختہ پلٹنا مصر و شام کی حکومتوں کی بہت بڑی آرزو تھی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ کئی سال تک اردن کی مغربی سرحد میدان جنگ بنی رہی۔ ادھر سے چھاپہ مار اسرائیلی مقبوضات پر حملہ کرتے تھے۔ ادھر سے اسرائیلی ہوائی جہاز اور توپ خانے اردن میں چھاپہ ماروں کے اڈوں پر گولہ باری کرتے تھے۔ اشتراکی عناصر بھی فلسطینی مہاجرین کی مشکلات دور کرنے سے زیادہ ان کو اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور مہاجرین فلسطین کو اردن کی حکومت کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ ان اشتراکی عناصر نے دہشت پسندی کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی اور مسافر بردار طیاروں کو اغوا کرنا شروع کر دیا۔ امریکن یونیورسٹی کی طالبہ لیلیٰ خالد کا طیاروں کو اغوا کرنے والے اسی گروہ سے تعلق تھا۔ اس نے نعرہ لگایا کہ فلسطین کو اگر آزاد کرایا جا سکتا ہے تو صرف اسی طرح کہ پہلے شاہ حسین کی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ جب اردن کی حکومت نے چھاپہ ماروں پر کنٹرول کرنا چاہا تو ان اشتراکی عناصر نے جن میں سب سے نمایاں ایک کمیونسٹ عیسائی جارج حبش تھا۔ فلسطینی چھاپہ ماروں کو ۱۹۷۰ء میں اردن کی حکومت سے ٹکرا دیا اور انھوں نے شمالی اردن میں عملاً اپنی حکومت قائم کر لی۔ صورت حال ایسی پیدا ہو گئی کہ الفتح کی تنظیم جو مصر و شام اور عراق کے اثرات سے بھی آزاد تھی اور جس پر اشتراکی عناصر کا بھی غلبہ نہیں تھا۔ چھاپہ ماروں کی مدد کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس طرح عرب ملک اشتراکیوں کے جال میں پھنس گئے اور ان کی غلط اور ناعاقبت اندیشانہ پالیسی نے حقیقی دشمن کا مقابلہ کرنے کی بجائے مسلمانوں کو مسلمانوں سے ٹکرا دیا۔ شاہ حسین کو ملک کے استحکام اور اندرونی امن کی خاطر چھاپہ ماروں کے خلاف سخت کارروائی کرنا پڑی جس کے نتیجے میں ستمبر ۱۹۷۰ء میں ڈیڑھ ہزار کے قریب فلسطینی چھاپہ مار

مارے گئے۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں چھاپہ ماروں کے خلاف دوسری مہم کے دوران ان کے اڈے تباہ کر دیے گئے۔ اور ان کی قوت پوری طرح کچل دی گئی۔ شاہ حسین نے اس کے بعد اردن سے اسرائیل کے خلاف چھاپہ مار سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دینے سے سختی سے انکار کر دیا۔ شروع میں صدر ناصر نے شاہ حسین کی حمایت کی لیکن بعد میں وہ بھی مخالفت کرنے لگے۔ لیبیا نے اردن کی امداد بند کر دی اور شام وعراق نے دباؤ ڈالنے کے لیے اپنی فوجیں اردن میں داخل کر دیں۔ لیکن اس وقت تک چھاپہ مار کچلے جا چکے تھے۔ اور یہ فوجیں واپس بلالی گئیں۔ لیکن شام الجزائر اور لیبیا نے اردن سے تعلقات توڑ لیے اور عراق نے سرحد بندی کر دی۔

اردن اور عرب ملکوں کے درمیان فلسطین کے مستقبل اور فلسطینی باشندوں کی نمائندگی کا مسئلہ بھی وجہ نزاع رہا ہے۔ شاہ حسین فلسطین کے عرب حصے کو اردن میں شامل رکھنا چاہتے تھے اور فلسطین کی تنظیم آزادی (پی۔ ایل۔ او) کی نمائندہ حیثیت سے ان کو انکار تھا۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں شاہ حسین نے فلسطین اور اردن کے وفاق کی شکل میں متحدہ عرب بادشاہت کا منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبہ میں بیت المقدس کو فلسطین کا اور عمان کو وفاق کا صدر مقام قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اسرائیل۔ مصر اور تنظیم آزادی فلسطین نے یہ تجویز مسترد کر دی اور مصر نے اردن سے سفارتی تعلقات قائم کر دیے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اردن نے اپنے دستے شام کے محاذ پر بھیجے اس جنگ کے بعد مصر اور شام نے اردن سے متعلق اپنی پالیسی بدل دی۔ اور یہ دونوں ملک بتدریج اردن کے قریب آ گئے۔ اس پالیسی کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں جب رباط میں عرب ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہوئی تو شاہ حسین نے تنظیم آزادی فلسطین کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ وہ فلسطین کے جس حصے کو بھی آزاد کرائے گی اس پر اس کو حکومت کا بھی حق ہوگا۔ اگلے ماہ شاہ حسین نے اردن کے آئین میں ترمیم کر دی۔ تاکہ دریائے اردن کے مغرب میں آزاد فلسطینی ریاست کی تشکیل کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ اس ترمیم کے بعد اردن کی مجلس قانون ساز میں اہل فلسطین کی نمائندگی ختم کر دی گئی۔

۱۹۷۵ء سے اردن اور شام ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب آ گئے۔ دونوں ملکوں کی مشترکہ فوجی کمانڈ قائم کی گئی۔ ٹرانسپورٹ، ٹیلی کمیونکیشن تعلیم، اطلاعات، بجلی اور فاسفیٹ کی کان کنی سے متعلق باہمی تعاون کے معاہدے کیے گئے۔

سعودی عرب اور کویت سے اردن کے تعلقات شروع سے اچھے رہے ہیں اور ان دونوں حکومتوں سے اردن کو وسیع پیمانے پر مالی امداد مل رہی ہے۔ فلسطین کا علاقہ اردن کا سب سے ترقی یافتہ اور زرخیز حصہ ہے۔ بیت المقدس کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کے کئی دوسرے مقدس مقامات اس حصے میں تھے۔ ان کی وجہ سے اردن بین الاقوامی سیاحت اور زیارت کا مرکز بن گیا تھا۔ سیاحت سے ہونے والی یہ آمدن اردن کی خوشحالی کا بڑا ذریعہ تھی جس سے ۱۹۶۷ء کے بعد سے اردن محروم ہوگیا ہے۔ اب البطرہ (پترا) میں نبطی دور کے آثار اور کچھ رومی اور مسیحی یادگاریں اردن میں باقی رہ گئی ہیں۔[۱]

اردن کا بیشتر حصہ ریگستانی ہے۔ صرف دریائے اردن کی وادی اور کچھ شمالی حصے جہاں بارش ہوتی ہے قابل زراعت ہیں۔ شمالی حصوں کے پہاڑوں پر جنگل بھی پائے جاتے ہیں۔ گیہوں اور جو خاص پیداوار ہیں۔ پھل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور برآمد کیے جاتے ہیں۔ بحیرہ مردار کے پوٹاس کے ذخیرے اور فاسفیٹ کی کانیں اہم معدنی پیداوار ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں گیارہ لاکھ ٹن کے قریب فاسفیٹ نکالا گیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں یہ مقدار سولہ لاکھ ٹن ہوگئی اور ۱۹۷۶ء میں یہ مقدار ساٹھ لاکھ ٹن ہونے کی توقع ظاہر کی گئی تھی۔ دمشق سے عمان تک ریلوے لائن موجود ہے۔ عقبہ واحد بندرگاہ ہے جسے گزشتہ سالوں میں کافی ترقی دے دی گئی ہے۔ اردن میں ابتدائی تعلیم مفت ہے۔ اور دسمبر ۱۹۶۲ء سے عمان میں یونیورسٹی قائم ہے۔

اسرائیل کی سرحد پر واقع عرب ریاستوں میں لبنان اور اردن فوجی لحاظ سے سب سے کمزور ریاستیں ہیں۔ لبنان کو مغربی ممالک کا تحفظ حاصل ہے اس لیے اس کو اسرائیل سے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن اردن بالکل اسرائیل کے رحم وکرم پر ہے۔ عربوں کا مجموعی اتحاد اور اردن کی حکومت کی دانش مندانہ خارجہ پالیسی اس کو اس خطرے سے اب تک محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اردن کی فوج کی تعداد جو کم وبیش پچاس ہزار ہے۔ ملک کے وسائل سے زیادہ ہے اور اس کو عرب ملکوں کی امداد ہی سے قائم رکھا جاسکتا ہے۔ اردن کی فوج کی جدید تربیت میں پاکستانی افسروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

---

(۱) ۱۹۷۳ء میں اردن میں ۲۔۱۵ لاکھ سیاح اور زائرین آئے تھے۔

۱۹۶۳ء میں اردن میں تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد ہے ستمبر ۱۹۷۱ء میں شاہ حسین نے ''اردن کی قومی یونین'' قائم کی۔ اور مارچ ۱۹۷۲ء میں اس کا نام عرب نیشنل یونین کر دیا گیا۔ یہ ملک کی واحد سیاسی جماعت ہے۔ اس سے پہلے اردن میں عبدالرحمن خلیفہ کی قیادت میں اخوان المسلمون کی تنظیم موجود تھی جو اسلامی افکار کے فروغ میں اہم حصہ لے رہی تھی اگرچہ اردن میں کمیونزم اور درآمد شدہ نظریات کے علمبرداروں کو نیشنل یونین کی رکنیت کی اجازت نہیں۔ لیکن ایک منظم اسلامی جماعت کے فقدان کی وجہ سے ملک میں اسلامی انقلاب آنے کی زیادہ توقع نہیں۔

فلسطین کے اردنی حصہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اب اردن کی آبادی صرف دس لاکھ رہ گئی ہے۔ سات لاکھ فلسطینی مہاجرین اس کے علاوہ ہیں۔ دارالحکومت عمان کی آبادی چھ لاکھ ہے۔ عقبہ اردن کا واحد بندرگاہ ہے جس کو گزشتہ چند سالوں میں خاصی ترقی دی گئی ہے۔

باب ۲۱

فلسطین: ہلال وصلیب کی رزم گاہ

فلسطین کو بجا طور پر نبیوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تبلیغی مرکز اسی ملک کے شہر حبرون میں قائم کیا تھا۔ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ نے اسی سرزمین میں حق کی آواز بلند کی۔ حضرت موسیٰؑ کی ارض موعود یہی سرزمین تھی۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا مرکز یہی خطہ تھا۔ حضرت سلیمان نے ایک خدا کی عبادت کے لیے فلسطین ہی کے شہر بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی تعمیر کیا۔ حضرت عیسیٰ نے اس مقدس سرزمین سے توحید کی آواز بلند کی اور حضور کی آمد کی خوشخبری سنائی۔ حضور معراج کے موقع پر اسی سرزمین میں واقع مسجد اقصیٰ سے عرش کی طرف گئے۔ اور اسلام کے ابتدائی سالوں میں یہی مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا قبلۂ اول رہی۔ کئی جلیل القدر صحابہ جن میں حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح فاتح شام کا نام سرفہرست ہے فلسطین کی خاک میں مدفون ہیں۔

عربوں کے پورے دور میں لبنان اور اردن کی طرح فلسطین بھی علاقہ شام کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ سلجوقیوں کے زوال کے بعد بارھویں اور تیرھویں صدی میں یہ خطہ ڈیڑھ سو سال تک ہلال وصلیب کی رزم گاہ بنا رہا۔ اور یہیں حطین کے میدان جنگ میں صلاح الدین نے صلیبیوں کو شکست دے کر بیت المقدس کو آزاد کرایا۔ جنگ عظیم اول سے پہلے فلسطین بھی لبنان اور اردن کی طرح عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور جب جنرل النبی کے تحت انگریزی فوجیں بیت المقدس میں داخل ہوئیں تو اس برطانوی جنرل نے اعلان کیا کہ آج صلیبی جنگوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن بعد کی تاریخ نے بتا دیا کہ یہ اعلان درست نہیں تھا۔ صلیبی جنگ آج بھی جاری ہے اور یہ خطہ آج اسی طرح حق و باطل کی رزم گاہ بنا ہوا ہے جس طرح بارھویں صدی میں بنا ہوا تھا۔

ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ پہلی عالمی جنگ کے موقع پر ترکوں کے خلاف عربوں کی امداد حاصل کرنے کے لیے برطانیہ نے عربوں سے آزاد عرب مملکت قائم کرنے کا وعدہ

کیا تھا۔لیکن یہ وعدہ صرف ایک سیاسی مصلحت تھی ورنہ اسی زمانے میں برطانیہ اور فرانس نے عرب علاقے آپس میں تقسیم کر لینے کا ایک خفیہ معاہدہ بھی کر رکھا تھا۔ اور یہ خفیہ معاہدہ ہی برطانیہ اور فرانس کے عزائم کا آئینہ دار تھا۔ اسی دوران برطانیہ نے یہودیوں سے بھی ایک خفیہ معاہدہ کیا جو اعلان بالفور (Balfour)[1] کے نام سے مشہور ہے اس معاہدے کے تحت برطانیہ نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا وعدہ کیا تھا۔

یہودیوں کا یہ مطالبہ کہ فلسطین کو ان کا قومی وطن بنایا جائے، ایک قدیم مطالبہ تھا، دو ہزار قبل مسیح جب حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے حضرت اسحٰقؑ نے جو اسرائیل بھی کہلاتے تھے کنعان میں رہائش اختیار کر لی تو ان کی اولاد مستقل طور پر آباد ہوگئی۔ ان کی یہی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ بعد کے زمانے میں بنی اسرائیل میں کئی جلیل القدر پیغمبر بھی ہوئے جن میں حضرت موسیٰؑ کا نام سب سے مشہور ہے۔ بنی اسرائیل یا یہودی خود کو شریعت موسوی کا پیرو کہتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل اپنے سیاسی عروج کی انتہا کو پہنچ گئے اور اسرائیل سلطنت جنوبی شام کے بیشتر حصے میں پھیل گئی اس کے بعد بنی اسرائیل کو بتدریج زوال ہوا اور یہودی مصائب اور پریشانیوں کے مختلف دوروں سے گزرے۔ بابل کے حکمران بخت نصر نے بیت المقدس کا ہیکل سلیمانی ڈھا دیا۔ اور یہودیوں کو منتشر کر دیا۔ یہودیوں پر آخری تباہی دوسری صدی عیسوی میں اس وقت آئی جب فلسطین پر رومیوں کا قبضہ ہوگیا۔ رومیوں نے اس موقع پر تمام یہودیوں کو جلا وطن کر دیا۔ یہودی اس کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے لیکن فلسطین سے اپنی جلاوطنی کو وہ کبھی نہیں بھولے۔ اور وہ اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے کہ جب وہ فلسطین پھر واپس آ جائیں گے۔ اٹھارہ سال کی اس جلاوطنی کے دوران اسلامی دنیا کے علاوہ یہودیوں کو کہیں بھی چین نہیں ملا۔ یورپ میں ان کو نفرو حقارت کی نظر سے دیکھا گیا۔ ان کے رہنے کے لیے شہروں میں محلے مخصوص کر دیے جاتے تھے جو یہودیوں کے باڑے (ghetto) کہلاتے تھے اور جہاں یہودی باشندے بے کسی اور بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے تھے۔ دور جدید میں ان کے ساتھ بدترین سلوک دوسری عالمی جنگ سے پہلے نازی جرمنی میں کیا گیا لاکھوں یہودی

(۱) آرتھر جیمز بالفور (۱۸۴۸ء۔ ۱۹۳۰ء) پہلی جنگ عظیم کے آخری سالوں میں برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے۔

مرد اور عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا گیا یا ان کو جلاوطن کر دیا گیا۔

صیہونی تحریک

فلسطین میں جس کو یہودی ارض موعودہ کہتے تھے واپسی کی خواہش اور یہودیوں پر مسلسل مظالم نے انیسویں صدی میں ایک سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر لی جو صیہونی [1] تحریک کہلاتی ہے اس تحریک کا مقصد شروع میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن حاصل کرنا تھا، خواہ یہ وطن کسی جگہ ہو لیکن بعد میں یہ طے پایا کہ یہ وطن فلسطین ہی میں قائم کیا جائے۔ فلسطین اس زمانے میں عثمانی خلافت کا ایک حصہ تھا اس لیے ایک یہودی رہنما ہرتسل [2] نے جو صیہونی تحریک کا بانی تھا سلطان عبدالحمید سے ملاقات کی اور سلطان کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ اس وقت عثمانی خلافت شدید قسم کی مالی مشکلات میں مبتلا تھی ہرتسل نے سلطان کو یقین دلایا کہ اگر عثمانی حکومت نے فلسطین میں یہودیوں کو آباد ہونے کی اجازت دے دی تو یہودی عثمانی خلافت کو مالی امداد فراہم کر دیں گے۔ اس یہودی رہنما نے سلطان عبدالحمید کو اپنا ہم خیال بنانے کی چھ سال تک کوشش کی لیکن سلطان نے یہ کہہ کر انکار کر دیا:

''ڈاکٹر ہرزل کو فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرنے کی کوشش ترک کر دینا چاہیے۔ یہودیوں کو فلسطین اسی وقت مل سکتا ہے جب عثمانی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے''

جب سلطان عبدالحمید کی حمایت حاصل نہ ہو سکی تو ہرتسل نے برطانیہ کا رخ کیا۔ برطانوی حکومت نے یہودیوں کے لیے قومی وطن کی ضرورت سے اتفاق کر لیا اور ۱۹۰۳ء میں مشرقی افریقہ میں کینیا میں ایک علاقہ کو اس مقصد کے لیے مخصوص کرنے کی پیش کش کی، لیکن یہودیوں کی اکثریت نے جو فلسطین کو قومی وطن بنانا چاہتی تھی اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد جب ترکوں سے لڑائی چھڑی تو برطانوی حکومت جو پہلے ہی قومی وطن کے خیال سے اتفاق ظاہر کر چکی

(۱) صیہون اس پہاڑی کے جنوبی حصے کا نام ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی عبادت گاہ بنائی تھی۔ بعد میں اس کا اطلاق پوری پہاڑی پر بلکہ پورے شہر یروشلم پر ہونے لگا۔ اب صیہونیت سے مراد یہودیوں کی قومی اور روحانی تمنائیں ہیں۔ صیہونی مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کی ازسرِنو تعمیر چاہتے ہیں۔

(۲) (Teoder Heral) (۱۸۶۰ء تا ۱۹۰۴ء) آسٹریا کا باشندہ تھا۔

تھی، یہودی سرمایہ داروں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے فلسطین میں یہودی وطن قائم کرنے پر راضی ہوگئی اور اس مقصد سے ۲۔نومبر ۱۹۱۷ء کو یہودیوں سے ایک خفیہ معاہدہ کرلیا جو اعلان بالفور کہلاتا ہے، عربوں کو اس معاہدے کا ۱۹۲۰ء تک پتہ نہیں چلا لیکن جب اعلان بالفور شائع کر دیا گیا تو عربوں میں قیامت برپا ہوگئی۔

برطانوی انقلاب

جنگ بندی کے بعد دو سال تک فلسطین برطانوی فوجی کنٹرول میں رہا اس کے بعد فلسطین برطانوی انتداب کے تحت آ گیا۔ یورپ کے یہودیوں نے فلسطین میں انیسویں صدی ہی سے دوبارہ آباد ہونا شروع کر دیا تھا اور اس مسلسل نقل مکانی کے نتیجے میں ۱۹۱۴ء تک اسی ہزار یہودی فلسطین [1] میں آباد ہو چکے تھے۔ برطانوی انقلاب کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی عام اجازت مل گئی۔ یہودیوں نے بڑی بڑی رقمیں دے کر غریب عرب کاشتکاروں سے وسیع پیمانے پر زمینیں خریدنا شروع کر دیں، چنانچہ ۱۹۳۱ء تک ۲۹ فیصد عرب اپنی زمینوں سے محروم ہو چکے تھے اور ۱۹۳۶ء تک یہودیوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ پہلے یہودی صرف ۵۵ ہزار دونم زمین کے مالک تھے، ۱۹۳۶ء میں وہ نو لاکھ دونم زمین کے مالک ہو گئے۔ عربوں نے بار بار مطالبہ کیا کہ یہودیوں کا فلسطین میں داخلہ بند کیا جائے اور ان کو مزید زمینیں خریدنے کی اجازت نہ دی جائے، لیکن برطانوی حکومت نے جو فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کا عہد کر چکی تھی اور اس سلسلے میں یہودیوں سے ساز باز کر چکی تھی اس مطالبہ کو ہر بار نظر انداز کر دیا۔ یہودیوں کی اس کھلی جارحانہ کاروائیوں اور برطانوی سرپرستی کی وجہ سے عربوں اور یہودیوں کے تعلقات روز بروز بگڑتے گئے اور دونوں قوموں میں مسلح تصادم ہونے لگے۔ جن کا سلسلہ ۱۹۳۸ء تک جاری رہا۔

لیکن عربوں اور یہودیوں کی یہ جنگ برابر کی جنگ نہیں تھی۔ اس جنگ میں یہودیوں کو عربوں پر بہت بڑی برتری حاصل تھی۔ اول یہ کہ یہودی آبادکار زیادہ تر یورپ سے آئے تھے۔ ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ، ماہر سائنس دان اور دولت مند موجود تھے جبکہ عرب غریب،

(۱) ۱۸۴۵ء میں فلسطین میں یہودیوں کی تعداد صرف بارہ ہزار تھی، ۱۸۸۱ء میں یہ تعداد ۲۵ ہزار ہوگئی۔

کم حیثیت اور بے بس تھے۔ دنیا کا پورا یہودی ساہوکارہ ان کی پشت پر تھا جس کی وجہ سے ان کے پاس سرمائے کی کمی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں یہودی اتحادی ملکوں کی فوجوں میں اس مقصد کے تحت کثرت سے بھرتی ہوئے کہ وہ جدید ترین فوجی تربیت حاصل کرسکیں۔ چنانچہ یہودیوں نے ۷۵ ہزار افراد پر مشتمل جو خفیہ فوجی تنظیم قائم کی تھی اس میں ۲۵ ہزار افراد وہ تھے جو جنگ کے زمانے میں فوجی خدمات انجام دے چکے تھے۔ یہودیوں کی کامیابی کی ایک اور بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کو درپردہ برطانوی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اور وہ برطانیہ کے زیر سایہ خود کو ہر قسم کے جدید اسلحہ سے مسلح کرنے میں کامیاب ہوگئے جب کہ عربوں کو یہ سہولت حاصل نہ تھی۔

۱۹۳۸ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے باقاعدہ تقسیم کی تجویز پیش کردی اور اس طرح اس نے یہودیوں کے موقف کی کھل کر حمایت کردی۔ اس تجویز کے تحت فلسطین کا ایک حصہ جس میں ساحل کا زرخیز ترین حصہ بھی شامل تھا، یہودیوں کو دیا گیا تھا۔ دوسرا حصہ جس کا بڑا حصہ صحرائے نجب پر مشتمل تھا، عربوں کو دیا گیا، اور تیسرا حصہ یعنی یروشلم اور گردونواح کے مقدس مقامات بین الاقوامی نگرانی میں دیے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تجویز عربوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف تھی۔ یہودی فلسطین کے باشندے نہیں تھے بلکہ بیس پچیس سال کے عرصے میں ایک منظم تحریک کے تحت اور عربوں کے ہر قسم کے احتجاج کے باوجود باہر سے آکر آباد ہوئے تھے اور ان کی اس آبادکاری کی وجہ سے لاکھوں عرب زمینوں سے محروم کردیے گئے تھے۔

جب یہودیوں کو کثیر تعداد میں آباد کردیا گیا اور ان کو مسلح ہونے کا موقع دے کر ان کی پوزیشن مضبوط کردی گئی تو ستمبر ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے اقوام متحدہ کی فلسطین کمیٹی کو مطلع کیا کہ اگر فلسطین کے مسئلہ کا جلد کوئی تصفیہ نہ ہوا تو برطانوی فوجیں فلسطین سے واپس چلی جائیں گی۔ گویا برطانیہ نے یہودیوں کو مضبوط بنانے کے بعد خود کو اس مسئلہ سے علیحدہ کرلیا، اور فلسطین کے مستقبل کا فیصلہ عربوں اور یہودیوں پر چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں اس کو حل کرلیں ۲۹۔ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے امریکہ اور روس کی یہ تجویز منظور کرلی کہ فلسطین کو تین حصوں میں

تقسیم کر دیا جائے ساڑھے چار ہزار مربع میل کا علاقہ عربوں کو دے دیا جائے اور ۵۳۳۸ مربع میل کا علاقہ یہودیوں کو اور یروشلم اور اس کے گردونواح کا ۲۸۹ مربع میل کا علاقہ اقوام متحدہ کے تحت کر دیا جائے اور یہ کہ یکم اگست ۱۹۴۸ء تک فلسطین پر سے برطانوی انتداب ختم کر دیا جائے۔ جنرل اسمبلی میں اس قرارداد کے حق میں جس طرح دوتہائی اکثریت حاصل کی گئی، اس پر عربوں نے اعتراض کیا اور یہ اعلان کیا کہ وہ اس قرارداد کو ناجائز تسلیم کرتے ہیں اور وہ اس کی پابندی نہیں کریں گے۔

اسرائیل کا قیام

اس دوران میں برطانوی فوجوں کی فلسطین سے واپسی شروع ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہودیوں اور عربوں کے درمیان مسلح تصادم شروع ہو گئے یہودیوں نے اپنے علاقوں کی عرب اقلیت پر بے پناہ ظلم وستم توڑے جس کی وجہ سے ان عربوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا بے خانماں ہونے والے عربوں کی تعداد جلد ہی دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ عرب پوری طرح مسلح یہودی دستوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ۱۵۔ مئی ۱۹۴۸ء تک اندرون فلسطین عربوں کی مزاحمت ختم ہوگئی۔ ۱۴ اور ۱۵۔ مئی کی درمیان شب کو ۱۲ بجے برطانوی انتداب بھی ختم ہوگیا، اور اسی شب یہودیوں نے شہر تل ابیب میں اسرائیل کی نئی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ عربوں کی مزاحمت چونکہ ختم ہو چکی تھی اس لیے ۱۵۔ مئی کی صبح مصر، اردن اور عراق کی فوجیں عربوں کے مفاد کے تحفظ میں فلسطین میں داخل ہونا شروع ہو گئیں، بعد میں سعودی عرب کا ایک دستہ بھی مصری فوج سے آن ملا۔ لیکن عربوں کی اس متحدہ فوج کو بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ شام اور لبنان جو ایک سال قبل آزاد ہوئے تھے ان کے حملے بھی قطعی بے اثر رہے۔ مصری فوج غزہ شہر اور اس سے متصل مختصر سے علاقے کے علاوہ اور کسی علاقے پر قبضہ نہیں کر سکی، ہاں [1] اردن کے جدید تربیت یافتہ عرب لیجن نے وسطی فلسطین کے بیشتر حصہ اور بیت المقدس (یروشلم) کے قدیم شہر کو یہودیوں

---

(1) مصر اور عراق معاہدوں کے تحت اسلحہ کی فراہمی پر برطانیہ پر انحصار کرتے تھے۔ اور اردن کے عرب لیجن کی تنخواہ برطانیہ ادا کرتا تھا اور وہ برطانوی پالیسی کے خلاف کام نہیں کر سکتا تھا۔

کے قبضے میں جانے سے بچایا۔ اس دوران میں سلامتی کونسل کے حکم پر ۱۱۔ جون ۱۹۴۸ء کو طرفین نے جنگ بند کر دی۔ اس کے بعد جنگ شروع اور بند ہوتی رہی، یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں عرب ملکوں کو اسرائیل سے علیحدہ علیحدہ جنگ بندی کے معاہدے کرنا پڑے اور اسرائیل کے وجود کو عملاً تسلیم [1] کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ۱۱۔ مئی ۱۹۴۹ء کو اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا۔

صیہونی عزائم اور سقوط بیت المقدس

فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کا قیام دنیا کی تاریخ کا ایک انتہائی مکروہ اور افسوس ناک باب ہے۔ اسرائیل کو قائم کر کے مغربی ملکوں اور روس نے ایک ایسے ظلم کی بنیاد ڈالی جس کی تاریخ میں کم مثالیں ملیں گی۔ امریکہ اور یورپ کے یہودیوں کو جو ہر لحاظ سے اجنبی تھے ہزاروں میل دور سے لا کر عربوں کی سرزمین پر آباد کیا گیا اور ان لاکھوں عربوں کو جو صدیوں سے فلسطین میں آباد تھے ان کے آبائی گھروں اور زمینوں سے نکال کر بے دخل کر دیا گیا۔ لیکن معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ اسرائیل نے اپنے ناجائز وجود کو قائم رکھنے کے لیے عربوں کے خلاف اپنی جارحانہ کاروائیاں جاری رکھیں اور ایک وقت وہ آیا کہ اس نے پورے فلسطین سے عربوں کو بیدخل کر دیا حتیٰ کہ ان کا قبلۂ اول بھی ان سے چھین لیا جس کے تحفظ کی ضمانت روس اور امریکہ اور اقوام متحدہ نے دی تھی۔ اسرائیل کا قیام یہودیوں کی ایک سازش تھی جو وہ صدیوں سے اپنے جارحانہ عزائم کو پورا کرنے کے لیے کر رہے تھے۔

قبل از تاریخ کے فلسطین کی حدود چونکہ دریائے اردن کے پار صحرائے شام تک وسیع تھیں اس لیے یہودی اس تمام علاقے کو اسرائیل میں شامل کرنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ مصر کا جزیرہ نمائے سینا بھی ان کا مطمح نظر رہا ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کا وہاں سے گہرا تعلق تھا۔ صیہونی تحریک کے شائع کردہ نقشوں میں اسرائیل مملکت کی جنوبی حدود مدینہ تک بتائی گئی ہیں جہاں عہد رسالت سے قبل یہودی قبائل آباد تھے۔ ان نقشوں میں دریائے نیل تک مصر، پورا اردن، شام اور لبنان،

---

(1) پاکستان اور بیشتر اسلامی ملکوں نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا ہے، لیکن دنیا کے نوے ملکوں نے اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے اور ان کے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم ہیں، اسرائیل کو تسلیم کرنے والے مسلمان ملکوں میں ترکی اور ایران کے علاوہ افریقہ کے کئی مسلم ملک بھی شامل تھے۔

عراق کا بڑا حصہ اور ترکی کا جنوبی حصہ اسرائیل کی حدود میں بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

"اے اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"

یہودی اپنے مغربی اور اشتراکی سرپرستوں کی مدد سے اپنے ان جارحانہ عزائم کو یکے بعد دیگرے پورے کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب برطانیہ اور فرانس نے نہر سوئیز پر حملہ کیا تو اسرائیل نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ۲۹۔ اکتوبر کو مصر پر حملہ کر دیا اور ایک ہفتے کے اندر اندر پورے جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر لیا۔

۳۱۔ اکتوبر کو برطانیہ اور فرانس نے بھی مداخلت کر دی اور ۶۔ نومبر کو پورٹ سعید کے پاس اپنی فوجیں اتار دیں۔ لیکن روس اور دوسرے مغربی ملکوں کے دباؤ کے تحت مصر اور اسرائیل نے جنگ بندی کا مطالبہ منظور کر لیا اور ۷۔ نومبر کو جنگ ختم ہو گئی۔ مصر اور اسرائیل کے درمیان ایک سو سترہ میل لمبی سرحد پر اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج تعینات کر دی گئی۔ اس طرح عالمی دباؤ کے تحت برطانیہ اور فرانس کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہ ہو سکی اور اسرائیل بھی اپنے توسیعی منصوبے پر عمل نہ کر سکا اور اس کو اپنی فوجیں واپس بلا لینا پڑیں۔ لیکن دس سال بعد اسرائیل کو اپنے عزائم پورا کرنے کا پھر ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ ۱۹۵۶ء کی جنگ کے بعد مصر کو روس نے وسیع پیمانے پر فوجی امداد فراہم کی جس کی وجہ سے صدر ناصر مصر کی فوجی طاقت اور روس کی حمایت کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، اور انھوں نے اسرائیل کو مٹانے کے لیے بلند بانگ دعوے کرنا شروع کر دیے جس کی وجہ سے اسرائیل اور مصر کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔ صدر ناصر کے مطالبے پر ۱۹۔ مئی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج بھی واپس بلا لی گئی، مصریوں نے غازہ کے علاقے اور شرم الشیخ کی بلندی پر قبضہ کر لیا اور آبنائے طیران کے راستے اسرائیلی جہازوں کی آمد و رفت بند کر دی۔ اس دوران میں اسرائیل امریکہ اور مغربی ملکوں کی امداد سے بہت مضبوط ہو چکا تھا اور وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ تمام عرب ملکوں کے خلاف فوجی کارروائی کر سکے چنانچہ ۵۔ فروری ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے اچانک مصر پر حملہ کر دیا اور پہلے ہی وار میں مصر کا ہوائی بیڑہ تباہ کر دیا۔ اس کے بعد چھ دن کے اندر اندر اسرائیلی فوجوں نے ایک بار پھر جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر لیا، اور وہ نہر سویز

کے کنارے تک پہنچ گئیں اور شرم الشیخ پر قبضہ کر کے آبنائے طیران کا راستہ اسرائیلی بحری جہازوں کے لیے کھول دیا، اسی دوران میں اسرائیلی فوجوں نے بیت المقدس اور فلسطین کے اس حصے پر بھی قبضہ کرلیا جو اردن کے قبضہ میں تھا اس کے بعد اسرائیلی فوجیں شام کے اندر بھی داخل ہو گئیں اور جولان کی پہاڑیوں تک ایک وسیع علاقہ پر قبضہ کرلیا، اس جنگ میں روس کی عرب دوستی کا یہ حال تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اسی کی رات روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ اسرائیل کی طرف سے کوئی حملہ نہیں ہوگا۔

۱۹۴۸ء میں جب اسرائیلی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ صرف پانچ ہزار تین سو مربع میل تھا۔ اور اس کی حدود میں پانچ لاکھ یہودی اور پانچ لاکھ چھ ہزار عرب آباد تھے۔ اب یہ رقبہ ۳۳½ ہزار مربع میل ہو گیا جو اصل فلسطین کے رقبے سے بھی جو دس ہزار مربع میل تھا تین گنے سے زیادہ ہے اگر ہم اسرائیل کے پہلے نقشے کو دیکھیں تو وہ چاقو کی طرح نظر آئے گا، لیکن ۱۹۶۷ء میں یہ چاقو قصاب کی چاپڑ میں تبدیل ہو گیا۔

۱۹۔ اگست ۱۹۶۹ء کو مسجد اقصیٰ میں آگ لگنے کا واقعہ پیش آیا جس میں سلطان صلاح الدین کا بنوایا ہوا تاریخی منبر بھی جل گیا۔ اس واقعہ نے پوری اسلامی دنیا میں غم وغصہ کی لہر دوڑادی اور اس حادثہ کو مسجد اقصیٰ ڈھانے کی یہودی سازش کا ایک حصہ سمجھا گیا۔ بعد میں جب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کی دیواروں کے قریب ہیکل سلیمانی کے آثار معلوم کرنے کے لیے کھدائی شروع کی تو ان شبہات کو اور تقویت پیدا ہوگئی کہ یہودی مسجد اقصیٰ کو کسی نہ کسی بہانے سے گرا کر اس کی جگہ ہیکل سلیمانی ازسرنو تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس کا نقشہ بھی یہودی انجینئروں نے تیار کرلیا ہے۔

مفتی اعظم امین الحسینی

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی (۱۸۹۳ء تا ۱۹۷۴ء) کا بھی مختصر تذکرہ کر دیا جائے جنھوں نے برطانوی سامراج کا مقابلہ کرنے اور فلسطین کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں بے مثل خدمات انجام دیں۔ مفتی اعظم ۱۸۹۷ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم بیت المقدس میں اور اعلیٰ تعلیم جامعہ ازہر (قاہرہ) میں حاصل کی۔ اس کے بعد استنبول جا کر انھوں نے فوجی تربیت حاصل کی۔ جنگ عظیم کے دوران انھوں

نے عثمانی ترکی کی فوج میں شامل ہو کر ازمیر کے علاقے میں فوجی خدمات انجام دیں۔ جنگ کے بعد وہ فلسطین آ گئے۔ اپنے وطن کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے زبردست تحریک شروع کی۔ اس مقصد کے لیے فلسطین کے عربوں نے سپریم مسلم کونسل کے نام سے جو تنظیم قائم کی مفتی اعظم اس کے صدر تھے۔ اس کے علاوہ وہ فلسطین عرب پارٹی کے سربراہ بھی تھے۔ مفتی اعظم نے مسئلہ فلسطین کی اہمیت اور فلسطین کو یہودی وطن بنانے میں جو خطرات پوشیدہ تھے ان سے آگاہ کرنے کے لیے پوری اسلامی دنیا کا دورہ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی کوششوں سے بیت المقدس میں ۷ تا ۱۷۔ دسمبر ۱۹۳۱ء ایک اسلامی کانفرنس ہوئی جس میں اسلامی دنیا کے کئی ملکوں سے ممتاز رہنماؤں نے شرکت کی۔ اسلامی ہند اور پاکستان سے اس کانفرنس میں علامہ اقبال، مولانا شوکت علی اور جناب غلام رسول مہر نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس جو موتمر اسلامی کے نام سے مشہور ہے فلسطین کے مسئلہ پر مسلمانوں کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس تھی۔ بعد میں موتمر اسلامی کے نام سے ایک مستقل تنظیم قائم ہوگئی جس کے صدر مفتی اعظم منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں فلسطین کی برطانوی تاریخ کی سب سے بڑی بغاوت ہوئی جو چھ ماہ تک جاری رہی۔ اس کی تنظیم اور قیادت مفتی صاحب ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک انھوں نے فلسطین کے مفتی اعظم کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے۔ یہ سرکاری عہدہ تھا۔ لیکن مفتی صاحب نے برطانیہ اور یہودیوں کے خلاف جس شدت سے تحریک چلائی اس کی وجہ سے ان کو نہ صرف یہ عہدہ چھوڑنا پڑا بلکہ وہ فلسطین میں قیام بھی نہیں کر سکے اور گرفتاری سے بچنے کے لیے فلسطین سے چھپ کر نکل گئے اور لبنان پہنچ گئے۔ اس کے بعد ان کو فلسطین واپس آنا نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ فلسطین میں ان کے داخلہ پر پابندی تھی اور ان کی گرفتاری پر برطانوی حکومت نے انعام مقرر کیا تھا۔ جلا وطنی کا یہ زمانہ انھوں نے عراق، ایران، ترکی، اٹلی اور جرمنی میں گزارا۔ امیر شکیب ارسلان کی طرح مفتی صاحب نے بھی عربوں کی آزادی کے مقصد سے اٹلی اور جرمنی سے دوسری جنگ کے دوران تعاون کیا۔ جرمنوں کی شکست کے بعد فرانس نے ان کو گرفتار کر لیا۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں وہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور مصر پہنچ گئے جہاں ان کا شاہ فاروق نے ایک عظیم رہنما کی حیثیت سے پرجوش خیر مقدم کیا۔ قاہرہ میں مفتی صاحب کو مجلس اعلیٰ برائے فلسطین کا سربراہ منتخب

کیا گیا۔ اس طرح ان کی حیثیت فلسطین کی حکومت کے سربراہ کی ہوگئی۔ ۱۹۴۷ء میں مفتی صاحب نے جیش الجہاد کی تشکیل کی تاکہ انگریزوں کے فلسطین سے جانے کے بعد اس کی مدد سے ملک پر اہل فلسطین کا اقتدار بحال کیا جاسکے۔ جب انگریزوں نے فلسطین خالی کیا اور عربوں اور یہودیوں میں جنگ چھڑ گئی تو مفتی صاحب اس جنگ میں عرب حکومتوں کی مداخلت کے خلاف تھے۔ جنگ میں عربوں کی ناکامی اور اسرائیل کے قیام کے بعد بھی مفتی اعظم کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ انھوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کر کے اور بار بار اسلامی کانفرنسیں بلا کر مسئلہ فلسطین کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۹۵۹ء تک ان کا قاہرہ میں قیام رہا۔ اس کے بعد صدر ناصر کے طرز عمل کی وجہ سے بیروت چلے گئے اور وہیں ۴۔ جولائی ۱۹۷۴ء کو ان کا انتقال ہوا۔ مفتی اعظم کئی مرتبہ پاکستان آئے تھے۔ آخری مرتبہ فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان آئے تھے۔ ان کو پاکستان کے اسلامی مقاصد اور اس کے مستقبل سے گہری دلچسپی تھی۔ جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی سے ان کے مخلصانہ اور قریبی تعلقات قائم تھے۔

مفتی اعظم فلسطین پر برطانوی تسلط کے بعد اسرائیل کے قیام تک بلاشک وشبہ فلسطین کے سب سے ممتاز اور محترم رہنما تھے۔ لیکن مفتی اعظم ایک فلسطینی رہنما سے زیادہ اسلامی دنیا کے رہنما تھے۔ وہ اسلامی اتحاد کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ انھوں نے کئی بار اسلامی ممالک کے اختلافات دور کرانے کے لیے اہم کوششیں کیں۔ ۱۹۳۴ء میں سعودی عرب اور یمن کی مصالحت، عراق اور سعودی عرب کے تعلقات بہتر بنانے اور عراق اور مصر کے افغانستان سے سفارتی تعلقات قائم کرانے میں مفتی صاحب کی کوششوں کا اہم حصہ ہے۔ مفتی صاحب دراصل جمال الدین افغانی اور امیر شکیب ارسلان کی صف کے رہنما تھے۔ ان کی فکر اسلامی اور ان کا کردار قابل تقلید تھا۔

۱۹۷۳ء کی جنگ

۱۹۶۷ء کی ناکامی کے بعد عربوں اور پوری اسلامی دنیا کا موقف یہ تھا کہ اسرائیل کو وہ تمام مقبوضہ علاقے خالی کر دینا چاہئے جن پر اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا ہے۔ اگرچہ امریکہ،

روس، اور اقوام متحدہ اسرائیل کے وجود کو ہر شکل میں قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن مقبوضہ علاقوں کے بارے عربوں کے مذکورہ بالا موقف سے ان میں سے بھی کسی کو انکار نہیں۔ اس کے باوجود اسرائیل جسے اس معاملے میں امریکہ کا در پردہ لیکن پورا تعاون حاصل ہے ان علاقوں کو محفوظ سرحدوں کے قیام سے پہلے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ محفوظ سرحدیں ایک مبہم اصطلاح ہے۔ اس میں مقبوضہ فلسطین تو شامل ہی ہے لیکن جزیرہ نما سینا اور جولان کی سطح مرتفع کو بھی محفوظ سرحدوں میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ صدر ناصر کے بعد اسرائیل کے بارے میں مصر کے طرز عمل میں خاصا فرق آ گیا ہے۔ مصر اب اسرائیل کے وجود کو ختم کر دینے کا مطالبہ نہیں کرتا وہ اسرائیل کو باقی رکھنے کی ضمانت دینے کو تیار ہے لیکن اسرائیل اپنی ہٹ دھرمی پر ابھی تک قائم ہے۔ اسرائیل کی اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۷۳ء کی جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں جزیرہ نمائے سینا میں مصر تقریباً ڈھائی ہزار مربع میل زمین کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود فلسطین کا مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ ۱۹۷۷ء کے اواخر میں صدر سادات نے مسئلہ فلسطین کو حل کرنے اور اسرائیل کے اندیشوں کو دور کرنے کے لیے اسرائیل جا کر اسرائیلی حکومت سے براہ راست گفتگو کی۔ لیکن اسرائیل کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے صدر سادات اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ بالآخر امریکہ کے توسط سے ستمبر ۱۹۷۸ء میں اسرائیل اور مصر کے درمیان کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر ایک سمجھوتہ ہوگیا جس کے تحت مصر کو جزیرہ نما سینا تو واپس مل گیا لیکن فلسطین کا عرب حصہ اور شام میں جولان کا پہاڑی علاقہ ابھی تک اسرائیل کے پاس ہے۔ اس وقت عربوں اور اسرائیل کے درمیان سب سے پیچیدہ مسئلہ جزیرہ نما سینا اور جولان کو خالی کرنے کا نہیں بلکہ مقبوضہ فلسطین کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔ عرب یہاں تحریک آزادی فلسطین کے تحت آزاد عرب حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جبکہ اسرائیل نہ تو تحریک آزادی فلسطین کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ فلسطین کے مقبوضہ عرب علاقہ میں مکمل آزاد عرب حکومت قائم کرنے کے لیے تیار اور نہ بیت المقدس کو واپس کرنے کے لیے تیار ہے۔

الفتح

فلسطینی مہاجرین اور باشندوں کا سب سے اہم مسئلہ ان کی نمائندگی اور تنظیم کا ہے۔ ان کی

تقریباً نصف آبادی فلسطین میں ہے اور نصف شام، لبنان اور اردن کے پڑوسی ملکوں میں مہاجر کیمپوں میں غربت افلاس اور مصائب کی زندگی گزار رہی ہے۔ اہل فلسطین اگرچہ بدترین مظالم اور مصائب کا شکار ہیں لیکن ان میں اتحاد کا فقدان ہے۔ اس وقت ان کی بارہ مختلف تنظیمیں موجود ہیں۔ ان کے اس انتشار سے امریکہ، اسرائیل اور روس ہی نہیں بلکہ خود عرب ممالک بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور فلسطینیوں کو وہ اپنے اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک تنظیم الجبهہ الشعبیہ لتحریر فلسطین (عوامی محاذ برائے آزادی فلسطین) ہے جس کا سربراہ ایک متعصب عیسائی ڈاکٹر جارج حبش ہے۔ جارج حبش بیروت کی امریکی یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے۔ وہ عرب قوم پرست تحریک ''القومیون العرب'' کا رہنما ہے۔ یہ تحریک لبنان اور شام کے عیسائیوں نے قائم کر رکھی ہے اور بیروت کی امریکی یونیورسٹی اس کا مرکز ہے۔ اس تحریک کا مقصد لادینیت کی بنیاد پر عربوں کو متحد کرنا ہے۔ اس تحریک کے اکثر نوجوان اب عوامی محاذ میں شامل ہو گئے ہیں۔ پہلے یہ امریکہ کے مقاصد کے لیے کام کرتے تھے اب مارکسزم اور کمیونزم کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ جارج حبش کی نظر میں عربوں کی شکست کا اصل سبب مذہب کی افیون ہے۔ اور یہ شخص سعودی عرب کا دشمن نمبر ایک ہے۔

عوامی محاذ میں جب پھوٹ پڑ گئی تو دو نئے محاذ وجود میں آئے۔ ایک الجبهۃ الشعبیہ الدیمقراطیہ (ڈیموکریٹک پاپولر فرنٹ) جس کا رہنما ایک عیسائی نائف حواتمہ ہے اور دوسرا الجبهہ الشعبیہ لتحریر فلسطین (پاپولر فرنٹ برائے آزادی فلسطین) جس کا رہنما احمد جبریل ہے۔ یہ روس نواز ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اردن میں جو زبردست ہنگامے ہوئے اور مہاجرین فلسطین کا اردن کی حکومت سے جو تصادم ہوا تھا اس کی پشت پر جارج حبش تھا۔

فلسطینیوں کی باقی تنظیمیں عراق، شام یا مصر کی آلہ کار ہیں۔

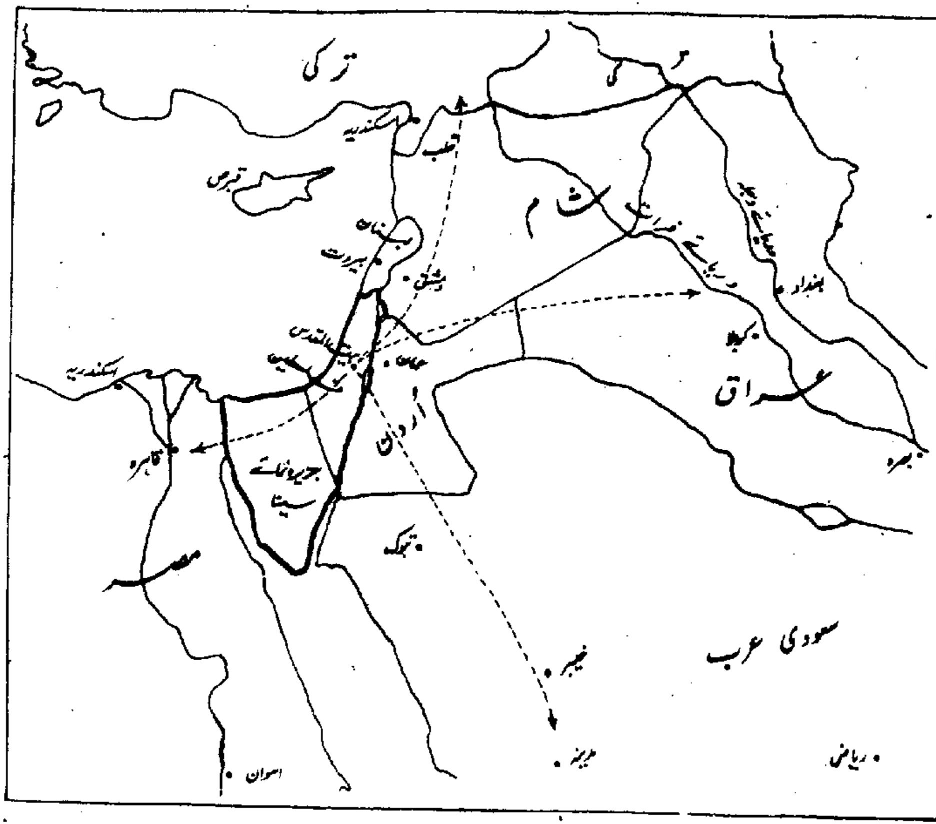
اہل فلسطین کی سب سے بڑی تنظیم حرکۃ التحریر الفلسطین (تحریک آزادیٔ فلسطین) ہے جو الفتح کے نام سے مشہور ہے۔ اور انگریزی میں اس کو (palestine liberation organization) کہا جاتا ہے۔ الفتح اس کی مخفف شکل ہے۔ اور حرکۃ تحریر الفلسطین کے ابتدائی حروف کو الٹا پڑھنے سے الفتح کی اصطلاح بنتی ہے۔ الفتح کسی غیر فلسطینی طاقت کے زیر اثر نہیں۔ یہ تنظیم ہر مکتب فکر کے لوگوں پر مشتمل ہے اور اس میں محب اسلام عنصر کافی طاقتور ہے۔ لیکن اس تنظیم کو بھی کبھی

دوسری تنظیموں کے انتہا پسند عناصر کے دباؤ کے تحت بھی فیصلے کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ عاصفہ اس تنظیم کا عسکری بازو ہے اور یاسر عرفات اس کے سربراہ ہیں۔

یاسر عرفات

یاسر عرفات ۱۹۲۹ء میں یروشلم میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان قاہرہ میں بڑی جائیداد کا مالک تھا۔ لیکن یاسر عرفات کے والد نے مقدمہ بازی میں ساری جائیداد ختم کر دی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کا گھرانہ غزہ کے مہاجروں سے تعلق رکھتا ہے۔ یاسر عرفات ۱۹۴۸ء سے بہت پہلے قاہرہ چلے گئے تھے جہاں انھوں نے مصری فوج میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۸ء میں جب عربوں اور یہودیوں میں تصادم ہوا تو یاسر عرفات نے عربوں کو اسلحہ پہنچایا اور اسرائیلی علاقوں میں چھاپہ مارنے والے فدائیوں کو تربیت دی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یاسر عرفات نے مصری یونیورسٹی فواد اول میں سول انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کو فلسطینی طلبہ کے وفاق کا صدر منتخب کیا گیا۔ یاسر عرفات نے مصر میں فلسطینی اور مصریوں پر مشتمل چھاپہ مار دستے منظم کیے جنھوں نے ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء میں نہر سوئیز کے علاقہ میں انگریزی فوجوں پر حملے کیے۔ یاسر عرفات نے سول انجینئرنگ کی تکمیل کے بعد مصری فوجی اکاڈمی میں داخلہ لیا اور آتش گیر مادوں کو استعمال کرنے کی تربیت حاصل کی اور مصری فوج میں وہ لفٹیننٹ ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں نے نہر سوئیز کے علاقہ میں فوج اتاری تو یاسر عرفات نے دشمن کی تنصیبات کو تباہ کرنے کے کام میں ایک ماہر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۵ء کے قریب جب تنظیم الفتح قائم ہوئی تو یاسر عرفات اس میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ مدت مصر میں انجینئر کی حیثیت سے کام کیا، پھر کویت چلے گئے جہاں ۱۹۵۸ء میں پی۔ ڈبلو۔ ڈی میں انجینئر ہو گئے۔ انھوں نے آزادانہ طور پر ٹھیکہ داری کا کام بھی کیا۔ ۱۹۶۵ء میں یاسر عرفات نے کویت میں کام چھوڑ دیا اور الفتح کی عسکری تنظیم العاصفہ کے سربراہ ہو گئے جس نے اپنی چھاپہ مار سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۶۲ء سے کر دیا تھا۔ اس وقت تک فلسطینیوں کی سب سے سرگرم تنظیم تنظیم برائے آزادی فلسطین تھی جس کا مرکز مصر میں تھا، لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد الفتح کو عروج ہوا اور فروری ۱۹۶۹ء میں الفتح کو پی۔ ایل۔ او پر غلبہ ہو گیا اور عرفات اس کے صدر ہو گئے۔ اس وقت سے اس

وقت تک یاسر عرفات فلسطینیوں کے سب سے بڑے ترجمان ہیں اور ان کی تنظیم کی اس حیثیت کو ۱۹۷۴ء میں اردن کے شاہ حسین نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ یاسر عرفات متوازن طبیعت کے انسان ہیں لیکن فلسطینی مہاجر چونکہ کئی حصوں میں تقسیم ہیں اور ان کو روس اور مختلف عرب حکومتیں اپنے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ ان پر موثر کنٹرول نہیں کر سکتے۔



اِسرائیل کے جارحانہ عزائم

نومبر ۱۹۴۷ء میں جب اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کا فیصلہ کیا تو فلسطین کے دس ہزار مربع میل علاقے میں سے ۵۶۰۰ مربع میل کا علاقہ یہودیوں کو دیا گیا۔ لیکن

۱۹۴۸ء میں جب عربوں کے ساتھ اسرائیل کی جنگ ختم ہو گئی تو مملکت اسرائیل کا رقبہ آٹھ ہزار مربع میل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد؛

جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے عربوں کے خلاف اپنی جارحانہ کاروائی کے دوران نہ صرف پورے فلسطین پر قبضہ کر لیا بلکہ مصری علاقے جزیرہ نمائے سینا اور شام کے جنوب مغربی حصہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح اسرائیل کی مملکت آج جس علاقے پر قابض ہے اس کا رقبہ ۳۴ ہزار مربع میل ہے۔

یہ سب کچھ اسرائیل کے جارحانہ عزائم کا صرف ایک حصہ ہے۔ اسرائیلی پارلیمنٹ کی عمارت کی پیشانی پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"اے اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"

صیہونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں اس جارحانہ منصوبے کی جو تفصیل دی گئی ہے۔ اس کی رُو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پورا اُردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی علاقہ اور مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔

: 978-969-423-063-4

U00310

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان 042-35252501-2